

# احمدیہ کلچر



پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

# احمد یہ چکر کلچر

اور

دوسرے مضامین

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی



اور ٹینٹل پبلشرز ٹورنٹو

Copyright © Pervez Perwazi 2005

2414 Major Mackenzie Drive, P.O. Box. 96512

Maple, Ontario, L6A 1B0, Canada

First published by the Oriental Publishers in May 2005

All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in retrieval system, or transmitted in any form or by any means, electronic, mechanical, photocopying, recording, or otherwise, without the prior permission in writing of the publisher.

Canadian Cataloguing-in-Publication Data

Perwazi, Pervez,

Ahmadiyya katchar auwr dosare mazameen / by Pervez Pervazi. Maple, Ontario: Oriental Publishers, c2005.

viii, 307 p.

Cover title in Urdu

Ahmadiyya culture and other articles.

ISBN 1-882494-24-5

1. Ahmadiyya -- Culture 2. Ahmadiyya -- India -- History -- Contemporary literature 3. Ahmadiyya -- Pakistan -- History -- Contemporary literature

4. Ahmadiyya -- Literature -- India -- History -- Contemporary studies

5. Ahmadiyya -- Literature -- Pakistan -- History -- Contemporary studies I. Title. II.

Ahmadiyya culture and other articles.

297.86 -- 21st ed.

BP 195.5A5 P471 2005

Cover designed by: Nabeel Rana (Nabeel@Canada.com)

Published by: Oriental Publishers, P.O. Box. 96512

2414 Major Mackenzie Drive, Maple, ON L6A 1B0, Canada

Telephone/Fax: 905-814-4987 (Oriental\_Publishers@yahoo.com)

Printed by: Fazl-Ul-Umar Press, 31 Sycamore Street,

Montreal, Quebec, H3T 1A5, Canada

Tel: 740-797-4811 (bmm@intelliviva.com)

## انتساب

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے اساتذہ، طلباء، کارکنان اور درودیوار کے نام!  
کہ  
اس ادارہ سے وابستگی نہ ہوتی تو اتنی بھرپور زندگی کا ہے کونھیب ہوتی۔

## فہرست مضامین

- ۱۔ احمدیہ کلچر ۱
- ۲۔ میر امرشد ۲۹
- ۳۔ تازہ ہستیاں آباد ۳۸
- ۴۔ خاموش علما ۶۶
- ۵۔ اپنے اساتذہ کے بارے میں ۸۴
- ۶۔ کچھ بے نفس لوگ ۸۸
- ۷۔ گودڑ میں سے لعل ۱۰۰
- ۸۔ رشتہ و مؤدیت ۱۱۴
- ۹۔ خدا کے کچھ متوکل بندے ۱۲۰
- ۱۰۔ سرخ رومال والا صوفی ۱۲۵
- ۱۱۔ بددگار کارکن ۱۳۰
- ۱۲۔ اگرچہ میر تقی راشد ۱۳۷
- ۱۳۔ خاموش کارکن ۱۴۴
- ۱۴۔ ہمارا ملک عشق ۱۵۲
- ۱۵۔ ہمارے دکا نندار ۱۸۸
- ۱۶۔ جلسہ سالانہ اور آب خورے ۱۹۹

## ادب

- ۱۷۔ مالک رام کی احمدیت ۲۰۶
- ۱۸۔ پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ ۲۱۹
- ۱۹۔ دیوبند کے احمدی شعراء ۲۳۱

# وفیات

- ۲۰۔ جانے والے کا جانا ۲۳۹  
 ۲۱۔ ایک عالی دماغ تھا نہ رہا ۲۳۷  
 ۲۲۔ قدم قدم تیری یادیں ۲۵۳  
 ۲۳۔ ایک اک کر کے ہوئے کتنے ستارے رخصت ۲۵۸  
 ۲۴۔ ہوا تھی گوشت و تیز لیکن --- ۲۶۳

## سزائے

- ۲۵۔ جادہ جادہ جادہ پیائی ۲۶۹  
 ۲۶۔ ذرا اوسلو تک ۲۹۰  
 ۲۷۔ سر پریدہ کی واپسی ۳۰۲



اس کتاب کی تیاری کے مختلف مراحل میں عزیز یحیٰی مہدی، ملک لال خان صاحب، استاذی المکرم مبارک احمد انصاری، کرنل راجہ محمد اسلم، جناب عبدالماجد صدیقی، عزیز یحیٰی ہدایت اللہ ہادی، جناب نبیل رانا، عزیز یحیٰی شفیق اللہ اور ڈاکٹر بشارت منیر نے میرا ہاتھ بٹایا۔ ربوہ سے کچھ مضامین کی نقول منگوانا مطلوب تھیں میں نے استاذی صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب مدظلہ کے ذریعہ عزیز یحیٰی حبیب الرحمن زیدی سے درخواست کی انہوں نے افضل والوں سے کہا ہو گا افضل والوں کی طرف سے وہ مضامین ای میل کے ذریعہ موصول ہوئے۔ عزیزہ ساجدہ جونیہ نے ان مضامین کی کمپیوٹر پر دوبارہ کتابت کر کے میری مشکل کو آسان کر دیا۔ میں ان سب کا از حد شکر گزار اور احسان مند ہوں۔

میرے اپنے کمپیوٹر نے قدم قدم پر میری لاعلمی کی وجہ سے مشکلات کھڑی کیں تو میرے دامادوں عزیزان عرفان احمد، خالد داؤد اور شمر احمد چوہدری نے وقتاً فوقتاً آ کر اور اپنے اوقات صرف کر کے اس کو درست کیا۔ وجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ میری بیوی اور میرے بچے تو ظاہر ہے اس کتاب کی تیاری کے دوران ہمیشہ کی طرح میری دیکھ ریکھ میں ہمدن مصروف رہے اللہ ان کو بھی جزا دے۔

قارئین کا بھی شکریہ کہ انہوں نے یہاں تک پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے تو امید ہے باقی کتاب بھی ان کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی۔ اللہ ان کے ساتھ ہو۔

احمد یہ کچھر کے موضوع پر شاید یہ پہلی کتاب ہو! اس کتاب میں آخر کے چند مضامین کے سوا جتنے مضامین بھی شامل ہیں ان کا کسی نہ کسی طریق سے احمد یہ کچھر سے تعلق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدی ہے اور یہی پہچان اس کو بس ہے!

میں قادیان میں پیدا ہوا ربوہ میں پلا بڑھا اور پھر ربوہ میں ہی لمبے عرصہ تک خدمت کا موقع ملا۔ مگر کراچی اسکول میں استاد، کالج میں ٹیکچرار اور پھر کالج میں پروفیسر۔ اس دوران اپنے ماحول کو دیکھنے بکھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ قادیان کی باتیں اگرچہ چہلچلتے طور پر یاد ہیں مگر عین ممکن ہے ان میں ایسی باتیں بھی شامل ہو گئی ہوں جو میں نے حدیث متواتر کے طور پر اپنے بزرگوں اور بزرگ دوستوں سے سنی ہوں۔ میں نے التزام کے ساتھ ایسی باتوں کی تصدیق بزرگوں سے کروائی ہے مثلاً لالہ ملا دامل صاحب کو میں نے قادیان میں دیکھا تھا۔ قبلہ و کعبہ مولانا محمد احمد طویل مدخلہ سے میں نے تصدیق کروائی کہ یہ وہی ملا دامل صاحب تھے جو حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں زندہ تھے۔ اسی طرح بعض باتوں کی تصدیق قبلہ محترم سید محمود احمد صاحب نے بھی بلا واسطہ فرمائی آپ جرمی کے جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے میں حاضر نہ تھا میں نے فون کر کے انہیں اہلا وسہلا کہا۔ فرمانے لگے ”آپ جو باتیں سن سن کر کہہ رہے ہیں وہ باتیں ہم نے دیکھی ہوئی ہیں مگر آپ باتیں ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔“ میں نے ان سے کہا تھا ”قبلہ آپ نے یہ قول تو سنا ہوگا کہ جب دیکھنے والے چپ سادھ لیں تو سننے والے بولنے لگتے ہیں۔“ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے صحت دی، وسائل مہیا کئے، لکھنے کی توفیق دی اور اب وہ چیزیں جو تقریباً تین سو مضامین کی صورت میں سلسلہ کے مختلف رسالوں اخباروں میں بکھری پڑی تھیں کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔ وان تعدو نعمت اللہ لا تحصوها! اللہ تعالیٰ نے ادبی موضوعات پر جو مضامین اور کتابیں لکھنے کی توفیق دی وہ مستزاد ہے! الحمد للہ علی ذالک۔



پاکستان سے میری دوسری ہجرت کا دور بڑی مشکل کا دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سویڈن میں ٹھکانا مہیا کیا مگر تنہائی اور بیماری نے دھڑ توڑ دیا۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہی تھا کہ قلم پکڑ لوں اور اس طرح اپنی تنہائیوں کا ازالہ کروں۔ الحمد للہ، الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی توفیق دی اور پڑھنے والوں کے دلوں میں میرے لکھے کو پڑھنے کی تحریک بھی کی چنانچہ بہت سے بزرگوں دوستوں شاگردوں اور دوستوں کی جانب سے تحسینِ سخن شناس کا اظہار ہوتا رہا۔ ساکھڑ جیسے دور افتادہ شہر میں ایک اجنبی غیر احمدی دوست میرے کسی ایک مضمون کو پڑھ کر ایک احمدی دوست کے ہاں تشریف لائے اور اس جیسے دیگر مضامین کے مطالعہ کا شوق ظاہر کیا اور مہیا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس میں میری کوئی خوبی نہیں جو کچھ ہے وہ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے وابستہ رہنے کی برکت ہے۔

حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد کے انتقال پر میں نے ایک مضمون الفضل میں لکھا۔ وہ چھپا تو حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب (اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز) کا خط آیا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ ”ابا کے بارہ میں آپ کا خاص اسلوب میں لکھا ہوا مضمون پڑھا ہے۔ جزاکم اللہ“۔ اسی طرح ایک روز ایک صاحب بمبیل اتفاق ملے۔ کہنے لگے اگر آپ کے مضامین پر آپ کا نام نہ بھی لکھا ہو تو میں پہچان لیتا ہوں کہ یہ آپ کا مضمون ہے۔ میں نے ان سے تو کچھ نہ کہا اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوا کہ انہیں بھی میرے اسلوب میں سیدی حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الخامس کی طرح کوئی خاص بات نظر آئی۔ اگر میری تحریر میں کوئی خوبی ہے تو وہ میرے اساتذہ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت عطا فرمائے آمین۔

ڈاکٹر پرویز پروازی

سی ساگا کینیڈا

۲۸ فروری ۲۰۰۵

## احمدیہ کلچر

کسی قوم کے اجتماعی رہن بہن اور تمدن کے نتیجے میں جو رسوم و عادات ان کے معاشرے میں رائج ہو جاتی ہیں وہ اس قوم کا کلچر کہلاتی ہیں۔ ہم لوگ غیر منقسم ہندوستان میں تھے تو ہمارے معاشرے میں ہندو اسلامی کلچر کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے رائج کے بعد سارے ہندوستان میں ایک خاص قسم کا کلچر رائج پایا جاتا تھا جس میں اسلامی روایات کا تو یہی مضامین تھا اور مقامی ہندو کلچر کی باتیں بھی شامل تھیں۔ سمجھوتے کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے دور تک اسلام حکیم کہنے کی بجائے ”آداب عرض“ یا ”تسلیمات“ کہنے کا رواج تھا حتیٰ کہ صاحب امیر الروایات کے مطابق شاہ ولی اللہ کے خاندان میں بھی سلام کہنے کا رواج تک نہیں تھا۔ وہ بھی یہی کہتے تھے ”عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے“ یا ”رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے“۔ اسی قسم کے ثقافتی سمجھوتوں میں کنول کے پھول کی نسبت کاری بھی تھی۔ کنول کا پھول ہندوؤں کا مقدس پھول ہے مگر مسلمان اپنی مسجدوں یا امام بارگاہوں یا مقبروں میں اس پھول کی نسبت کاری کرتے تھے۔ مصافحہ ترک کرنے اور جھک کر آداب بجالانے یا کورنش بجالانے کی رسوم بھی اسی ثقافتی سمجھوتے کے نتیجے میں مروج ہوئیں۔ اردو زبان بجائے خود ایک ثقافتی سمجھوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سی ایسی ثقافتی باتیں تھیں جو ہندو مسلم افہام و تفہیم کے سلسلے میں در آئیں اور ہمارے کلچر کا حصہ بنیں۔ جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس کی ثقافتی اہمیت سے نئی نسل شاید واقف نہ ہو۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الاول حضرت حکیم نور الدینؒ جب حصول تعلیم کے لئے لکھنؤ پہنچے تو سیدھے حکیم علی حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب اپنے دیوان خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ سفید براق چاندنی بھی تھی۔ حاضرین اپنی اپنی نشست پر حسب مراتب گاؤں کیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ نشست و برخاست پر لکھنؤی تمدن کی چھاپ تھی۔ بات بات میں تکلف و حرکات و سکنات ایک کڑے ثقافتی بندھن میں جکڑی ہوئی۔ جھک جھک کر آداب و تسلیمات کہنے کا رواج۔ سیدنا نور الدینؒ مجلس میں داخل ہوئے تو پکار کر السلام علیکم کہنے کے بعد آگے بڑھے۔ آپ اس تکلف اور تصنع سے بالکل نا آشنا تھے۔ پاؤں دھول میں اٹے ہوئے تھے سو سفید براق چاندنی پر جو نقش و نگار بنے وہ مستزاد سیدھے

پتے استود کے سامنے پہنچ گئے۔ اس محفل میں جس چار برسہ سدا سن تو کج روئی تو میں بات کرنا بھی  
معیوب سمجھا جاتا تھا اور بات حیات میں ایک تکلف رو رکھا۔ بدی قہ حضرت خیمہ صاحب کا سدھن نہ  
سب صاحبین من سے رو گئے۔ ایک حور یہ رونک چڑھے اور متکلف تھے دل ہی تھے "آپ کس  
مہذب ملک سے تشریف لائے ہیں" اس سوال سننے کا یہ انداز آپ نے کہاں سے سیکھا ہے؟" حضرت  
حکیم صاحب نے جھٹ بے تکلف کہا "اسلام سہنے کا یہ طریق اور بے تکلفی کا یہ انداز رسول عربی دلی کا  
سکھایا ہوا ہے" اس جواب سے معترض کے چہرے پر عرق انگوٹ کے قطرے نمودار ہو گئے۔ حکیم علی حسین  
صاحب نے ان سے کہا "آپ بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی رہے ہیں کیا آپ نے یہ  
سکت جواب پہنچ بھی کبھی سنا ہے؟"۔ یہ بات ہمارے پڑھنے والوں کو عجیب لگی ہوگی کہ اس دربار میں  
اتنا رکھ رکھاؤ کیوں تھا۔ اس لئے کہ یہی لکھنؤ کا تمدن تھا دلی والے اگرچہ تکلف اور تقصیر سے کہیں دور تھے  
پھر بھی ان کے ہاں بھی غالب سے گھر کو گھر نہیں بھل سرائی کہا ہے۔ ہنٹھک و دیون خانہ کما جاتا تھا۔  
بات بات میں کورٹش بجالانا اور مجرا کرنا ان کا طریق تھا۔ اب یہ مجرا کرنا بھی ہمارے نئے قارئین کے  
نئے نئی بات ہوگی۔ جھک کر سلام کرنے کو مجرا کرنا کہتے تھے مجرے کے وہ معنی نہیں تھے جو ہمارے عام  
معاشرے میں مروج ہیں۔

ہم نے قادیان اور ربوہ میں اپنی ثقافت کے جو نمونے دیکھے اس مضمون میں نہیں بیان کرنا مقصود ہے  
دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمارا کلچر عام کلچر سے کوئی مختلف چیز تھا اور ہے یا محض ہمارا گمن ہے؟  
قادیان میں ہمارا ماحول مل جلا ماحول تھا جس میں بندوبست تھے سکھ بھی تھے درمسدین بھی۔ حضرت مر  
غلام مرتضیٰ صاحب کے زمانے تک رئیسانہ رہن سہن کا دور دورہ تھا اور وہی طریق مروج تھا جو عام  
رئیسوں کی ڈھونڈیوں پر ہوتا تھا۔ عام طریق یہ تھا کہ رئیس خاندان کے ملاوہ دوسرے تمام لوگ  
ہوائے تھے اور رعایا کی لرزہ دہش میں وہ تمام ایک ہی آجائے تھے اور اس لئے ان میں  
میں رہنے والے دوسرے چھوٹے زمیندار اور معززین بھی رعایا کی شمار ہوتے تھے مگر ان پر رئیس کا تفوق  
حکم چلانے کا نہیں تھا۔ صرف نام کی رئیس چلتی تھی جو نسل بعد نسل چلتی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ  
جب اس خاندان کے تصرف میں تو بے گاؤں کی جاگیر ہوگی تو اس خاندان کی نشست و برخاست اور ربوہ

باشن یا سوئی۔ حضرت مرزا غلام احمد تک پہنچتے پہنچتے دور کسی شہر پہنچے تھے۔ ان کے اندر دنیاوی ریاضت کے آثار نہ رہے۔ ان کی روحانی محنت کی بنیاد رکھنے والا تھا۔ اس سے اس کی مصیبتوں و غم جو ملتا تھا۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کی ساری زندگی اپنی دنیاوی ترقی و شوکت اور دنیاوی ریاست کی بازیافت کی کوشش میں بسر ہوئی مگر اس میں انہیں اس کی توقعات کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اور حضرت مرزا غلام احمد صاحب کی زندگی ہی میں اس دنیاوی ریاست کے آثار مٹ گئے۔ از بسکہ خاندانی امارت کے آثار نہ تھے مگر قادیان میں اس خاندان میں اس کے خابری آثار قائم رہے مدتوں تک حضرت صاحب کے مضامین کے ساتھ ”ریکس قادیان“ کے الفاظ چھپتے رہے۔

قادیان کا معاشرہ اوس دور کے کاملاً اسلامی رنگ کا معاشرہ تھا۔ ہم نے دور نہ نہیں دیکھا مگر اس زمانے کے حالات کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ ہمیں اس معاشرے میں سب کو ہی مل جل کر رہتے نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں کا اٹھنا بیٹھنا، ہم مل جل کر ایک دوسرے کی مدد کرنا اس معاشرے میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ خود حضرت صاحب کے دوستوں میں بہت سے ہندو شامل تھے اور کئی مقامات پر حضرت صاحب کے ہندو ساتھیوں نے ان کی پاکیزہ زندگی کی گواہی دی ہوئی ہے۔ بعض تو حضرت صاحب کی بعض پیشانیوں کے بھی گواہ تھے۔ ہم نے ملاوٹ صاحب کو دیکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں وہی ملاوٹ صاحب تھے یا ان کی اولاد میں سے کوئی تھے مگر قادیان میں ان کی بڑی عزت تھی۔ مضمون کا یہ حصہ قبل مختصر مودعا نامہ محمد جلیل مدظلہ کی نظر سے گذرا تو حضرت مولوی صاحب نے فرمایا کہ وہی ملاوٹ صاحب تھے۔

ہم نے اس معاشرے کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور پڑھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قادیان میں ادب و علم کی کارواں نہیں تھی۔ ہندو مسلمان سمجھتے ہیں مٹتے تو صرف ’سلام‘ کہتے تھے پھر ہمارے سامنے جو معاشرہ تھا وہ حضرت خلیفہ ثانی کے زمانے کا معاشرہ تھا اس میں بھی ہم نے ہندوؤں اور سکھوں کو صرف سلام کہتے ہی نہ سنا۔ اباجی کے سکھ دوستوں میں سے ہزارہ سکھ ہمارے یہاں آتے تو ہم انہیں پوچھتی سلام کہتے اور ہمیں دعا دیتے جیسے رہو بیٹا۔ اسی طرح بازار سے گذرتے ہوئے کئی بار ہندو ہندوؤں کو سلام کہتے مولوی جی سلام اور اباجی جواب میں یہی کہتے تھے کہ جی سلام یا سروراجی سلام مگر

اس کلچر میں اور اس کلچر میں جسے ہم احمدیہ کلچر کہتے ہیں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قادیان اور روم میں نہ صرف اسلام علیہ السلام کا روح تھا بلکہ توحید کی جاتی تھی اسلام۔ مگر وحشت اللہ برکاتہا کہہ جائے۔ اس بات کی حقیقت پڑی ہوئی تھی کہ، یورپز جن کے نئے نئے تہذیبوں میں جو بھی مٹا دے، اسلام علیہ السلام ضرور کہتے۔ یہ کہ دوران ایک صاحب سے روز ندیٰ مناسب من سوتا تھا۔ ہم نہیں اسلام علیہ السلام کہتے تھے وہ جواب تو دیتے مگر ایک روز انہوں نے ہمیں روک دیا کہ معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچاننا نہیں۔ ہم نے کہا ہماری شہ سائی تو ہے نہ نہیں آپ پہچانتے کیسے؟ ہم تو محض مسلمان جان کر اپنی عادت کے بموجب اسلام علیہ السلام کہہ دیتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ آپ جنس بدیع الزمان کیا دوس صاحب تھے جو ہائی کورٹ کے جج تھے۔ جج صاحب اللہ بخشنے بہت ملنسار آدمی تھے مگر ان کے جج عدالتی فیصلے کافی متنازعہ رہے۔ (جج سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے عدالت میں ایک درخواست دی تھی کہ ۱۹۷۳ کا آئین کفریات کا پلندہ ہے اس لئے اسے منسوخ کیا جائے)۔ برادر عزیزم خلیفہ صباح الدین احمد نے بھی کسی دوست کا حال لکھا ہے کہ اسلام آباد میں آپ بر روزاں سے اسلام علیہ السلام کہتے تو ایک روز انہوں نے روک ہی لیا کہ آپ بہت اسلام علیہ السلام کہہ چکے اب مطلب کی بات بھی کہہ دیجئے۔ جب خلیفہ صاحب نے سلام برائے ثواب کا فلسفہ چھاننا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ اسلام علیہ السلام کہنا ہمارے معاشرہ کے پلے ہوئے بچوں کی حد تک تائید بن جاتا ہے گویا احمدیہ کلچر کا پہلا جزد اسلام علیہ السلام کہنا ہے مگر ستم خریفی یہ ہے کہ اب اگر کوئی احمدی کسی کو اسلام علیہ السلام کہہ دے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتا ہے جیسا کہ اس ایف آئی آر میں درج ہے جو سارے ربوہ شہر کے خلاف درج کی گئی تھی کہ احمدی لوگ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے جان بوجھ کر اسلام علیہ السلام کہہ دیتے ہیں حالانکہ وہ صرف اپنے کلچر کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ احمدیہ کلچر کی یہی چیز سب سے پہلے ربوہ قادیان میں نو واردوں کو حیرت میں ڈالتی تھی۔ دوسرے معاشروں میں اکثریت نام کے مسلمانوں کی ہستی ہے مگر یوں سر عام اور علی الاعلان بنا تخصیص ہر سامنے آنے والے کو سلام کہنے کا رواج ان میں تھا نہ ہے۔ اسی طرح پرسش احوال کے جواب میں الحمد للہ کہنے کا رواج بھی احمدیہ معاشرہ سے مخصوص یا چند ایسے لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جو اسلامی اقدار سے گمراہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اوسا کا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز اوسا کا جاپان میں اردو کے استاد تھے۔ ہمارے



فرانٹس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ چنانچہ پاکستانی معاشرے کے آداب بھی سکھائیں۔ ہم نے اس مسئلے میں جو ڈیویسٹ تیار کیا اور بچوں کو سکھایا وہ یہ تھا "سوال" "آپ کا یہ دل ہے؟" جواب: "اللہ اللہ میں چھ سوں"۔ ہمارے شرار دہی کے مطابق جواب دیتے تھے۔ اس میں سے کئی ایک پاکستانی تھے۔ واپس آ کر۔ میں کا ایک بچہ کہنے لگا "سر آپ نے جو کچھ پڑھایا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا مگر ہم نے یہ پاکستانیوں کو اللہ اللہ کہتے نہیں پایا وہ صرف یہ کہتے ہیں میں ٹھیک ہوں"۔ ہم نے اس بچے کو بھی جواب دیا کہ "یہ ہم نے شرفاء کی زبان سکھائی ہے اور شرفاء کی زبان بولتے ہیں"۔ اب ہماری جگہ ہمارے ہی ایک پاکستانی دوست ہیں وہ ہماری ہی تیار کی ہوئی آڈیو کاسٹ سے کام چلا رہے ہیں۔ ان سے ایک بار اتفاق سے پاکستان میں ملاقا ہو گئی۔ کہنے لگے "یار یہ تم جاپانیوں کو کس اللہ اللہ پر لگا آئے ہو؟"۔ ہم نے کہا "کیوں کوئی غلط بات کی؟"۔ فرمانے لگے "نہیں غلط تو نہیں مگر میں خود اللہ اللہ کہنے کا عادی نہیں تھا اس لئے اول اول بہت دقت ہوئی"۔ ہاں بعد احمدیہ کلچر میں اللہ اللہ کہنا اجنبی ملتا ہے نہ ایسا کہنے کے لئے شوق کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح انشاء اللہ، ماشاء اللہ کے الفاظ ہمارے باب بغیر کسی تکلف کے استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرے پاکستانی معاشرے میں ایسا نہیں ہے۔ ہاں جہاں کہیں کوئی شخص انشاء اللہ کہتا ہے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ارادہ وہ کام کرنے کا نہیں۔ ہماری ایک شرار دہی ساں جو کل جاپان کی پولیس سروس میں اوچھے عہدے پر ہیں پاکستان سے واپس گئیں تو ہمیں بتے تھیں "میں انشاء اللہ نو بجے یونیورسٹی نہیں آسکوں گی گیارہ بجے آؤں گی"۔ ہم چوکے اور اس سے پوچھا "یہی یہ تم انشاء اللہ کا نیا استعمال کہاں سے سیکھ آئی ہو؟"۔ کہنے لگی "پاکستان سے"۔ ہاں تو جو کام نہ کرنا ہو اس کے ساتھ نشاء اللہ بولتے ہیں۔

بات احمدیہ کلچر کی تھی۔ قادیان میں ہم نے ہر کدوہ کو سر ڈھانپنے دیکھا۔ ربوہ میں بچے کو انڈروں میں جو چار حکمت کی باتیں یاد دلائی ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ "جنگے سر پھرنا آوارگی کی علامت ہے"۔ ہمارے احمدیہ کلچر میں جنگے سر پھرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور ہے۔ بڑوں کے سامنے توٹنے سر آنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہمارے ہندو سماجی معاشرے میں ایک روایت سر ڈھانپنے کی بھی تھی حتیٰ کہ ہندو عورتیں بھی اپنے سے بڑوں کے سامنے جاتے ہوئے سر ڈھانپ جاتی تھیں اور مسلمان

موتیں تو ہر عمر سے رہتی تھیں۔ رہا دوسرا خیال لوگ بھی کان پر ہاندا رہ رہتے تھے۔  
 قادیان میں ہم نے یہی دیکھا کہ سب لوگ سر پر گجڑی یا ٹوپی رکھتے تھے۔ یہ جو عام مسجدوں میں تنکے کی  
 بنی ہوئی یا پتھر کی بنی ہوئی ٹوپیاں پڑی ہوئی ہیں کہ غماری نماز کے وقت سر پر اڑھ میں نہیں ہوتی  
 تھیں۔ جسے سر ڈھپنا ہوتا تھا وہ نماز کی نیت سے گھر سے چھٹا تو سر ڈھاپ کے چلتا تھا۔ نماز میں سر  
 ڈھاپنا تہذیبی مسند ہے۔ ترقی اوسط میں یا ایران عراق شام مصر عراق وغیرہ میں لوگ ہنگامے سر نماز  
 پڑھتے ہیں مگر احمدیہ معاشرہ میں سر ڈھاپنے کی روایت رسی ہے اور یہی روایت جاری دوسری ہے کیونکہ  
 خفاء کا سہ بھی یہی ہے۔ ہمارے علماء اب بھی کلاہ پر گجڑی باندھتے ہیں مگر چھ عام معاشرے سے یہ  
 رواج رفتہ رفتہ مٹا چلا جا رہا ہے۔ قادیان میں اکثر بزرگوں کو ہم نے گجڑی باندھے ہوئے دیکھا تو  
 ہمارے ابا کسی زمانے میں گجڑی باندھتے تھے نوپا تو آپ نے بہت بعد میں شروع کی۔ ہمیں یاد ہے جو  
 مبلغ باہر کے مراکھ میں تبلیغ کے لئے جاتے یا واپس آتے ان کے استقبال و ادایع کے لئے سارا شہر  
 نشین پراٹھ پڑتا تھا۔ مبلغ سر پر بڑا مسد باندھتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ تبلیغ کے لئے باہر جا رہے ہیں  
 تبلیغ کا فرض ادا کر کے واپس آئے ہیں۔ مبلغین کا آنا جانا زیادہ آنا م کیونکہ جماعت کا جو مبلغ ایک  
 بار باہر چلا جاتا تھا اس کے واپس آنے میں مدتیں گزر جاتی تھیں کیونکہ جماعت کے پاس وسائل نہیں تھے  
 ابتدا میں جماعت کے جو مبلغین باہر گئے ان میں سے حضرت حکیم فضل الرحمن صاحب مولینا جلال الدین  
 شمس صاحب مولینا عبدالرحیم غیر صاحب مولینا نذیر احمد علی صاحب بہت لمبا لمبا عرصہ باہر رہے۔ بھی  
 حاسن علی میں مولینا نذیر احمد بشر صاحب کا انتقال ہوا ہے آپ کالج کے بعد تبلیغ کے لئے چلے گئے اور دس  
 برس کے بعد واپس آ کر مھنتی لی۔ یہ تو جملہ مقررہ درمیان میں آگیا ورنہ ذکر سر ڈھاپنے کا تھا۔  
 قادیان اور ربوہ میں کسی مبلغ کا آنا جانا باقاعدہ ایک جشن کا حکم رکھتا تھا۔ حضرت صاحب خود بھی نشین پر  
 تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک استقبال کے موقعہ پر ہم نے نشین پر جھنڈیاں لگی ہوئی بھی دیکھیں مگر یہ یاد  
 نہیں کس کا استقبال تھا۔ بہر طور استقبال اور مشایعت ہمارے کلچر کا حصہ تھا اور اب بھی ہے مگر یہ آج کل یہ  
 فرض و فرائض کے احاطہ میں آتا ہوتا ہے۔ اسی الوداع یا استقبال کا ایک حصہ تھا۔ سفر شروع کرنے سے  
 پہلے دعا کرنے کا عام رواج تھا۔ قادیان کے زمانے سے ہی ہمیں یاد ہے کہ گھر کا کوئی فرد سفر پر رہا۔

مصر کے لئے تو بیچوں کی حضرت مہدی علیہ السلام صاحب مصری سے درخواست کی جاتی کہ وہاں کرا دیں اور وہاں کے بعد سفر سفر پر روانہ ہوتا۔ دیگر لوگوں میں یہاں ان نہیں تھے۔ وہاں بار بار یہاں سے سنا میں باندھ کر نکلتے تھے۔ امام ضامن کا مطلب یہ تھا کہ سفر پر روانہ ہونے سے قبل سفر کے بار پر سونے یا چاندی کا کوئی سکہ باندھ دیا جاتا تھا کہ سفر بخیر تمام ہونے پر وہ صدقے میں دے دیا جائے۔ بعض لوگوں کے پاس یا تعداد تھانڈوں کا رواج بھی تھا اور بے ٹکڑا ہوا۔ ہاں کبھی یہاں نہیں روانہ ہوتا ہے۔ وہاں سب پڑھ بھی جاتی ہے۔ مسافر سفر پر روانہ ہوتا ہے تو وہاں کر کے چلتا ہے۔ رستے میں امام میں کرتا ہے کہ مسافر کی دعا میں زیادہ قبول ہوتی ہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی مسافر میں دعا میں کرنے کی باقاعدہ درخواست کرتے ہیں۔ مہمان کی جگہ پڑھا کہ حضرت صاحب نے مسافر کو سفر پر روانہ ہوتے وقت دعا کرنے کی نصیحت فرمائی اور رستے میں کثرت سے استغفار کرنے کی تلقین بھی فرمائی۔ حضرت مومینار انجیلی صاحب نے سفر میں استغفار پڑھنے کی بہت نصیحت بیان فرمائی ہے۔ ہمارے معاشرے میں استغفار ہی امام ضامن کا نعم البدل تھا اور ہے۔ ہمارے ہاں تقویٰ گنڈے کا رواج نہیں ہے ہمارے ہاں اس کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔

استقبال و مشایعت کے علاوہ عیادت بھی احمدیہ گجرات کا حصہ ہے۔ یہاں کی عیادت کرنا ثواب سمجھا جاتا ہے دوسرے لوگ بھی عیادت کے لئے جاتے ہیں مگر تنہا یہ ان کی نیت عیادت سے ثواب کی نہیں ہوتی یا شاید ہوتی ہو مگر بظاہر دیکھا کہ زیادہ دور آیا ہے۔ احمدیہ گجرات میں عیادت غیر قرآن کی طرح ایک فرض کے طور پر ہے۔ ہم نے حضرت صاحب کو کئی بار مریضوں کی عیادت کے لئے لوگوں کے گھروں میں جاتے ہوئے دیکھا۔ قادیان میں حضرت صاحب ایک بار ہمارے محلہ میں کسی کے گھر عیادت کے لئے آئے ہوئے دیکھے تو ان کی علالت پر بہت رشک آیا۔ اسی طرح حضرت امام جان تو ہر بار کی عیادت کے لئے دور دراز کے محلوں میں بھی تشریف لے آتی تھیں اور جب تک عمر اور قوی نہ ساتھ دیا اس پر پابندی سے عمل فرماتے۔ حضرت خلیفۃ المسیح (شاہد) ہمارے دوست عبدالسلام اختر کی عیادت کے لئے ہسپتال تشریف لائے تو ہم بھی اس وقت حاضر تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح (شاہد) اربع تو اکثر مریضوں کی عیادت کے لئے آتے جاتے تھے۔ بعد یہاں تک التزام تھا کہ ہم ہسپتال میں تھے تو لندن سے امیر صاحب سویڈن کو

میں نے ان سادہ لوح لوگوں سے آکر محبت کا سبق سیکھا۔ ان کی یہ بات تھی کہ عیادت بھی ساری معاشرت کا اہم حصہ تھی مگر اس میں بھی دھواں اور آگ اور بھانپنا یہ کہ خاں ہاتھ عیادت بھی وہی عیادت ہے؟

یہ تو خیر ہمارا کلچر کیا ساری دنیا کا کلچر ہے۔ کسی سے ملنے جاؤ تو وہ تھوڑا سا تھنڈے لے کر باؤں میں آئے۔ یہ تو خیر مہینے کا نتیجہ یہ تھا کہ عیادت بھی بوجھ بننے لگی اور رفتہ رفتہ اس کا رواج ہی مٹ ہو گیا۔ ہمارے دوست پروفیسر نصیر احمد صاحب پر بھی بار بار کا تھنڈا ہوا تو ہسپتال میں ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا کہ کوئی مادیاتی نہ آئے۔ چنانچہ ان کے کمرے کے باہر ایک کانپن رکھ دی گئی کہ عیادت کے آئے والے دوست اس میں اپنا نام لکھ دیں جزا تم خدا حسن الجزاء۔ نصیر صاحب ہسپتال سے گھر واپس آئے تو اس کانپن کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے کیونکہ اس پر کسی ایک نام کا اندراج بھی نہیں تھا کیونکہ کوئی شخص محض کانپن پر پناہ مانگھ کر اپنی محبت کی تکلیف نہیں کرتا چاہتا تھا۔ حالانکہ سادہ سی بات تھی کہ مریض کا مٹا و متقاضی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے دیا جائے مگر ہوتا یہ تھا کہ جو چوہدری تھے وہ مریض سے ملے بغیر ملتے نہیں تھے اور ہمیں واپس بھیج دیا جاتا تھا وہ دلچسپ لوگوں سے ہوئے لوگ تھے کہ انہیں مریض کی عیادت کا موقع کیوں نہیں دیا۔ یہاں ہسپتال میں عیادت کرنے کے لئے آنے والوں پر کوئی پابندی نہیں مگر کوئی عیادت کرنے والا جھانک کے بھی نہیں دیتا۔ عیادت کی انتباہ بھی جاتی ہے کہ اپنے گھر سے بھول والوں کو ٹیلیفون کر دیا کہ انداز ہسپتال میں فدا نام کے مریض کو فڈل وارڈ میں فڈل بستر پر یہ پھولوں کا تھنڈا ان کی طرف سے پہنچا دیا جائے اور جسے پھولوں کا تھنڈا مل جائے وہ پھول لے نہیں سکتا۔

اور تو اور لوگ باگ مرنے والوں کی عزیت کے لئے آنے کی تکلیف بھی نہیں کرتے۔ ہمارے ہسپتال میں تھے کہ ہمارے ساتھ کے ایک مریض کا انتقال ہو گیا۔ پچھراگئی دن سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا نرس آئی تو ہم نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ کہنے لگی بڑا خوش قسمت مریض تھا اس کے بیٹے نے ایک ہزار میل دور سے اس کے لئے پھولوں کا تھنڈا بھیجا ہے۔ اب بھی اس کی میت پر دھڑ ہے سرد خانے میں۔

عیادت کے ساتھ ہی یہ امر بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ دعا بھی احمدیہ کلچر کا ضروری حصہ ہے۔ یوں تو ہمارے سارے معاشرے میں دعا کا لفظ رچ بسا نظر آتا ہے مگر یہ ”آپ کی دعا ہے“ یا ”آپ کی دعا

سے تہ محدود ہو کر رہا ہے۔ شہر و دیہات کا عہد بگڑ جاتا ہے نہ سنی الہامی دعاؤں کے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ اس دور میں دعا ایک فقرہ بن جویں تو من دیا جاتا ہے۔ مگر احمدیہ فحش میں دعا محض ایک جملہ کسب و کسب کا پرچہ بن جاتی ہے۔ پرائی تارکوں میں بڑھاپے کا کس کے فرائض ادا ہوئے کو باقاعدہ دعاؤں سے کہتے تھے۔ ان کا کام ہی یہ تھا کہ مختلف عرسوں اور بارگاہوں پر باقاعدگی سے حاضر ہو کر دعا میں کرتے رہیں۔ ان پیشہ ور دعا گوؤں میں یہ خدمت اور شہادت چلتی تھی۔ شاہان مہدیہ میں یہ دعا گوئی اس حد تک تھی کہ ماگو حضرت کو باقاعدہ دعاؤں سے کہتے تھے مگر اس کے صلے میں ان سے یہ توقع بھی رکھی جاتی تھی کہ وہ حکومت وقت کے فرائض ادا کریں۔ بعض بادشاہوں کے بارے میں درگاہوں پر جانے کے واقعات بھی درج ہیں مگر جماعت احمدیہ درگاہوں یا حزاروں پر منت مانگنے کے لئے نہیں جاتی۔ جماعت احمدیہ کے ہاں خدا کا تصور زندہ خدا کا تصور ہے۔ احمدیہ کلچر میں خدا سے تعلق کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہر حمدی خدا سے براہ راست تعلق پیدا کرتا اور اسی سے ملتا ہے۔ زندہ خدا کا زندہ تصور جماعت احمدیہ کے کلچر کا بنیادی حصہ ہے۔

در اصل ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کا محدود تصور رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا بولتا تھا۔ سنتا تھا۔ کلام کرتا تھا۔ اب نہیں کرتا۔ جماعت احمدیہ سمجھتی ہے خدا بولتا بھی ہے سنتا بھی ہے جواب بھی دیتا ہے۔ دعاؤں کی اجابت دیکھیں یقیناً کی ذریت کا ضامن ہے۔ یہ ٹھیک ہے جماعت کے افراد جماعت کے بزرگوں یا خفاء سے دعا کی درخواست کرتے رہتے ہیں مگر اب کرنا اپنی دعاؤں کو تقویت دینے کے لئے ہوتا ہے۔ احمدیہ کلچر میں پلے ہوئے لوگ جب دعا کا غلط استعمال کرتے ہیں تو محض اوپر سے طور پر ایب نہیں کرتے ان میں سے ہزاروں لوگوں نے خدا کی قدرتوں کا خود تجربہ کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی ہوش میں ہزار ہا ایسے لوگ دیکھے جو مکالمہ و مخاطب الہیہ سے مشرف تھے۔ ہم نے دعاؤں کے ذریعہ معجزے رونما ہوتے دیکھے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ معجزے اب بھی ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ایک بار پاکستان کے آمر مطلق نے یہ یوں داغ دیا کہ ”اب معجزے رونما نہیں ہو سکتے۔ وہ وقت گزر گیا۔“ تب خدا نے اسی شخص کو اپنے ایک انداز کی معجزہ کا نشانہ بنایا۔ احمدیہ کلچر میں دعا اور خدا کے ساتھ زندہ تعلق اور خدا کی طرف سے دعاؤں کی اجابت کا یقین شامل ہے۔ دوسروں کو ایسا یقین میسر نہیں اسی لئے وہ دعا کو محض ایک ”



یہاں پہلے چکر میں احمد کے مطابق یہاں پر اراکین تھے جن کے ساتھ ان کے  
ساتھ جی کی سہولت تھی۔

یہ یہ کچھ میں دیکھتا ہوں وہاں کے کہنا اراکین کی غرضی اور اجتماعی تحریک نہایت ہم سوار  
میں۔ ہمیں دانتے کہ سرت صحت کے ساتھ امان اور صحت خلیفہ کے ساتھ اور حضرت خلیفہ المسیح  
اربع کی بیماریوں کے دور میں ساری جماعت دروہان اور اراکین سے وہاں میں یہ کرتی تھی اور یہ وہاں میں  
انفرامی طور پر بھی ہوتی تھی اجتماعی طور پر بھی۔ نیز میں بھی نماز کے بعد ہی جماعت احمدیہ کے کچھ  
میں نماز کے بعد ہاتھ کر دعا کرنا شامل نہیں۔ جماعت کا حیا یہ ہے کہ نماز سے فوراً سو کر دعا سے  
لے ہاتھ اٹھا لینا ایسے ہی ہے جیسے آدمی اللہ تعالیٰ کے دربار سے باہر آ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر نماز  
دے گا خود ایک دعا بکس لئے جماعت احمدیہ کے فرمانبرداروں کے اندر ہی دعا کو روک دیتے ہیں۔ جماعت  
احمدیہ کے کچھ میں یہ بات بھی انوکھی ہے کہ جماعت کے اخباروں میں دعا کی تحریک کے لئے ہاتھ روک  
اعلان چھپتے ہیں لوگ اپنے تئیں میں مبتلا یا بیمار بھی نہیں کہے دعا میں کرتے اور ان کی بھائی  
چاہتے ہیں۔ دوسرے اخبارات آپ کے سامنے ہیں آپ کو کوئی ایسا اعلان کسی اور اخبار میں نظر نہیں  
آئے گا۔ کہیں کہیں اخباروں میں تقریری شذرے نظر آجائیں گے مگر ان کی حیثیت محض تقریری ہوئی کسی  
کے احتمال پر پسندگاہ کی طرف سے دعا میں کرنے کی درخواست نظر نہیں آئے گی۔ احمدیہ کچھ کی یہ  
بات دوسروں سے منفرد ہے۔ یہ کچھ زندہ گی اور موت دونوں کیفیتوں میں دوسروں سے جدا گانہ ہے۔  
اس لئے جب مل یہ کہتے ہیں کہ احمدیوں کا کچھ دوسروں سے جدا ہے تو کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں کہتے۔  
احمدیوں کا کچھ اسام کے بتدائی اور کچھ ہے دیگر مسلمان اپنے کچھ سے چودہ سو سال سے نکل گئے ہیں  
اس تیز بھاگنے والے کی طرح جو اپنی منزلی مقصود کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو اور بگسٹ بھاگے چل جا رہا ہو اور  
جانتا ہو کہ دوستی راہوں میں جتا ہے۔ احمدیہ کچھ میں ہر وقت دعا کی گنجائش اور موقع موجود ہے جب  
سے پہلے۔ جلسہ کے بعد۔ دعوت سے پہلے۔ دعوت کے بعد۔ غرض ہر موقع پر۔ جلسہ سالانہ جب ختم ہوا  
تھا تو انکھوں کا مجمع نہایت تفریح سے دعا میں کرتا تھا اور درود کو آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا ہمارے کئی غیر  
جماعت دوست جلسہ میں آتے اور اس نظارہ کو دیکھ کر پریشان ہو جایا کرتے تھے کہ کھوں لوٹ لیاں۔

رہے ہیں؟ کیا سب واقعات اس بات کا یقین ہے کہ ان کی اصلاحی قیوں کو جان کی ۱۸۷۹ء کے جلسہ پر  
میرے ایک نہایت سینئر سی بی پی دوست جو اس وقت ایک پیشہ ور کے مشن تھے میرے ذاتی مصاحبت کے  
طور پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ جلسہ کا افتتاح ہوا۔ جماعت نے پہلی بار جلسہ گاہ میں ایف بی ایف  
کے سپاہیوں کو مورچہ بند دیکھا۔ جلسہ گاہ کے لئے جو سفید کپڑا لٹایا تھا اس کے ہر ستون پر ایک ایف بی ایف  
سپاہی ایستادہ تھا۔ بہ ظاہر بتلوا صاحب یہ اچھا چاہتے تھے کہ ان کے یہ کسی قلمی مسلح طاقت ہے۔ حضرت  
صاحب کی افتتاحی تقریر شروع ہوئی۔ ساری سی بی پی تقریر قرآنی دعووں پر مشتمل تھی۔ ایک دعا بار بار  
اب الیٰی کہ "اے خدا ہمارے دشمنوں پر گرفت فرما اور ہماری زندگیوں میں ہمیں ان کا نجوم دکھا۔"  
کسٹر صاحب عربی نہیں جانتے تھے مگر دعائیں تو قرآن کی تھیں اور وہ اہل عربی جانتے تھے۔  
تھوڑی دیر کے بعد کسٹر صاحب کا پتہ لگے میں ان کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا تھا نہیں ہرے آئے۔ میں  
نے کہا کیا؟ کہنے لگے جلدی یہاں سے چو یہ نہیں تو دعاؤں سے آسمان کو ہائے دے رہا ہے ایسا نہ ہو  
آسمان ٹوٹ پڑے۔ بھٹو صاحب کا زوال ہو تو انہی مشنر صاحب نے مجھے جاپان میں خط لکھا کہ تمہارے  
طائفہ کی دعائیں قبول ہوئیں۔ میں نے انہیں کھا کہ آپ نے ایک کنزور جماعت کی طاقت دیکھی؟

دعاؤں کی قبولیت کا یقین جماعت کے کلچر کا حصہ ہے۔ انھوں نے جماعت میں جن میں یاروں کو شیطانی  
سہنی ہوتی۔ ناممکن ممکن میں بدلا گئے اور یہ سب باتوں میں ان کے دیکھتے دیکھتے ہوئے۔ اوچا رہیں  
پہلے شاہ عالم کے ایک فورم نے مجھے جماعت احمدیہ کے عقائد کے بارہ میں اظہار خیال کی دعوت دی  
میں ایک صاحب نے سوال کیا "کیا آپ ایک دو غلطوں میں جماعت احمدیہ درمیان مسدوسوں کا فرق  
بتا سکتے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں"۔ جماعت احمدیہ خدا کو زندہ مانتی ہے دوسرے نہیں مانتے۔ کہنے  
لگے یہ جواب وہاں میں نے کہا یہی جواب ہے۔ "سوائے خدا کے زندہ ہونے کا یقین ہو تو وہ اس کے  
لباؤں سے نکال دیوں کریں؟"

احمدیہ کلچر خدا کے زندہ ہونے کا تصور پیش کرتا ہے اسی لئے دعاؤں کی قبولیت پر بھی یقین رکھتا ہے۔ وہ  
ایک مسلم شخص احمدیہ کلچر میں موجود ہے۔ دعا کے ساتھ ہی نماز کا ذکر آتا ہے۔ نماز ہر مسلمان پر حتمی  
ہے احمدی بھی پڑھتے ہیں۔ نماز بھی وہی۔ تجوید بھی وہی۔ مگر ایک فرق اور ہے وہ یہ ہے کہ احمدیہ کلچر

میں صرف جانتے رہا کہ جتنے محض ہر طرح کے طریقے کی جاتی۔ قادیان اور ربوہ میں نماز کے اوقات میں تمام دن میں ہم سو جاتی تھیں۔ کاروبار منقطع ہو جاتا تھے یہ برفیہ کے کسی اور مسلمان سے جبرے تہر میں بھی ایسا ہوتا ہے؟ یہ سب کچھ خود ہماری ہی مرضی سے ہوتا تھا۔ ہمارے کانٹ میں غیر روز بہرعت طلباء کی تعداد بہت تھی نہیں ہمیشہ ہی کاندھاروں سے یہی شکایت رہتی تھی کہ نماز کے وقت نماز کے لئے کانٹ میں بند کر دیتے ہیں اُس وقت کسی چیز کی ضرورت نہ تو وہ نہیں دیتے کہ نماز ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قادیان میں بھی یہی طریق ہم نے دیکھا تھا بازار میں بند دکاندار بھی تھے وہ نماز کے اوقات میں پروڈر ادا دیتے تھے۔ ربوہ میں تو ایسا عام ہوا کہ دکانداروں نے نماز کے اوقات میں چائے تک دینے سے انکار کر دیا اگر کسی نے کہا بھی کہ یہ مہمان ہیں انہیں جلدی جانا ہے تو نکاسا جواب داتا پھر کیا؟ کیا میں ایک پیالی چائے کے لئے اپنی عاقبت خراب کر لوں؟ نماز کے ساتھ یہ تصور کہ نماز کے وقت دکان بند کر دینا کسی پر احسان نہیں اپنی ہی عاقبت سنوارنے کا سامان ہے۔ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ یہاں ایک بات یاد آئی ایک بار لہور کے ایک ڈپٹی کمشنر صاحب نے اعلان کیا کہ "آئندہ سرکاری اہکار اس بات کا خیال رکھ کریں گے کہ لوگ نماز کے وقت نماز پڑھا کریں اور یوں ہی وقت ضائع نہ کریں۔" خدا معلوم ڈپٹی صاحب کو یہ خیال کیوں اور کیسے آ گیا تھا سارے ملک میں بابا کارچ گئی کہ حکومت کو لوگوں کی نمازوں سے کیا غرض ہے؟ نماز ہر انسان کا اپنا ذاتی فعل اور معاملہ ہے حکومت کو اس سے کیا سروکار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان دنوں پاکستان ٹائمز لاہور میں انور نامی ایک کارٹونسٹ ہوا کرتے تھے ان کا کارٹون کرنا اچھا تھا۔ پہنے صفحے پر ننھے کارٹون ہوتا تھا۔ اس خبر کے چھپنے کے اگلے روز ننھے کا کارٹون چھپا۔ ننھے میاں سجدہ میں پڑے ہیں اور کن اکھیوں سے آتی ہوئی کار کو دیکھ رہے ہیں اور ساتھی سے پوچھ رہے ہیں "خود سے دیکھ لو ڈپٹی صاحب کی کار ہی ہے نا کوئی اور تو نہیں؟"

در اصل یہ سب بچہ گھروں کے اندر سے شروع ہوتا تھا احمدیہ کالج کا اہم حصہ اولاد کی تربیت ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد کی تربیت ایسے رنگ میں کرتے تھے کہ بچے ایک خاص رنگ میں رنگے جاتے تھے ہر احمدی گھرانے میں گھر کے بڑے نماز کے لئے خاص استمرا کرتے تھے اور بچوں کو بچپن ہی سے نماز کی عادت ڈالتے تھے۔ پھر اکثر افراد تہجد کے بعد دی تھے۔ تہجد کی نماز پڑھتے۔ پھر بچوں کو فجر کی نماز کے لئے دکان

خود ناز کے بعد بچوں کو درس ایسے کے سے بیٹھ جاتے اور یہ رس قرآن حدیث یا دینی مسئلہ احمد یہ یا اس کے خلفاء کی کتابیں یا روایات پر مشتمل سونا اس طرح بچے ابتدائی سے اس رنگ میں رہتے ہو جاتے جسے حمید علی پھر کارنگ کہا جاتا تھا۔ یہ رنگ چڑھتا بہت مشکل کام تھا اور ہے یہ تاکہ جب تک وہ بے اختیار اس رنگ میں رہتے نہ ہوں بچوں پر یہ رنگ نہیں چڑھتا اور چڑھ جائے تو چھانٹے نہیں چھتے ہم لوگوں نے اپنے گھروں میں اس کی ماحول دیکھ اور یہ ماحول صرف قادیان یا ربوہ تک محدود نہیں تھا جہاں احمدی کھرانے تھے اس کا یہی رنگ تھا اور اس میں شہر یا گاؤں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

ہمارے ہاں بیسویں صدی کے تیسرے چوتھے عشر تک یہ رواج تھا کہ لوگ سفر پر جاتے تو ہاتھوں میں ٹھیرنے کی بجائے اپنی جان بچان کے لوگوں کے ہاں ٹھیرتے تھے گاؤں میں چونکہ ہاتھوں کا رواج نہیں تھا اس لئے مسافر گاؤں کی مسجد میں ٹھیرتے تھے اور نمازی دیکھتے کہ مسجد میں کوئی مسافر موجود ہے تو اس کے لئے کھانے اور سونے کا بندوبست کر دیتے۔ یہ ہندوستان کا عام کلچر تھا۔ احمدیوں میں یہ ہوا کہ اگر کوئی مسافر سفر پر روانہ ہوتا تو کسی احمدی دوست کا پتہ حاصل کر لیتا اور بغیر کسی جان بچان کے صرف یہ کہ یہاں کافی ہوتا کہ وہ احمدی ہے اور لوگ سرکار ماحول پیدا ہو جاتا یہ اخوت احمدیت کی پیدا کی ہوئی تھی۔ قادیان یا ربوہ میں مہمان خانہ موجود تھا دوسرے شہروں میں بھی مہمان خانے یا ٹکڑے موجود ہوں گے مگر دوسرے ہاں کی روایت وہ ہے جسے شرفاء کی روایت کہتے۔ اب بڑے زمینداروں کے ہاں بھی مہمان خانوں کا وجود موجود ہے مگر وہاں ایک دو وقت کا کھانا دے دیا جاتا ہے اور اس مہمان کو مہمان نہیں دیکھا جاتا ہے۔ احمدیہ کلچر میں مہمان کو خاص طور سے احمدی مہمان کو بڑا اہم فرد سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ربوہ میں ہمارے غیر احمدی دوستوں کا کثرت سے آنا جانا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کشائش بھی دے رکھی تھی اس لئے بہت مہمان آتے تھے اور اکثر ایسے مہمان تشریف لاتے تھے جن کا جماعت سے تعلق نہیں تھا ایک دو بار ایسا ہوا کہ مہمان نے صبح ٹھہر کر شکایت کی کہ تم لوگ آرام سے سونے کیوں نہیں دیتے۔ صبح صبح کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے پھر مکھنے والے بچے سحری کے وقت ہی صحن علی نیتین۔ صحن علی نیتین کے لئے لگا لگا کر نیند سے چونکا دیتے ہیں تم کوئی ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ ایسا نہ ہو۔ ہم نے کہا کیوں نہیں سو سکتا ہے تمہیں چھیوٹ چھوڑ آتے ہیں جہاں دو پہر تک پڑے سوؤ گے کوئی بھی تک کے بھی

نہیں۔ یہ ۱۰۰۰ سال قبل ایک صدی میں پیدا ہوئے۔ ہماری اس حقیقت سے آگاہ اس نے ہماری آمدی گھروں میں سہانہ ہوتے تو انہیں کوئی اجنبیت نہ ہوتی دوسرے آج تہذیب محسوس کرتے۔۔۔

ہمارے دوست مسز جنس سجاد احمد جہاں مرحومہ کی کورٹ کے پھر پریم کورٹ کے جج رہے پھر چیف ججیشن کسٹرمونس۔ ہائی کورٹ کی ججی کے اور ان آپ۔ بوہ تشریف لائے مگر قیام چنیوٹ کے سرکٹ ہاؤس میں فرمایا۔ ایک رات وہاں گزاری۔ اگلے روز شام کے وقت ربوہ کالج میں تقریر کے لئے تشریف لائے یہ سال ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ ربوہ میں چند گھنٹے قیام فرمایا۔ شہر میں تھوڑا سا گھومے۔ وہاں جی پر میں انہیں چنیوٹ تک چھوڑنے گیا۔ فرمانے لگے "چنیوٹ، ربوہ میں صرف چھ میل کا فاصلہ ہے مگر دونوں شہروں کے کلچر میں چھ صدیوں کا فرق ہے۔" پھر بعد کو میرے چاندنی دوستوں نے بھی جو جاپان سے ربوہ آئے اور چنیوٹ میں گلابی کی مصنوعات خریدنے کے لئے تشریف لے گئے یہی محسوس کیا کہ دونوں شہروں کے کلچر میں بہت تفاوت ہے۔ دراصل یہ تفاوت احمدیہ کلچر کا پیدا کیا ہوا ہے۔ چنیوٹیوں کے بارہ میں جناب مشرق احمد یوسفی کا فرمودہ حرف آخر ہے "چنیوٹی یا مین پگھل بھی ہو جائے تو دوسرے کی گلابی اتار کر اپنے ہی گھر میں پھینکتا ہے۔" یہی چنیوٹ کا کلچر ہے۔

ہم احمدیہ کلچر کے اس حصہ کا ذکر کر رہے تھے جس کا تعلق تربیت سے ہے اس تربیت کا ایک حصہ بچوں کی تعلیم سے متعلق تھا ہر احمدی بچہ سکول شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید، نظر، ضرور پڑھ لیتا تھا ذرا حرف شناسی کی عمر کو پہنچتا تو ماں باپ خود قرآن پڑھانا شروع کر دیتے یا کسی دوسرے کے پاس چھوڑ دیتے ہماری پھوپھی بیگم جی قرآن پڑھانے میں بہت مشہور تھیں۔ مشہور تھا کہ غبی سے غبی بچے کو بھی قرآن پڑھنے میں حلق کر دیتی ہیں۔ ہم نے بھی انہی سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا ہے۔ سارے محلے کے بچے قرآن پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ ہمارے گھر کا سارا ماحول ہر وقت قرآن کی تلاوت سے گونجتا رہتا تھا کیونکہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بچہ قرآن پڑھنے کے لئے حاضر رہتا تھا وقت کی تخصیص یا پابندی نہیں تھی بچے اپنی سہولت کے مطابق آتے تھے۔ یہی حال دوسرے محلوں کا بھی تھا کوئی نہ کوئی ایسا شفیق وجود موجود ہوتا جو بچوں کو بلا معاوضہ قرآن پڑھانا رہتا۔ بچوں کو ملا لٹوں کے پاس نہیں بھیجا جاتا تھا یہ خدمت مجھے کی



بڑی دڑھیاں کرتی تھیں۔ احمد و بیٹن سے مراد تھیں۔ تو باپ کا کوئی بچہ تک ایسا رہا ہوگا جس نے ہمدی  
پھو بھی تی سے قرآن نہ پڑھا ہو۔ وہ میں بھی بس تک میانی اور محنت سے جرات دی یہ خدمت کرتی  
رہی۔

اس قرآن شری کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہمدی بچے کا تخلص ۱۰ برس سے متا رکھتے جاتے تھے۔ ہر ایک ہر  
حیران رہ گئے کہ ہمارے ایک دوست جو بعد کو بڑے سیر دور مدفصل ریونیٹر بن گئے ایک بار ہمارے  
ہاں مہمان تھے۔ صبح صبح آپ نے گھر کے اندر سے ایک چھوٹے سے بچے کی تلاوت کرنے کی آواز سنی تو  
”گم رہ گئے۔ پوچھے گئے یہ تو چھوٹا سا بچہ کون ہے جو قرآن پڑھ رہا ہے؟“۔ ہمدی نے کہا ”ہو راجھو نا  
ہمدی ہے نیم مہدی“۔ کہنے لگے یا تر عجیب لوگ ہو۔ میں اب تک قرآن نہیں پڑھ سکتا کہ ماں باپ نے  
بچپن میں پڑھایا ہی نہیں۔ بچوں کو قرآن سکھانا احمد یہ کچھ کا حصہ تھا اور ہے۔ ربوہ اور قادیان کی گلیاں صبح  
صبح قرآن کی تلاوت سے گونجا کرتی تھیں۔

سکول میں میٹرک تک قرآن کا ترجمہ پڑھ دیا جاتا تھا یہ تعلیم انہی تھی ورنہ بچے کو میٹرک کے امتحان میں  
میں کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ قادیان میں تو سکول کے وجود سے پہلے مدرسہ احمدیہ کا وجود تھا جس  
میں قادیان کے اکثر بچے پڑھتے تھے اور آخر مولوی فاضل کا امتحان پاس کر کے نکلتے تھے۔ مولوی فاضل کا  
امتحان صرف ان لوگوں کے لئے ہی نہیں تھا جو مسیح بنے والے ہوتے تھے شرع بھی مولوی فاضل کا امتحان  
پاس کرنا اپنے لئے باعث عزت جانتے تھے۔ مولوی فاضل کے امتحان کو آجکل عربی فاضل کا امتحان کہتے  
ہیں۔ اسے دے مولویان قوم۔ مولوی کا لفظ شاید نام ہو گیا کہ اب یونیورسٹی بھی اسے اپنا کسر نشان سمجھتی  
ہے۔ مدرسہ احمدیہ کوئی مولویوں کا مدرسہ نہ تھا یہ جنرل اختر حسین ملک، جنرل عبدالعلی ملک اور بریگیڈر  
”میں“ اس اسی مدرسے کے پڑھے۔ میں اس مدرسے کا حصہ تھا کہ اس میں اندر کچھ کچھ اور  
انہی رہا جاتا تھا۔

مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے والے شخص کی معشرے میں قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی تھی ربوہ میں  
۱۰۔ دوست سید عبدالغنی پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل کے امتحان میں اول آئے تو شہر میں ان کا  
اور ایک چہ چاہو اور لوگ انہیں دور دور سے دیکھنے کو آئے (وہ تو اب بھی آتے ہیں)۔ پھر ہم نے تو دو

رواں رہا۔ مجھ کو سبب غیر احمدی اور احمدی منظروں میں روز شمار سے منظر ہے۔ دو کرتے تھے۔ دونوں طرف سے پڑھتے تھے لوگ، کھٹے ہوتے اور خاص علمی حوس میں منظر ہے ہوتے۔ غیر احمدی منظر اگر بدرجائی پر، ترے تو ہمارے منظر ملک عبدالرحمن قادری مرحوم انہیں انہی کے سکے میں نقد ادائیگی کر دیتے تو بہت لطف رہتا۔ ان کے منظر کو کوٹہ دور دور سے سننے کے لئے آتے تھے پھر مخالف علماء کی ہڈیاں بڑھنے لگیں تو منظر کو کاروان بھی نہ ہو گیا۔ اور اب۔ اب تو یہاں تک زباں بندی ہے کہ لوگ سوچ چکے ہیں، الیٰ الیٰ ہا کوئی نہ تھے چلے جاتے ہیں مگر احمدیوں کو ان کا جواب دینے کی اہلیت نہیں اور مسلمانوں کا خطاب ہا کوں ہے۔ یہ دور ہاں بندی ہے لیسا میری سلسل میں۔ یہاں وہاں کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔ اب جو کلچر تقابلی پذیر ہو رہا ہے دنیا میں فی الجرح ہے کہ جسے تیس دانوں میں رہنے والی زبان کا کلچر کہئے۔ وہ زمانے لہ گئے جب ٹوٹ باٹ سسے مسائل جاننے کے لئے بحث کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہمارے دوست محمد اسماعیل ڈھیریہ سے ایک موسوی صاحب کو رہو مانے۔ پہلے انہیں حضرت مولانا غنیمت صاحب سے ملایا پھر حضرت قاضی محمد نذیر صاحب مالپور کی سے ملایا ان کی تشنگی نہ ہوئی تو انہیں لے کر ہمارے گھر آ گئے۔ ہمارے بالائے تختے تہہ باندھے اور دیہاتی لباس میں رہنا پسند کرتے تھے کیونکہ ان کی ساری تنگ و تنگ دیکھی علاقوں تک ہی محدود تھی۔ اسم سجاد ان موسیٰ کو لے کر آئے۔ بیٹھک میں بٹھائے گئے۔ اباجی مرحوم اسی طرح تہہ باندھے اور بنیاد پہنے بیٹھک میں آ گئے پوچھا کیسے تشریف لاناؤ۔ سجاد صاحب کہنے لگے یہ موسیٰ پھالیہ سے تشریف لائے ہیں۔ نذر آتی ہیں اگر انہیں کسی بات کی سمجھ آ جائے تو کسی سے نہیں ڈرتے۔ اباجی نے پہلی بات کہی "درست فرمائیے۔ پھالیہ سے تشریف لائے ہیں تو ڈریں گے کیوں؟ یہ لوگ تو راتوں کو نہیں ڈرتے تو دن میں کیا ڈریں گے؟" پھر موسیٰ نے ان کا مدعا پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں جید علماء سے مل کر آ رہا ہوں میری کسی نہیں ہوئی۔ اباجی نے کہا پھر بھی کیا الجھن ہے؟ کہنے لگے "دفاتر مسجد کے ثبوت میں کوئی آیت درکار ہے؟" اباجی نے کہا "کیا باقی انبیاء آپ نے آیتوں سے مارے ہیں کہ عیسیٰ کی دفاتر کے لئے آیت ضروری ہے؟" موسوی صاحب ایک تو "رات کو نہ ڈرنے والے" کے خطاب سے جھینپے ہوئے تھے اب تو ایسے چپ ہوئے کہ پھر بونی تک کے نہ دیا۔ سجاد صاحب انہیں لے گئے۔ دراصل جو لوگ تحقیق کی نیت سے

تے تھے وہ تسخیر یا ستر نہیں کرتے تھے نہ کبھی میں اچھے تھے نہ حق کی تلاش مولیٰ تھی وہ تلاش میں اندر سے گنگ جاتا تھا۔

تدبیر کلچر میں عربی کی ہیئت کا ذکر سورہ قحطیات میں درج ہے۔ ہمیں عربی زبان سے وہ جیسی دلچسپی تھی اور ہے مرنے کی اسے آنر الہیہ عربی ہی میں کیا اور صوفی بشارت اس صاحب کے جیسے "عربی دانوں مالوں و صافوں" کی کلاس میں سے ہم تجا عربی آنرز میں کامیاب ہوئے تھے باقی سب رو گئے تھے مگر اس کے باوجود ہمیں عربی میں دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ بات عربی کی نہیں ایک خاص زاویہ نگاہ کی ہے احمدیہ کلچر میں عربی جاننے کی بہت اہمیت رہی ہے اور ہے۔

ہمارے ماحول میں مالوں کا احترام ایک خاص وصف ہے۔ بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو کسی بھی علم سے عالم ہوں ان کا احترام کیا جائے۔ قادیان میں یہ ربوہ میں لوگ سما کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے لئے سعادت کی بات جانتے تھے۔ علماء کی محفلوں میں بیٹھنا بچوں کے ذہن میں شہ دگی پیدا کرتا تھا۔ ہمیں بچپن ہی سے سکھایا گیا تھا کہ علماء کی محفلوں میں جانا اور بیٹھنا چاہئے۔ چنانچہ ہم لوگ بہت نوعمری ہی سے مدرسہ کی محفلوں میں جانے لگے تھے۔ حضرت مولوی شیری صاحب۔ حضرت سید سرور شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضری دینا ہمیں یاد ہے۔ اسی طرح دوست ہمارے چوپہ حضرت مولوی علامہ نبی صاحبؒ کی خدمت میں باقاعدگی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ہمیں یہ تو یاد نہیں ہم نے اس بزرگوار سے یا سیمائیں کی پابند سختوں کی یا ذہن میں مستحضر ہے اور یہی کیا کم سے ۹ ربوہ میں ہم حضرت مولوی صاحبؒ کی خدمت میں اور حضرت مولوی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ جیسے مالانہ پر تو لوگ ہر گھروں کے گھروں پر ضرور حاضر ہوتے۔ دروازے کھلے رہتے۔ ٹوٹ آتے جاتے رہتے دعا کا دربار عام جاری رہتا۔ فیضان کی باتیں ہوتی رہتیں۔ بچے بھی بیٹھے رہتے۔ بچے خانوں میں بھی آتے۔ باتیں پڑتی رہتیں۔ یہ جماعت احمدیہ کا خاص کلچر تھا۔ ہمارے پاس ہمارا ایک خاص مرتبہ تھا اور اس زمرہ میں سر علم کے عام مشاغل تھے۔

احمدیہ کلچر میں ایسا اور بات برسر اللہ کہنے کی ہے۔ دوسرے لوگ صرف رکھی شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس شکر یہ ادا کرنا بھی بہت اہم ہے۔ مندی کا ظہار کرنا ہو تو جزائے اللہ احسن الخیراء کہا جاتا ہے۔

اور سب سے پہلے اس نے میرا نام مقدم کے صدمہ میں سے۔ ہم نے دوسرے آدمیوں کے سبب  
 اور جو کہہ سکتے تھے۔ اس طرح میں مدد یافتہ عہدوں کو بھی تعزیریں کا میاں بنی تھیں۔ اسانی  
 سے اس طرح جزائرم لکھنا بھی مدیوں کی قیاسی نشانی ہے۔ مدنی احسان مددگوں میں حساب  
 دے گا۔ یہاں تک کہ ہمیں یہ کہہ جس وقت کو حتمی طور پر یہ آیت احسان ناشکریوں سے پاپا  
 چلائے۔ ان کا نتیجہ کہئے۔ ہمارے ہاں انفرادی اور اجتماعی طور پر احسان مدنی کا غبار کرنا کلچر کا حصہ  
 ہے۔ ہم نے اپنے ایک دماغوں میں اپنے ایک دوشائروں نے احسانات کا تذکرہ کیا تو یہ صاحب  
 معترض ہوئے کہ ہم نے یہ کیوں کیا؟ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم نے اپنے زرگوں سے یہی سیکھا ہے کہ  
 کوئی ذرا سا بھی احسان کرے تو اس کے احسان کا تذکرہ کرو۔ فدا سمعت ربک۔ حضرت یہ  
 لکھ کا احسان ہی تو ہے کہ وہ وہ نہیں اور دراز کے سوں میں مشاعروں یا ملاقوں کے لئے بدلتے اور  
 خدمت کرتے ہیں اس میں ہماری کون سی خوبی ہے؟ بلانے والوں کی خوبی ہی تو ہے۔ ہم خود اتنے بڑے  
 بڑے سروں کی استقامت نہیں رکھتے تھے۔ اب آپ کہتے ہیں کہ ہم ان کے حصوں کا تذکرہ تک نہ  
 کریں گے۔ اسے سامنے حضرت مولوی غلام نبی مصری کا اسوہ ہے۔ اس کا کوئی شاعر انہیں کوئی چھوڑنا  
 تجھ بھی دیتا تو اس کے لئے انہیں بھی بہت کرتے اور بار بار اس کا تذکرہ بھی کرتے کہ دوسروں کو بھی  
 اس کی تحریک ہو۔ محترم ملک عمر علی صاحب ان کے خالص شاعر تھے وہ انہیں ملانے جاتے۔ اپنے ہاں  
 مہمان رکھتے ان کی خدمتیں کرتے نہ تھکتے تھے اور چھو پھانسی بھی ان کا تذکرہ ہی بہت اور ان لگاؤ سے کیا  
 کرتے تھے اور ان کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعا مانگیں کیا کرتے تھے۔

پھر حضرت مولانا راجہ صاحب کا اسوہ بھی ہم نے دیکھا ہے۔ ان کے صاحبزادے برکات احمد راجہ  
 نے ایک بار دفتر خدمت درویشان سے درخواست کی کہ ان کی جانب سے مبلغ دس روپے ان کے والد  
 صاحب کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دئے جائیں وہ یہ رقم قدیان میں ادا کر دیں گے۔ ہم حضرت  
 میاں شیر احمد صاحب کی ہدایت پر دس روپے کی وہ رقم لے کر خود حضرت مولانا جی صاحب کی خدمت  
 میں حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا نے وہ دس روپے لے کر اپنے بیٹے کو اتنی دعا مانگیں دیں تھیں کہ میں ان  
 کہ یہ بیان کروں۔ آپ سے اسی وقت ہاتھ مل کر دعا کی اور ہمیں بھی اس دعا میں شامل کر دیا۔ تھے







ہاں۔۔۔ کل بکس آپ کے دشمنوں کے ساتھ کوئی اونٹ بیچ سکتی تو تم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ  
 اتنی بے مروتی کیا اس کے لیے ہے۔ دوسرے دیکھنا بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم نے یہ بات تو نہیں  
 کہ یہ ایک وقت ہے کہ آپ کا مکان بھی تیسرا مکان ہے دوسرے ملک تو ہمہ تن تکلف جاسکتے ہیں۔ بہت  
 جلد ہم نے نہیں اسدی معاشرہ میں ہمارے کے حقوق کا تبادلا فرماتے تھے یہ تو صرف فرشتوں  
 کے معاشرے میں ہو سکتا ہے۔ احمدیہ معاشرہ کوئی فرشتوں کا معاشرہ تو نہیں پھر بھی ہمارے ہاں ہمسایوں  
 کے حقوق کا لحاظ اب بھی موجود ہے۔ ضرورت میں ہمسایوں کی خبر گیری یا ریزی میں ہاتھ پیر کی خدمت  
 اب بھی ہمارے ہاں اسی خوش دلی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

خدمتِ خلق کا لفظ بھی ہمارے ہاں ہی سے شروع ہوا۔ کسی مصیبت کا وقت سو تو خدا انصار یا احضار  
 خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ قادیان کا تو ہمیں یاد نہیں رہوہ میں سیلاب آیا تو رڈ راکس اور راحہ پانی  
 میں گھر جاتا۔ خدام خدمت کے لئے میدان میں اتر پڑتے اور اپنی جانوں کی پروا کئے بغیر خدمت پر  
 مستعد رہتے۔ ہم نے کھڑکن گاؤں تک بھی خدام کو کشتیوں میں جاتے دروگوں کی جانیں بچتے دیکھا  
 ہے۔ انہوں نے وہاں پہنچنا بھی انہیں خدا کو سزاوار ہا جو غدیری راتوں میں بھی سیلاب کے پانی میں  
 انہیں سینے دور دور کے بھوکے پیاسے محصور شدہ لوگوں تک پہنچتے تھے اور انہیں کھانا پہنچاتے تھے۔  
 یہاں سے لے کر خدمت کی سب سے پہلی رہتے ہیں۔ تریسوں میں بسوں کے اڈہ پر اور شیٹن پر پراسوں کو  
 پانی لانے کا کام بھی جاری رہتا تھا تاکہ ایک ایک آدمی کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھٹی اس نے آنکھ بھی  
 کر پانی والے ڈرام میں رہا کی پڑیا مادی۔ وہ تو غیر مذہبی کہ کسی دیکھنے والے نے، کچھ یہ اور وہ پانی ضائع  
 کر دیا یہ اور نہ ایک یا کھڑا کھڑا ہو جاتا۔ اس کے بعد بسوں کے اڈہ پر پانی پلانے کا کام روک دیا گیا  
 پانی پینے والوں کو کھلی آزادی ہے مگر رہوہ والے پانی نہیں پیتے۔ حلوگ پیتے ہیں وہ رہوہ کے نہیں باہر سے  
 آ رہا۔ یہ کام کرتے ہیں۔

خدمتِ حق کا ایک انداز احمدیہ کلچر سے مختص ہے اسے وقار عمل کہتے ہیں۔ معنی رضا کارانہ طور سے سڑکوں  
 کلیں محلوں کی صفائی اور سڑکوں کی مرمت۔ خدام احضار سب ہی وقار عمل میں شریک ہوتے ہیں  
 قادیان میں ہم نے ایک بار حضرت صاحب کو بھی وقار عمل میں شریک ہوتے اور اپنے ہاتھ سے پھوڑ



اس نام سے مد کہتے تھے۔ لہذا یہ شریعت نوشی تو بہتر نہ کر چکے ہیں تاہم وہ بدادوں سے مد نہ کرنا چاہیے۔  
 خدمت کے شعبے میں بھی بعض عہدید رہا کر رہا کرتے ہیں مگر وہ اس نام کے ساتھ برائی نہیں  
 مرتب اور جماعتی عہدید ہونے کا احترام نہیں ہے۔ جماعت کی یہ نہیں جماعت کے فعال ہونے کی  
 آغیز دہیں۔ بچوں تک کی تنظیم اطفال الجمعیہ موجود ہے کیوں نہ تنظیم ہرات موجود ہے۔ ان  
 تنظیموں کے ساتھ جو ذہیرہ الفاظ ہے وہ جماعت کے ماحول میں آزادانہ استعمال ہوتا ہے اور سمجھا جاتا  
 ہے۔ یہ الفاظ کارے بکھرے خاص ہیں۔

احمدیہ کچھ کا ایک حصہ پردہ سے متعلق ہے۔ ہمارے ہاں فحش سرکار کا ماحول رونق ہے۔ عورتیں برقعہ پہنتی ہیں کیوں ہزاروں میں بے پردہ خواتین نظر نہیں آتیں۔ برقعہ پہننے کا جتن رواج ربوہ میں ہے تاہم پاکستان کے کسی در شہر میں نہیں۔ ہماری بچیوں کا بچوں یونیورسٹیوں میں پڑھنے بھی جاتی ہیں تو پردہ کی حمایت ٹھوڑا رکھتی ہیں۔ ہم گورنمنٹ کاٹ فیصل آباد میں تھے۔ ربوہ سے تین بچیاں ہمارے ساتھ ہمارے ہی کانا میں پڑھنے کے لئے جاتی تھیں۔ تمام اساتذہ جن میں شدترین مخالف اساتذہ بھی شامل تھے۔ سات دن تعریف کے بغیر نہیں رو سکتے تھے کہ اصل پردہ کی حمایت تو ربوہ سے آنے والی بچیاں ٹھوڑا رکھتی ہیں۔ ان تین بچیوں میں کی ایک بچی ایک بار اپنی بے پردہ کلاس فیور کے ساتھ ایک سیمینار میں آ گئی۔ ہم نے جب ایک اجنبی بچی کو اپنے سیمینار میں موجود پایا تو باقی بچیوں سے اس اجنبی بچی کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے اپنی تعریف "وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئیں۔ وہ بچی کہنے لگی "سر آپ نے پہنا نہیں" میں فحش ماحول اور رات آپ کے ساتھ موز میں ربوہ سے آتی ہوں آج میں اپنی داند کی اجازت سے پہلی بار آپ کے سامنے آئی ہوں" انی رات پردہ بھی کچھ کا حصہ بن گیا ہے۔ احمدیہ کچھ کی یہ پہچان ایک صدی میں جا رہی ہے، چار برس میں نہیں بنی۔ اتنا ہی کیا کم ہے کہ جماعت احمدیہ نے سو سال کے اندر اپنی علیحدہ ثقافت بنی۔

مکتبہ احمدیت حمید سے کلچر کی اتنی باتیں بین کرویں مگر ایک ضروری بات نظر انداز کر گئے۔ وہ پہلو شادی بیاہ کا پہلو ہے۔ تارے ہار نکال کا اعلان عین شادی کے وقت بھی کیا جاتا ہے اور پہلے بھی۔ عام طور سے نکاح کا اعلان مسجد میں کیا جاتا ہے۔ حق مہر عموماً دو لہا کی چھ مہینے کی آمدنی کے برابر مقرر کیا جاتا

۔۔۔ تاج پادشہوں میں کسی تاج کی برابری نہ تھی۔ حصولِ حاکمانہ تاج نہیں ہے۔  
 بدلتا ہے پادشاہی و درباریہ۔ تاج بادشاہی میں مشروریت پرستیا جاتا ہے۔ یہ صاف  
 کھانے والا تاج بھی ہے۔ تاج بادشاہی پہنے نہیں تھا۔ تاج کا اعلان مسجد میں ہوتا تھا اس کے بعد  
 چھوہاڑے ہوتے۔ تاج پہنتے تھے مذاہنہ خیرطہ۔ حضرت صاحب کی بچیوں کی شادی یہاں بھی یہی  
 رواج رہا رکھی جاتی تھی۔ ہمیں اپنے گھر میں بھائی جان محمد احمد نعیم کی شادی کا یاد ہے۔ ان کے ایسے میں  
 مجھے سے چھوٹے تھے۔ تاج بھائی جان کے جو ستارہ آج امت اسلام مرحومہ یاد کرتی ہیں تو اس  
 کے چھوٹے سامان میں دوپہار برتن تھے اور پٹروں کے دو جوڑے۔ یہی احمدیہ کچھ کاروان تھا۔ ہمارے  
 ہاں جیہ کا تصور بھی بہت سادہ ہے۔ ماں باپ نیا استطاعت کے مطابق بیٹی کو سادہ سامان اور اوجہ  
 حوزے پٹروں کے دیتے تھے جیہ کی نمائش کاروان تھا نداب ہے۔ ولیمہ کی دعوت تو سنت ہے اس میں  
 بھی حتیٰ اوسع سادگی ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ ہم نے ایک ولیمہ ایب بھی دیکھا جس میں لوگ اپنے اپنے  
 گھروں سے کھانا لائے تھے اور وہاں گھر ایک جگہ بیٹھ کر کھائے کھا لیا تھا۔ ایب تو بہت مرتبہ دیکھ کر نظر  
 وں نے بدعت کی طرف سے ایسے کی دعوت کر دی۔ دعوتوں میں حضرت صاحب کے ارشاد کے  
 مطابق یک کھانا ہوتا تھا حد ہوئی تو ایک کھانا بیٹھے کا اور بس۔  
 بناقت میں مشہور طریق ایک کھانے کا طریق بھی رہا۔ یہ دراصل تحریک جدید کے مطالبات میں سے  
 ایک مطالبہ تھا۔ حضرت صاحب نے بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لئے تحریک جدید کا اجر دیا تو جماعت  
 سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ کھانے میں پخت کرے اور گھروں میں صرف ایک کھانا پکایا جائے۔ ایک بار  
 باب مہمان جو انگریزوں کے دور میں بہت مشہور سیاست دان اور حکومت کے بڑے عہدیدار تھے (مر  
 فصل حسین) کا بیان حضرت صاحب سے ملاقات کے سنے آئے۔ کھانے کے لئے میز پر گئے تو کھانے  
 کی میز پر چار قسم کے کھانے تھے۔ آپ نے کس اکھیوں سے دیکھا درچہ پرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ  
 آئی۔ حضرت صاحب فوراً سمجھ گئے کہ ان کا خیال ہے میں جماعت و اہل کو تو یک کھانے کی تاکید کرنا  
 رہتا ہوں مگر خود میرے دستر خواں پر ایک سے زیادہ کھانے موجود ہیں۔ حضرت صاحب نے ان سے کہا  
 جب مجھے آپ کے تشریف لانے کی اطلاع ہوئی تو میں نے اپنی چاروں بیویوں کے ہاں کہلا بھیجا کہ جو

لکھنا پکا سودہ بھی ادا کیونکہ مہمان آگئے ہیں۔ چنانچہ یہ بوجھ رکھا۔ آگے سے تیس یہ سنا ہے جس میں ورنہ ہر گھر میں ایک کھانا پکا دیا جاتا ہے۔ اس وقت تو شاہی یہ دل تھی۔ شاہی یہ سنا ہے جس میں بھی وہی راہی جو رہتی تھی۔ جماعت کا ایک کھانے کا طریق یہاں بھی اگوتھ۔ یہ نہ لکھنے والے کے خلاف تاہم کارروائی ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں رشتہ کی طرح بھی بہت سا دیا ہے۔ بڑا تھی۔ اس کے ساتھ کوئی بزرگ بیٹھ گئے۔ نکاح پڑھا تو ان کا پڑھا اور سلطان ہو چکا ہے تو صرف رشتہ کی تریب ہوں۔ اس تقریب کا بھی ایک اگانہ خاطر یہ تھا آ رہا ہے اور مولانا جہد ایسا ہی ہوتا ہے۔ عادات رہی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعا یہ نظم "یہ روز کر مبارک بھن من پرانی" کسی نے خوش خالی سے پڑھ دی یا کسی نے اس تقریب کے سے کوئی خاص نظم لکھی ہے تو وہ پڑھائی گئی اس کے بعد دعا ہوئی اور لڑکے والے دہن کو لے کر رخصت ہوئے۔ سادہ ترین رخصتی ہو رہی یہ داشت کے مطابق ہمارے رشتہ میں ان جو یہ مرحوم کی تھی۔ ادھر مولانا جہد صاحب نے مسجد میں نکاح کا اعلان فرمایا ادھر تنویر صاحب نے اس کے گھر بیٹھے۔ دروازہ کھلکھلایا کہ چنے نکاح تو ہو گیا۔ وہ بی بی برقعہ پہن کر ساتھ ہوئیں۔ ہم ان کی دوست نہ ہو یہ بات تہاتے میں تو وہ جانتی نہیں اور ان سے پوچھنے میں شرماتی ہے۔

اس تمام باتوں سے ماہ دو جماعت اور یہ سب کے علیحدہ کا کور خیضہ وقت کی ذات ہے۔ خلافت سے جماعت اور یہ ہر اس حلق ہے۔ ان حلقوں میں سے جماعت کی مرکزیت قائم ہے۔ حضرت صلیب علیہ السلام کے اصحاب جماعت میں اختلاف ہے۔ پانچویں جو خلافت کے حق میں نہیں تھے جماعت سے علیحدہ ہو کر رہ گئے۔ اور اس ایک صدی میں یہاں شخص کھڑے تھے۔ جماعت کے ایک بڑے حصے خلافت کے ساتھ ہر حلق قائم رہا اور اس حلق نے جماعت کو ان دونوں رشتہ جو گئی ترقی سے ہم کنار کیا۔

جماعت ہر پہ میں خلافت کا تصور یا کی دوسری باتوں سے باطل ٹھنک ہے۔ یہ کوئی سیاسی رہنمائی یا جماعت کا مسند نہیں نہ ہی کوئی مذہبی شین کا مسند ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پہلے خلیفہ حضرت حکیم موعود علیہ السلام سے ہوتا۔ پچاس کی دہائی میں بھی بعض منافقین نے جماعت میں فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کے نہیں خواب و خمار کیا۔ جماعت کے خلیفہ کا براہ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے۔ یہ وہی حلقہ ہے جس نے اپنی آنکھوں سے یہ مغرورہ دیکھا ہے۔ حضرت خلیفہ علیہ السلام کی اشائی کے



میں نے یہ عرض کیا کہ میں نے اپنے والدین سے بڑی بات سنی ہے۔  
 حضرت مرزا صاحب سے کہا کہ یہ بات سنی ہے کہ یہ شخصیت کی بدولت میں بدل گئی ہوں گے تو  
 ہونے کا اثر بھی پڑے۔ جس روز وہ مدت کے مقدم پر نہ کر سکا۔ ان کی شخصیت میں بدل گئی ہوں گے تو  
 پر نے مرزا صاحب کی جگہ کی تہ مرزا صاحب نے کہا کہ یہ شخصیت کی بدولت میں بدل گئی ہوں گے تو  
 نے پہلی بار ان کی بیعت کی تو ان کی آواز میں ہونے محسوس ہوئی۔ ایسے وقت میں کہ ان کی زبان سے کوئی اور  
 نہ رہا ہے۔ یہاں خطبہ دینے کے لئے آئے تو ساری جماعت حیران رہ گئی کہ یہ وہی مرزا صاحب ہیں  
 جن کی تقریر میں روئی نہیں تھی؟ خدا کی بات یہ ہے کہ ان کی جلسہ ساری تقریروں کے دوران ہم لوگ  
 بہانے بہانے اٹھ کر چلے جایا کرتے تھے۔ مگر خلیفہ کیا بنے اللہ تعالیٰ نے ان کی باتوں میں تاثیر اور  
 تقریروں میں روئی پیدا کر دی وہی تقریریں معرفت کا بہانہ اور یا بن گئیں۔ یہ تو ہماری اپنی بات ہے کہ  
 امدی ہیں۔ حضرت صاحب کے پرانے دوست درجناب یونیورسٹی کے وکس چانسلر پروفیسر حمید احمد  
 خاں جو امدیت کے مشہور معتمد فخر علی حاکم کے چھوٹے بھائی تھے۔ ربہ تشریف آئے۔ حضرت خلیفہ  
 مسیحی اشدت سے مذاقات کے بعد واپس جاتے ہوئے مجھے کہنے لگے "پروزی یہ وہ پرانے مرزا صاحب تو  
 نہیں ہیں" میں نے کہا "درست فرمایا ہمارا بھی یہی خیال ہے"۔ یہ گواہی کسی احمدی کی نہیں ایک ایسے  
 شخص کی ہے جو دونوں یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور سینیٹ میں ان کا رفیق کار رہا۔ انہیں بھی یہی محسوس ہوا کہ  
 مرزا صاحب احمد کی شخصیت میں انقلاب آ گیا ہے۔

جماعت احمدیہ اپنے خلیفہ کو اپنا روحانی پیشوا مانتی ہے اور اس کے مرتبے کے مطابق ان کا احترام محفوظ رکھتی  
 ہے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو خفیہ وقت کے سامنے لگے ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بار تنویر صاحب مرحوم کو  
 دیکھا کہ شلو قمیض اچکن پہنے اور سر پر ٹوپی اور اچھے خوش خوش چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے کہا خیر ہاں  
 آپ اس بات میں کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہنے لگے "حضرت صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ یاد ان کے  
 سامنے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ حالانکہ ہم کالج میں آتے تو ان کے ساتھ سواونچ کچ کر لیتے تھے۔ کہنے  
 لگے ایک شعر ہو گیا ہے "سو" مست میں جرباد و چندار میں۔ ٹکڑاٹاٹاٹا ہیں ترے دربار میں"۔ یہ رعب  
 خلافت اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ حضرت خلیفہ رابع کا ور ہمارا عمروں کا کوئی زیادہ عادت بھی نہیں تھا کچھ



مدرسہ خیرہ کی روایت اور تہذیب میں تاریخ اسلام کے کام میں۔ ف۔ س۔ اور س۔  
 تکریم، شہزادہ رسانی موسیٰ قیو تھے جس کی اسیت تھی اس کے مدد و موقع، باقاعدہ وقت  
 مختلف مہمات کے لئے چندوں کی تحریک کرتے رہتے ہیں اور جماعت ان پر بھی ہیکہ کھتی رہتی ہے  
 جماعت نے ان چھوٹے چھوٹے چندوں سے بڑا بڑا کام کر کے ہیں۔

مدرسہ پہلے دور کی ایک نظم نفس نہ پیش بدن میں تھی جس میں اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ جو کام  
 دیکھ کے چندوں سے نہ ہو سکے، وہ کام کر لئے ہم نے فقیر چندوں سے۔ حضرت صاحب کو ساری  
 یہ ترتیب ایک کچھ نہیں بھائی۔ حضرت صاحب نے بڑی محبت سے سرزنش فرمائی کہ چندوں کے سے فقیر  
 کاغذ بھی ستم نہیں کرنا چاہئے۔ خلیفہ کو جماعت کے چندوں کی اتنی غیرت ہے جماعت ہر تحریک پر  
 ہیکہ کھتی ہے تو خلیفہ کو ان کے چندوں کی غیرت کیوں نہ ہو؟ ہم نے اس نظر میں سے یہ مصرعہ ہی نکال  
 دیا۔

احمد یہ کچھ کہ نمایاں ترین پہلو قربانی کا جذبہ ہے۔ مردہوں یا عورتیں۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ سب ہی  
 اپنے اپنے میدان میں مالی قربانی کے لئے ہر خط تیار رہتے ہیں۔ یہی چیز دوسروں کو سمجھ نہیں آتی۔ اب یہ  
 صاحب زور پکڑ رہا ہے کہ احمدیوں کے فقے کا سد باب کرنے کے لئے مسلمان حکومتیں مل کر یک ٹی وی  
 سٹیشن قائم کریں۔ بھی کریں۔ ہمیں تو حوشی ہوگی کہ اللہ رسول کا نام بلند ہوگا مگر اس بات کا خدشہ بھی ہے  
 کہ اس ملی کے محلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ ہر ماح کی خواہش ہوگی کہ ہر وقت اسی کے ”ارشادات“ نشر  
 ہوتے رہیں دوسروں کے ارشادات کیوں نشر ہوں؟ ایبائی وی بن جائے گا تو ایک طرف تماشا ہوگا۔ جس  
 عمارت کی بنیاد ہی غیرت پر ستوار ہوگی وہ بھلا کا ہے کو استوار ہوگی ”حشید اول چوں نہد معمار کج۔“ تاثر  
 سے رد و بوار کج۔“

جماعت کے وصیت کے نظام کے بارہ میں ایک منافق نے ایک بار پوچھی تھی کہ جماعت اب تک تیس بار  
 سے زیادہ موسیٰ پیدا نہیں کر سکی۔ ہم نے کہا درست۔ تم کوئی ایک ہی ایسا نظام ہمیں تو دوس میں ایک  
 موسیٰ موجود ہو جس نے مستلاً اپنے وسائل کو ایسی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہو۔ وہ صاحب پاسا  
 منہ لے کر رہ گئے۔

## میر احمد

حضرت مرزا خاتم احمد قادیانی بانی دہلیہ مدنیہ کے جد امجد مرزا ابوبکر ایک صاحب زمین ایشیا کے ایک معزز بریلی شریف کی گوتھوں خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور سب شہر (سرقند) کے حاکم تھے تیور نے نہیں جاوے ہوئے پر مجبور کیا تو وہ مغل شہنشاہ فیضیہ مدینہ کے وقت میں ۵۳۰ کے قریب ہجرت کر کے اپنے اہل خانہ اور کوئی ۱۰ سو کے قریب سیاحین کے ساتھ ہندوستان میں وارد ہوئے اور پنجاب کے اس علاقہ میں آباد ہوئے جسے بعد میں برطانوی حکمرانوں نے سالہاری کے تحت گورد سپور کے ضلع کا نام دیا گیا اور ایک وسیع قبضہ زمین پر اپنی ملکیت قائم کر کے ایک بستی آباد کی جسے اسلام پور کے نام سے موسوم کیا اور دستور زمانہ کے مطابق اس بستی کے گرد کروڑ ایک بیس فٹ اونچی اور انچارہ فٹ چوڑی فصیل بھی تعمیر کی جس کے آثار انیسویں صدی کے اوائل تک موجود تھے۔ اسٹیٹس کے ایک معزز شہری خاندان کا فرد اور دی مہر دی ہونے کی بنا پر دہلی کے حکمران مغلوں کی جانب سے مرزا اداوی یک کو عدالت کے فرائض سپرد کیے گئے۔ مدینہ اچان کی بستی عرصہ دراز تک اسلام پور قاضی کے نام سے جانی جاتی رہی۔ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ نام منتشر ہوتے ہوئے صرف قاضیوں کے ہاں اور دہلیوں کے ہاں اس کا معراج باقی رہا ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں اس خاندان کو سببوں دیات پر کمانہ تصرف حاصل رہا۔ مرزا دکنی یک کی نوید پشت میں مرزا فیض محمد تھے جنہیں سلطنت مغلیہ کی جانب سے ہفت ہزاری کا عزا اور عید الدار کا خطاب حاصل تھا۔ اس وقت اس علاقہ کی سالانہ آمدنی آٹھ لاکھ روپے تھی۔ مرزا فیض محمد یہاں کے صاحبزادے مرزا گل محمد خاندان سے سربراہ بنے۔ یہ بہت نیک دل اور پارہ سار برگ تھے اور اپنی سلطنت مغلیہ سے نہایت قربانی تھے۔ ان کی علم و ادب کا یہ عالم تھا کہ ایک سو کے قریب مکتبے اور خانقاہ قرآن سے وابستہ تھے جنہیں ان کے دربار سے وظیفے عطا کئے جاتے تھے اور ان کے مال میں قابل التہ و قابل رسول کا چہرہ بتاتھا۔ ان کے زمین اور متعلقین میں سے اولیٰ یہ تھے جو تارک نمبر ہوتے کہ ان کے ہاں چلک مینے والی عمر تیس تک شمار بخوبی کی یہ بد اور تہجد گزار تھے۔ مرزا گل محمد ۱۸۵۰ میں فوت ہوئے۔ دہلی دہلی احمد کے ۱۸۵۰ تھے۔

محمد علی شاہ کے سر پر ہوئے۔ اس وقت ملتان میں مسیحیوں نے اس بستی پر قبضہ کر لیا اور قادیان کے رئیسوں کی  
ساتھ بدھ رہی تھی حتیٰ کہ ۱۸۰۲ء میں سکھوں نے اس بستی پر قبضہ کر لیا اور قادیان کے رئیسوں کی  
باید اس کی ناکوں اور سب سے زیادہ تعلق رکھنے والے اور ان کی قیدی بنائے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کو رہائی ملی تو  
یہ وہ بھرت سے کہ دریا کے بیابان کے یہ ریاست پروردہ میں واقع تھا۔ ان کی جگہ میں یہ گزین  
۲۰۰۰ اور کوئی پندرہ سال کا عرصہ ملا مہاجر میں بسر کیا۔

۱۸۱۳ء میں مرزا علی محمد کا انتقال مہاجر میں ہوا۔ ان کے دو حزم صاحب مرزا غلام  
مرتن کی خوش گوئی نہایت حوصلہ شکن حالات کے باوجود قادیان لائے اور انہیں اپنے بانی قبرستان میں  
پیدا کیا انہی مرزا غلام مرتضیٰ نے ان کی جانشینی کی مسند سنبھالی۔ جب مہاجر جو نجیت سنگھ اپنی  
سلطنت کی وحدت کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مرزا غلام مرتضیٰ کو واپس قادیان آنے کی اجازت  
ملی۔ اس حسن کے اعتراف میں مرزا غلام مرتضیٰ اس کی فوج میں شامل ہو گئے اور کئی محروکیوں میں اس  
کے شانہ شاندہ رہے۔ مہاراجہ نے ان کی شجاعت کے صلہ میں ان کی خاندان جاگیر میں سے پانچ  
دیہات انہیں دیا کر دیے۔

۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے ساتھ ہی سکھ سلطنت بکھر گئی۔ انگریزوں نے اس موقع  
سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ امی جی ہونے کے بعد انگریزوں نے مرزا غلام مرتضیٰ  
صاحب کی قادیان واداد کے پانچ گاؤں پر ملکیت تو تسلیم کر لی مگر باقی کے پانچ گاؤں انہیں نہیں  
دلائے۔ اس شک و شبہ کے لئے انہیں سات سو روپے سالانہ کا گزارہ دیا گیا۔ انھیں بانی و سلسلہ  
حمد کی پیدائش یعنی ۳ فروری ۱۸۳۵ء تک ماضی کی ونیدی شان و شوکت اور خاندان کی رئیسانہ شان  
اپنے انتظام کو پہنچ چکی تھی۔ مرزا صاحب کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل خاندان کی گذر بسر کٹھن سے  
ہونے لگی تھی مگر مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے کل جائیداد کی حسرت بازیافت کے خواب شرمندہ و تھیر  
ہوئے اور انگریزی عمل داری کے خاندان کی وقت محض گزارہ دار کی رہ گئی۔ مرزا غلام مرتضیٰ جو مگر  
گوشت ہزل کے دربار میں بزمہ و سری شیناں بجائے جاتے تھے آخر پناہ پناہ کی عمر پر کراچی آباد  
جائیداد سے تھروہی کا داغ سینے پر لئے جو ۱۸۷۶ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے مطابق پڑی تھی

کراد مسجد میں جواب مسجد اقصیٰ کے نام سے موسوم سے آئے۔ اس کے قتل کے بعد دستور میں اس کے مطابق پانی و سلسلہ کے بڑے بھائی مرزا احمد قادر خاندان کے رئیس بنائے گئے۔ یہ نظر عام مرزا احمد بھائی کے دست نگر ہو گئے مگر ان کی بعد کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ نے ضرورتاً کل اور قناعت و صبر و صبر کا رامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بعد کی زندگی میں حب ان کے ہاتھ پر خدا کا قلم کر دیا۔ سلسلہ سلسلہ عالیہ بن گیا تو آپ نے ایک عربی شعر میں یہ بات کہی کہ "لنظاٹ السماوات کن کلسیٰ۔ فصرث الیوم مطعام الابالی"۔ کہ ایک وقت تھا کہ میری نذر سردستہ خون کے بچے ہوئے نکڑوں پر تھی یہ عالم ہے کہ خاندانوں کے خاندان میرے دستہ خون سے تھکتے کرتے ہیں۔ مرزا غلام قادر صاحب کو سلسلہ عالیہ میں شامل ہونے کی توفیق ملی۔ ان کی اپنی کوئی اولاد تھی اس لئے انہوں نے مرزا غلام احمد صاحب کے بڑے بیٹے مرزا سلطان احمد کو اپنا متبھی کر لیا تھا اور اسی ان کی وصیت پر ان کی جائیداد کے دروہاتی خاندان فی سربراہی کے وارث بنے۔

مرزا غلام احمد مختار چوہان غازی بنی کے بطن مبارک سے ۱۳ فروری ۱۸۳۵ء کو بروز جمعہ طلوع فجر کے وقت متولد ہوئے۔ ان کے ساتھ تو م پیدا ہونے والی لڑکی تھی جو بچپن ہی میں فوت ہو گئی۔ مرزا صاحب پانچ من مہاشی تھے جن میں مرزا صاحب اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ آپ مدینہ منورہ کو شہر نشین تھے۔ بچپن ہی سے لہو و لعب سے انہیں پرہیز تھا۔ ان کی تعلیم رسم زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہوئی جہاں انہیں تعلیم دینے کے لئے ایک فارسی دان معلم کو ملازم رکھا گیا۔ اس استاد نے انہیں قرآن شریف و فارسی کی بعض متداول کتابیں پڑھائیں۔ دس برس کے ہوئے تو ایک عربی درس استاد نے ان پر مقرر کئے گئے انہوں نے عربی زبان کے سیکھنے کے لئے انہیں صرف و نحو کے بعض اسباق سکھائے۔ اس بلوغ تک پہنچے تو یک اور استاد ان کے لئے ملازم رکھے گئے جن کا کام نہیں منطق حکمت اور موسوم و جدی تعلیم دینا تھا۔ آپ نے اپنے والد سے جو خود ایک طبیب حاذق تھے حکمت کی تعلیم بھی سکھائی۔ دستور زمانہ کے مطابق ان کا کتب گھر پر ہی قائم کیا گیا تھا مگر قادیان کے دیگر بچے بھی اس کتب سے فیض یاب ہونے کے لئے اس کتب میں آتے تھے۔ آپ اپنی طبیعت کے مطابق دوسرے بچوں سے ہاتھ بٹکاتے نہیں ہوتے تھے ہاں اعتداس کے ساتھ ورزشی کھیلوں و تفریح میں ضرور شریک



وہ تھے۔ چہنچہن میں آپ نے یہ سیکھا۔ حواس میں کی مشق بھی محمد بن ابی ہریرہؓ کی پسند وورش  
 ہیں۔ چہنچہن تھا اور یہ حالت مدت اور کثرت رہی۔ آپ غاسی تیز قدمی سے چلتے تھے۔ ان کے ستونوں  
 مجبوری کے تحت قادیان سے بلالہ آباد چلا آئے تو آپ بھی تکمیل تعمیر کی خاطر بنا۔ میں متیم ہو گئے جہاں ان کے  
 آبائی مکانات میں سے ایک بڑی حویلی میں کاتب بنا دیا گیا۔ اس کتب میں ان کے ہمراہ عت مولوی  
 محمد حسین بنووی اور مال بھیج میں تھے۔ مولوی محمد حسین بنووی نے مراد صاحب کے دعویٰ و مصیحت سے قبل  
 ملک ان کے ساتھ دوست نہ تھے، ستر رکھ۔ براہین احمدیہ کی تالیف کے بعد اس پر شائد رولو بھی مولوی  
 محمد حسین بنووی ہی نے لکھا بعد کو مولوی محمد حسین بنووی نے محنت یہ کمر باندھی اور اس میں بھی کماں کو  
 پہنچے مگر مراد صاحب کا بال بیکانہ کر سکے۔

دو تہل جوانی ہی میں آپ کی شادی خاندان کی ایک بڑی حرمت بلی سے کردی گئی جو رشتہ میں ان کے  
 ماموں کی بیٹی تھیں اس شادی سے مراد صاحب کے ۱۰ بیٹے ہوئے مرزا سلطان احمد (۱۸۵۳) اور مرزا  
 افضل احمد (۱۸۵۵)۔ ان کی شادی میں کوئی الایقہ رسم ہوئی نہ کوئی روایتی رسوم و عہدہ دیکھنے میں آیا  
 حالانکہ ان کے بڑے بھائی کی شادی پر مراد صاحب نشاۃ کے ۲۲ ہفتے منع ہوئے تھے۔ اس کی شادی میں  
 تہنائی سادگی و اسلامی روایات ملحوظ رکھی گئیں اور کسی قسم کی کوئی خلاف شریعت بدعت نہ ہوئی۔ دونوں  
 بھائیوں کی شادی کی تقریبات ہی دونوں بھائیوں کی صباغ کے مساوت کو واضح کرنے کو کافی ہیں۔  
 مراد صاحب کی شادی بھی نہیں ان کے عہدہ کی مشغل سے غافل نہ کر سکی ان کی خلوت پسندی قائم رہی  
 ۔ تہذیب و تہذیب و تہذیب میں مشغول رہتے۔ ان کے والد محترم انہیں ”سیر“ بھی کہتے تھے  
 رہنے والے کہہ کرتے تھے۔ انہیں بھی طور سے ان کے مستقل کی فکر تھی کہ آبائی جائیداد تو رہی نہیں یہ شخص جو  
 کمانے دھانے کی فکر نہیں کرتا بچوں کو روٹی کیسے کما کر کھائے گا؟ اسی سلسلہ میں ایک بار والد صاحب نے  
 ملازمت پر اصرار فرمایا تو آپ نے بڑے ادب سے جواب دیا کہ مجھے جس کا ملزم ہونا تھا وہ چکا ہوا  
 وہ زمانہ اسلام اور حامیان اسلام کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا۔ انگریزی عملہ دہری کے مستحکم ہوتے ہی  
 عیسائیوں کی بین آئی تھی اور وہ اسلام پر پے در پے اعتراضات کرتے چلے جاتے تھے اور بانی و سام کی  
 ذات پر بے جا اور بغاوت اعتراضات کی بھرمار تھی۔ مراد صاحب کے دل میں اسلام اور بانی و سام کی وہ محبت

موجود ان تھی کہ جو اپنے قلوب کے مطابق سترہ بخارہ برس کی عمری سے اسی سال کی تاہیں پڑھے اور اس  
 سے انہوں کا خوب سوچنے سے تھے جو سراسر ان کی اصلاح کی بات یہ ہے جانتے تھے۔ مدام کی  
 طاقت اور انہوں کی مصطفیٰ کے تحت وہ انہیں اس درجہ احسان تھا کہ ان کی حقارتیں بہت کرب اور  
 بے چینی کی حالت میں گزرتی تھیں۔ مرزا صاحب نے ان اعتراضات کا جواب قرآن حکیم سے چاہا اور  
 یہ طرغ کرتا کہ الہی کا معاملہ شرعاً کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا خود ان کا منہ  
 ہے کہ "لوگ کہتے ہیں کہ مائت نہیں سوتا قبول۔ میں تو نہ کچھ بھی ہو رہا ہوں اور نہ میں بار" قرآن  
 حکیم کے معاملہ اور اس کے مقابلہ پر غور کرنے میں آپ کو اس درجہ استغراق تھا کہ اس زمانہ کے دیکھنے  
 والے گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے جب بھی انہیں دیکھا قرآن پڑھتے ہی دیکھا ان کے والد صاحب کو  
 اس کی صحت اور ملازمت کی فکر کھائے جاتی تھی مگر انہیں عشق رسول اور عشق مدام کی وضاحتیں سوتی تھی جو  
 عمر بھر ان کے ساتھ رہی۔ مگر ایک شاخ نہال غم جسے غم نہیں سہی رہی۔ آپ دوسرے صوفیا کی طرح  
 اور ادا و نہاد نہیں کرتے تھے مگر اور دشریف کثرت سے پڑھتے تھے۔ نماز روزہ اور دیگر رکاب دین کی  
 بجا آری میں مانتا ہوں کہ تھی۔ تہجد ان کا معمول ہی نہیں گویا ان کی زندگی تھی اور اس میں التزام اور باتعد کی  
 رو رکھتے تھے۔

اس کے والد مرزا خانہ مر قسبی اپنے زمانہ کے بعض روس کی طرح اپنے زمانہ کی عمریزی حد توں میں  
 مقدمات میں ابھرتے رہتے تھے اور اپنے بیٹے کو بھی اسی کام میں مصروف رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ  
 مرزا صاحب کو اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں اکثر مقدمات کے سلسلہ میں باہر کی عدالتوں جانا پڑتا مگر آپ  
 کا معمول تھا کہ باپ کی طاعت تو ضرور کرتے مگر معاملات مقدمہ میں کوئی دروغ یا نادرست بات روانہ  
 نہ کرتے۔ کئی بار یہ ہوا کہ ان کے مخالفین نے اپنے موقف کی تصدیق کے لئے خود انہیں کی گواہی رکھوا دی  
 اور مرزا صاحب نے رات کی خاطر اپنے باپ کے موقف کے خلاف گواہی دے دی۔ ایک ایسے ہی  
 مقدمہ میں جس میں ان کی گواہی کی وجہ سے فیصلہ ان کے والد کے خلاف ہو گیا تھا والد صاحب نے  
 نا افسانہ ہو کر انہیں گھر سے بلندہ کر دیا اور آپ دو ہفتہ تک بنا۔ میں قیام فرما رہے۔ ان مقدمات کے سلسلہ  
 میں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ باہر مجبوری و طاعت پر بزرگوار رہتے تو جانتے تھے مگر اپنا سارا وقت ذکر

ان باتوں میں نہ رکتے تھے۔ یہاں پر خاصہ اور رعایت میں نہ سوناں کی صحبت ہی سے خلوت تھا۔  
 یہ مقدمہ برس مدت سے آ رہا تھا۔ یہ وقت میں ان صاحب آپ نے میں مسدوف تھے اور مختلف  
 ان کے جیسے ۷۰ سال سے کا کدہ تھا، یہ ہاتھ میں لے کر حق میں ہنسی جاری کر رہے تھے۔  
 "تھوڑی عبادت میں مصروفیت نہیں پسند و رفیعہ دوری بات میں وقت ضائع کرے کی بات نہیں  
 ناپسند تھی اور جب تک اپنے والد برای کے رشتہ کی قیاس میں مقدمات نیوں میں ہوتا، رستہ اپنے اس عمل  
 پر ثابت قدم رہے۔

جی ہمت اور خلوت نری کو ان کی صحبت پر اثر انداز ہوا کی تھ چنانچہ تیس برس کی عمر میں ہی سر کے بال سفید  
 ہونے لگے۔ اور ن سر اور نیا بیٹس کے مرض حق ہو گئے مگر ان کے مشاغل دینی میں کوئی فرق نہ آیا۔  
 خوراک کے معاملہ میں بھی آپ بے پروا تھے جو جیسا ط کھا لیا۔ بھنے ہوئے چنوں پر اکتفا کرتا تو  
 معمولات میں شام تھا۔

۱۸۶۲ء یا ۱۸۶۵ء میں آپ کو مفتون شباب کے۔ مر میں سرستان مدینہ منورہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے  
 مبارک کی زیارت کا شرف خواب میں حاصل ہوا۔ مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ آپ کی محبت سے مجھے  
 فریقہ کریا اور حضور کے حسین و جمیل چہرہ نے مجھے اپنا مرید بنالیا اس مبارک روایا کے بعد مشتق رسول  
 ہی ان کی رفیقہ و محو رہن آیا۔

۱۸۶۶ء میں ان کے والد برای نے برعم خود اپنے بیٹے کی ہمدردی میں انہیں سیاحت میں متفرقات کی  
 اسی پر مارم کر دیا۔ آپ نے باپ کی خوشنوا کی خاطر رد و احتساب امر یہ مذمت کر تو لی مگر اس کو  
 یک قید خانہ ہی سمجھتے رہے۔ پکھری کا کام پکھری پر کرتے اور باقی وقت ذکر الہی اور تلاوت قرآن پاک  
 میں بسر کرتے۔ شب بیداری اس کا معمول اور تبلیغ اسلام کا دستور تھا قرآن حکیم کے مطالب پر غور و  
 فکر کرنا ان کی غنہ تھی۔ اس مذمت کے صلہ میں آپ کو جو معاوضہ ملا اس میں سے قلیں سا حصہ اپنی  
 ضروریات کے لئے رکھ کے باقی حصہ غریبا اور مسکین میں تقسیم کر دیتے۔ ان کی نیکی و پارسائی اور  
 پاکیزہ زندگی کی گواہی وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو مسلمان نہیں تھے اور وہ لوگ بھی جو ان سے عقیدہ کا  
 اختلاف رکھتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین کا بیان ہے کہ مرزا صاحب ضلع

یہ ٹوٹ میں مخر تھے اور ہر جہت پر یہ تسکات بہہ سکتے ہیں۔ جو ان میں نہایت حد تک انہیں بڑا کرتے  
 - کاروبار و رست کے بعد ان کا تہا سواقت مٹا دیا۔ یہیت میں نہ صرف سوتا تھا اور عوام سے کہہ دیتے تھے  
 مودنا یہ میر حسن کا کہنا ہے کہ: ہوس ہم نے ان کی قدر نہ کی۔ ان کے کام سے وہ حال کا بین ہیں کہ رست  
 - کی زندگی معمولی انسان کی زندگی سے بھی بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خدا تعالیٰ کے خاص بندے  
 ہوتے ہیں اور ان میں کبھی کبھی آتے ہیں۔

برطانوی عہد رومی میں پنجاب کا ضلع سیالکوٹ خاص طور سے جیسا نیوں کی رو پر تھا اور اب بھی اس ضلع میں  
 اپنے تناسب کے لحاظ سے جیسا نیوں کی تعداد کبھی زیادہ ہے۔ مرزا صاحب اسلام کی حقانیت کی خاطر  
 جیسا نیوں سے ہر دم منظرہ اور بحث مباحثہ کے لئے تیار رہتے تھے عیسائی مذاہب سے ان کے مباحثے  
 ہوتے رہتے تھے۔ سکاچی مشن کے فاضل پادری بھر سے مرزا صاحب کے خوب خوب مباحثے رہے۔  
 پادری بھر پڑھے دیکھے آدمی تھے اس نے مرزا صاحب کے علم و فضل کے معترف تھے حتیٰ کہ جب ان کی  
 وطن مراجعت کا وقت آیا تو خاص طور سے مرزا صاحب سے، لودائی مذاقات کے لئے آئے اور وہیں اس  
 دفتر میں پہنچ گئے جس دفتر میں مرزا صاحب کام کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی باتوں میں موہی تھی۔ مخالف  
 بھی ان سے شکوکہ کے اظہار نہ کر سکتے تھے۔

مرزا صاحب ۸۶۸ میں والد صاحب کے حکم پر مدار مت سے مستعفی ہو کر یہ ٹوٹ سے واپس تشریف  
 لائے۔ اس آرماس سے نجات پائی کیونکہ ان کے اپنے قول کے مطابق آپ نے وہ تمام ایام سخت  
 کراہت اور درد کے ساتھ سر کئے آپ اس روز کا دیان و ایک پہنچے جس روز ان کی والدہ محترمہ کا انتقال  
 ہوا۔ آپ کو اپنی والدہ محترمہ سے از حد پیار تھا ان کی وفات کے بعد جب بھی ان کا ذکر کرتے آنکھیں نم  
 ہوجاتیں۔ والدہ ابھی اپنے سب بیٹے سے جسے دوسرے استغاف سے ”لداں“ کہتے تھے بہت پیار تھا اور  
 وہ ان کی مرض و رت کا خیال رکھتی تھیں۔ ویسے بھی خاندان کے سربراہ کی زوجہ ہونے کے ناطہ سے بڑی  
 اور ادب و رعایہ فہم تھیں عاں ہمتی، ہمدردی، غمگینی اور غریب پروری میں اپنی مثال آپ تھیں۔  
 قناعت، منیت اور مروت آپ کے خاص اوصاف تھے۔ آپ آخر ضلع موہیہ پور کے ایک معزز مفصل  
 خانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ والدہ کی وفات کے بعد مرزا صاحب کی عام ضروریات کا خیال رکھنے والا

فاریس اپنا آپ نے بخیر و بعد میں ریاست بدوخت سے عیسائیوں کے فسادوں کی ایکسپلوی  
 ثر آپ نے والد صاحب قلعہ سے عرض کیا کہ میں کوئی نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ دو روزے گزرتے تھے اور  
 جیسی رانی میسر ہو بھیج دیا کریں! چنانچہ ان کے والد نے فرمایا کہ اس بات پر راضی ہو گئے اور اپنے  
 ایک ساتھی سے رقت بھری آ، زمین کہا میں ملازمی میں خوش قوی رہوں گا۔ کئی راہ تو یہی ہے جس پر یہ  
 چل رہا ہے! اسی سال آپ نے اپنے والد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ بھی لکھ جس کا خلاصہ یہ ہے  
 کہ مجھے آتش دینوی ہے۔ کئی سارے دشمنوں کو ریواہی میں زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جائے۔

۱۸۶۸ء تا ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے کہ مولوی محمد حسین ٹالوی تحصیل علم کے بعد دلی سے واپس آئے تو احمدیت  
 کے خلاف جو شورش برپا تھی وہ ٹالوی بھی پہنچ گئی۔ اتفاق سے مرزا صاحب ہمارے میں تھے ایک صاحب انیس  
 کشن کشن مناظرہ کے لئے مولوی محمد حسین کے ہاں لے گئے۔ مرزا صاحب نے ان سے پوچھا آپ  
 کا دعویٰ کیا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا قرآن سب سے مقدم ہے۔ اس کے بعد اقوال رسول کا درجہ  
 ہے۔ کتاب اللہ اور احادیث رسول کے متعلق کسی انسان کی بات قابلِ حجت نہیں! مرزا صاحب نے کہا  
 آپ کا یہ اعتقاد معقول اور ناقابلِ اعتراض ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ لوگوں نے شور مچا دیا ہمارے ہمارے۔ جو  
 شخص آپ کو سنا تو بے کر گیا تھا وہ سخت طیش میں آیا کہ آپ نے ہمیں ذلیل و رسوا کر دیا مگر مرزا صاحب  
 یہی کہتے رہے کہ کیا میں یہ کہوں کہ امت کے کسی فرد کا قول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر مقدم ہے؟  
 زحرف و توہم کے باوجود صدقِ متالی پر ثابت قدم رہنے کے اس واقعہ کے بعد آپ کو اسامہ بنو ابی اسد اختیار  
 سے نفع حاصل ہوا۔ اور وہ تجھے بہت برکت دے گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت  
 ڈھونڈیں گے! یہ الہام مرزا صاحب کے ابتدائی الہامات میں سے ایک ہے۔

مدامت کے جن جنبت سے فارغ ہوئے تو آپ کے دل میں یہ بات ڈلی گئی کہ آپ کو قصہ کے ذریعہ جہاد کا  
 آغاز کرنا چاہئے چنانچہ آپ نے مختلف اخبارات میں مختلف دینی موضوعات پر مضامین لکھنا شروع کئے  
 اللہ تعالیٰ نے جو قدرت بیان انہیں عطا فرمائی تھی وہ اسلام کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی اور لوگ ان کے  
 مضامین کو ذوق و شوق سے پڑھنے لگے۔ ان کے موضوعات خلاصہ دینی موضوعات ہوتے تھے۔ یہ

معصوم بنگلور کے رہا۔ "منشور محمدی" ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس شخصوں میں آپ نے اپنے تئیں سالہ تجربہ کی بنا پر یہ پھر یہ پیش کیا تھا کہ تمام انسانی مصلحتات و مصلحتات و ساتھ صدق و صدا اور پائی ہے اس لئے ایک سچے مذہب کی نشانی بھی یہی ٹھہرتی ہے کہ اس نے اپنے متبعین کو کہاں تک اور کس طور سے سچائی پر کاربند ہونے کی تعلیم دی ہے۔ آپ نے اس کے ثبات میں یہ کہا کہ میں اسلام کی تعلیمات سے سچائی کے بارہ میں خوشگوار تعلیمات نکال کر دھاما سوں کسی دیگر مذہب کا کوئی بھی پیروکار نہیں ہوں ہمدردی یہ سماج سے متعلق ہو یا برمودہج سے اپنے مذہب کی تعلیمات میں سے سچائی کے موضوع پر اتنی ہی بلکہ اس کے نصف کے قریب ہی تعلیمات نکال کر پیش کرے تو آپ سے پانچ صد روپیہ اخام دیں گے۔ اور یہ پانچ صد روپیہ آج سے ایک سو تیس برس قبل کا پانچ سو روپیہ تھا۔ ہر چند کہ یہ بڑا ہی آسان پیشہ تھا مگر کسی کو جرات نہ ہوئی کہ اسلام کے مقابلہ پر اپنے دین کی تعلیمات میں سے ایسی تعلیمات کو نکال کر کے پیش کر سکتا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پرچوں نے بھی مرزا صاحب سے مضامین طلب کرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ ملک کے دوسرے حصوں کے اخبارات میں آپ کے مضامین کا چھپا ہونے لگا اور مرزا صاحب اسلام اور بانی اسلام کے دفاع کے ظہر دار سمجھے جانے لگے۔ کسی مذہب و علاقہ کی طرف سے کہیں اسلام پر کوئی اعتراض ہوتا تو جواب کے لئے سب کی نکالیں ان کی جانب اٹھتیں۔

اس دور میں مرزا صاحب کی زندگی انتہائی اہم موڑ پر تھی۔ خلوت میں رہنا اور عبادات میں مشغول رہنا ہی انہیں مرغوب تھا۔ مسجد میں جا کر نمازیں پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے داماد کے ایک غریب قرابت دار جانے اے کا بیان ہے کہ میں سمجھتا تھا مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کا ایک ہی مینا ہے مگر جب ان کے گھر میں ایک مرد کو بوجھ مسجد کی طرف سنی کرتے دیکھ تو معلوم ہوا ان کا ایک بیٹا اور بھی ہے اور اسے دنیا میں مسجد سے زیادہ کوئی جگہ مرغوب نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کی خدمت پر کمر باندھ لی اور پھر انہی کے حجرے کے ہو کر رہ گئے۔ اس حجرہ میں ایک چار پائی تھی اور ایک تخت پوش۔ مرزا صاحب تخت پوش پر سوتے تھے چار پائی ان کے استعمال کے لئے مختص کر دی۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے مرزا صاحب کو سوائے عبادت کے کسی چیز کا شغف نہیں تھا کھانے پینے اور نعمتیں دنیوی سے بالکل بے



یا تھے۔ دونوں کا کھانا گھر کے آگے سے آتا تھا۔ نامیاد لفظ معین بہ دین عرف، ہاں بھی آپ کے  
ساتھ رہا کرتے۔ یہ صاحب بھی صاحب کے گھر سے رہا کرتے تھے۔ آپ کا تعلق صاحب صاحب  
کا کھانا آتا تو آپ تھک کر تے۔ لفظ صاحب صاحب بھی آج ہے۔ جاتا تو دو سال، بیٹے بچہ لفظ  
صاحب سے کہتے بکھانا تھا میں۔ صاحب صاحب کے گھر سے کہ انہیں اتنا خیال رہتا کہ اپنے حصہ کا  
کھانا بھی نہیں، لے دیتے۔ کئی بار یہ ہو کہ اپنے ہاتھی کا کھانا بھی لفظ صاحب کو دے دیا ورنہ وہ بچے  
لئے اور اپنے ساتھی کے لئے بھڑا سے بنے ہوئے چنے منگو لے کر کھانا ہنستا آجئے اور چہ چہ کرکھاتے  
وربا تمیں بشارت سے کرتے تھے۔

دن رات کے اس ساتھی یعنی مرزا محمد دین صاحب کا یہاں ہے کہ شام کی نماز کے بعد آپ سو جاتے اور  
نصف شب کے قریب اٹھ کر نفل پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور فجر کی  
نماز تک تلاوت کرتے رہتے۔ راشنی کے لئے آپ مٹی کا دیا جلاتے تھے۔ اپنے ساتھی کو نماز کے لئے  
بیدار کرتے تو پانی کا ٹکاسا چھینٹا دے کر بیدار کرتے کہ یہ سنت نبوی ہے نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر کے  
لئے سونا آپ کا معمول تھا۔

اسی دوران ۱۸۷۴ء میں آپ نے ششی نظر میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ایک رُکے کی صورت میں ایک انجی  
جگہ پر بیٹھا ہے اس نے ایک نہایت چمکیلا اور پاکیزہ دن انہیں عطا کیا اور کہا یہ تیرے لئے در تیرے  
ساتھ کے درویشوں کے لئے ہے اس کشف میں درویشوں کی ایک جماعت عطا ہونے کے بعد درویشوں  
کی کشت نش کی خوش خبری بھی تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ان کا نظر خانہ آج دنیا کے ہر ملک میں  
جاری ہے جہاں جہاں آپ کی جماعت موجود ہے اور لاکھوں لوگ اس نگر سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

آپ کے والد، جد نے ۱۸۷۵ء میں قادیان میں ایک جامع مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ انہی کے  
خاندان کے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ قادیان میں تین آدمی دین کا ذوق رکھتے تھے۔ مرزا غلام احمد مرزا  
سمائل الدین اور میر عبد علی۔ باقی مسلمان آبادی کو دین سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ صرف مرزا غلام  
احمد باقاعدگی سے بیوقت نماز کے لئے مسجد میں جاتے تھے اور بعض اوقات ان کے ساتھ جماعت میں  
شریک ہونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا مگر مرزا غلام مرتضیٰ صاحب نے سات سو روپے کے صوفے سے ایک

تیسرے میں حریہ اور اس پر جامع مسجد کی تعمیر کی اور سیت کی مہنت کے بعد نہیں ہی مسجد کے محفل میں ان کے یہاں تاکہ بعد اس کے بھی اس دور میں ان کے انکسوں میں پڑتی رہے۔ خدائی تعالیٰ یہ دعا کرے کہ دھرمبندوں کی خدمت میں جو وہ محفل کی طرف وشن چند محفل بنی تھیں۔ مہر مہر میں صاحب کا وقت موعود آیا اور وہ مسجد کے صحن میں کھڑے ہوئے۔ راقم حروف نے ان کا مہر مبارک دیکھا جو ہے مزار اسی کے جس کے ساتھ مسجد کے صحن میں ان کا مہر ہے جس کا خوب سنگ مفید سے بنایا گیا ہے۔

مرزا غلام مرتضیٰ وحیدہ و فکیل اور دیگر قہار تھے جن کا رنگ ہندی تھا، انھیں مولیٰ اور سرن تھیں۔ وزجی لکھی تھی۔ چہرے سے شامی رعب وجہ نہ پھٹتا تھا۔ اور بعد وہ بارہ مختلف حاکموں کی ماتحتی میں رہا چڑا مقرر بن کر حوشادہ اور متعلق سے آدو نہیں ہونے دیا۔ عزت نفس اور خودداری کا زہد پاس رکھتے تھے۔ ایک بار ایک سکھ راجہ نے جو ان کے علاقے سے حاکمیت کا ہو گیا تھا ان کی آج کی یہ سب کے دو گاکوں ان کے منہ کے منہ و منہ میں دوسرا لونا ناچا ہے تو آپ نے پائے حاکمیت سے ٹھکرا دئے کہ میں ملک کے منہ و منہ میں اپنے آپ کو واجہ الکی ریاست کے گمشدہ گاکوں لینا اپنے اور اپنی دوا کے لئے باعث کار بھگتا ہوں۔ انگریزوں کی مملکت کی کے آج میں جب حاکم اپنی حاکمیت کا رعب قائم کرنے پر کمر بستہ تھے آپ انگریزوں کے منہ سے زب کر بات نہیں کرتے تھے۔ آپ کی اولوالعزمی اور جواں مردی کا تذکرہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے باپ کا انتقال غریب الوضی میں ہوا مگر ماں کی غش وانا مساجد حاکمیت کے ہوا جو وطن میں رہا اس لئے اور آج قبرستان میں دفن کیا جا سکا اس وقت ان کی عمر بھی پندرہ یا سولہ برس کی تھی۔ آپ نے صوبہ کی تعلیم دہلی کے مشہور شریانی خاندان کے حکیم محمد شریف سے حاصل کی مگر صحت کو پیشہ نہیں کیا، محض خدمت خلق کا وسیع رہنے دیا۔ استغناء اور خودداری کی طبیعت میں تھی۔ نیک بیت صاف باطن و رطلق جسم تھے۔ غریب پروری ان کے خاندان کا خاصہ تھی۔ اگرچہ عمر بھر دیو کوٹی میں جتا رہے مگر آخر عمر میں اپنی تہی دامن کا بحد احساس ہونے لگا تھا۔ خود انہیں کا ایک شعر ہے: اگر دیم نا کرانی ہم عمر۔ اسے دوائے ہمارے کہ چہ کردہ۔ کہ میں عمر بھر کر دینی امور میں معروف رہا مجھ پر افسوس کہ میں نے کیا کیا؟ شاید اسی احساس نے ان سے یہ عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی جائے بلکہ حالات زمانہ کے

مقدمہ میں محمد صاحب نے کئی صدقوں کو چھوڑ کر ان بیانیہ و تحقیقیوں پر  
 ۱۔ اسی کی ایک بار آج جو میر محمد صاحب کی معیت میں چھوڑ کر کے یہاں سے شریعت سے  
 گئے اور چار سال بعد واپس آئے۔ ان میں مشہور صحابی مولوی براتی  
 ان میں صاحب مافی جہر و میند قادیوں گئے اور مرزا صاحب کے مہمان ہوئے جس کا ذکر آپ نے  
 ۱۵۰۱ میں مرزا صاحب کی وفات کے بعد اپنے اخبار میں کیا ہے۔ ۱۹۱۱ میں میں ایک تہہ فانی میں  
 آپ کے یہاں مہمانی کی عزت حاصل ہوئی۔ ان دنوں آپ عبادت اور دعا میں اس قدر محو و مستغرق  
 تھے کہ یہاں مہمانوں سے بھی بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ مولوی براتی مدین صاحب برصغیر پاک و ہند کے  
 معروف صحافی اور شاعر اور جماعت کے سخت مؤثر و نامور اہل علم و ادب کے اور مولانا عبدالمجید احمد  
 خاں والد بزرگوار تھے۔

اس زمانہ میں مرزا صاحب نے یہ کتاب "نعت مبارک" لکھنے کی طرح ان دنوں جس میں اللہ تعالیٰ کی  
 نعمتوں کا تذکرہ کرنا مقصود تھا فارسی شعرا میں اس کا "ذبیحہ" یعنی دیباچہ بھی لکھ لیا تھا ان کا کہنا ہے کہ میں  
 کے قلم کے کچھ شروع کیا تو کیا ایک بار ان رحمت کا زور ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ ہر شے کا ہر قطرہ  
 اللہ تعالیٰ کے ہے انتہا افضل کے کریم میں پرترہ ہے اس خیال کے آتے ہی میں نے قلم رکھ دیا کہ میں بھلا  
 رب رحیم کے احسانات کو کیسے شمار کر سکتا ہوں! اوان نغذوا لعباد اللہ لانسحوبوا ان  
 طرح یہ کتاب عرض تصنیف میں نہ آئی۔

اسلام کو عیسائیوں کے گونا گوں حیلوں کا سامنا تو تھا ہی برصغیر کے مقامی ہندو باشندوں کی جانب سے  
 انگریزی راج کے مستحکم و راسخ ہونے کے لیے عہد حکومت کے ختم ہوتے ہی اپنی قدیم مشن و شہوت  
 حاصل کرنے اور امر راج قائم کرنے کے منصوبہ شروع ہو گئے۔ اس کا ایک ہی طریق تھا کہ مسلم و  
 ہائی اسلام پر فائدہ اٹھائے جائے اعتراضات کر کے حالت ان میں کو اسلام کی عقیدت سے بیزاریاں جائے۔  
 چنانچہ سوامی دیانند نے جنوری ۱۸۷۷ء میں بمبئی کے مقام پر آریہ سماج نامی تحریک کی بنیاد رکھی جس کا مقصد  
 مقلد ہندوؤں کی عظمت و رفعت کو واپس حاصل کرنا تھا۔ اس تحریک کو بنیاب میں بڑی سرعت کے ساتھ  
 کامیابی نہیں ہونے لگی اور لوگ جو حق اور حق اس کی طرف مائل ہونے لگے۔ اس تحریک کا طریق یہ تھا

کہ یہ وکٹ ایڈس کی زکار رفتہ تعمیرات میں مغربی علوم کا ورہاں ممکن ہوتا۔ عدمی عملی تعلیمات کا پیدا کردہ وہاں یہ باور کروانے کی کوشش کرتے کہ وہ یہ محض پر اسے راندن کی بیارتائیں نہیں بلکہ موجود زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دینا والی تائیں ہیں صرف۔ ان جدید تفسیر کے نفاذ سے روایت سے روایت دیکھتے ہیں تحریک کا دائرہ پنجاب میں وسیع ہونا شروع ہوا۔ مرزا صاحب نے بحالی ایا کہ یہ دراصل خدا کی وحید کے خلاف قائم کیا جانے والا تھا ہے اور اس فتنہ کا فوری سد باب کیا جانا ضروری ہے چنانچہ آپ نے اپنے قلم کی ساری قوت سے یہ سماج کے فتنہ کے استیصال کے لئے وقف کر دی اور وہ فتنہ حوالی سرعت سے بھینٹ شروع ہوا تھا فوراً اقامت پر معتبر ہو گیا کہ اس کے عہدیدار اپنے عقیدہ سے پیر اور کتاب ہونے لگے مگر اس تحریک کے پس پردہ آریہ سماج قائم کرنے کی جو سیاسی ریشہ دانیات تھیں وہ اپنی جگہ قائم رہیں۔ یہاں پہلے جگہ وکٹ کر بیٹھے ہوئے تھے آریہ سماجی پنی جگہ لا جواب ہو کر چھین چھین گئے مرزا صاحب ہر گاہ انہیں بدلتے رہے مگر کوئی سامنے نہ آیا۔ آریہ سماج کے لئے کوئی نہ آیا ہر چند۔ ہر مخالف کو تباہی پہنچا دیا۔

مرزا صاحب نے آریہ سماج اور برہمن سماج کے اثر کو بے اثر کر دیا اصل مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ورنہ صد ہا مسلمان آریہ سماج میں شامل ہو چکے تھے اور یہ سلسلہ روز افزوں تھا مگر ان کے ہر وقت سد باب نے ان تحریکات کا ڈنک لگا لیا۔

مشہور صحافی سید حبیب سائق مدبر سیاست نے اعتراف کیا کہ "مرزا صاحب کی کامیابی کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ بے زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ جہات مسلمانوں پر قابض تھی اور اسلام مسکمی اور آریہ مبغضین کے طلوع تشریف کا مورد بنادیا تھا۔ مرزا صاحب نے اس حالت سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کی طرف سے سینہ سپر ہو کر غیر کا مقابلہ کیا" اور متا بعد بھی یہ کیا کہ خود ان کے قول کے مطابق دشمنوں کے دانت کھٹے کر گئے۔

۱۸۹۰ء میں مرزا صاحب کی پہلی تصنیف "برائیں احمدیہ" چھپ کر سامنے آئی۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے تین سو بائیس عقیدہ و تفسیر سے اسلام اور قرآن مجید اور نبوت محمدیہ کی صداقت ثابت کی ہے اور اگر نہ ہب کو رد کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت نے انہیں سارے ہندوستان میں شہرت دے دی۔

تہا سلوک نہ رہا۔ زور ہا جب قتل ملی لہجہ ہے۔ ایسے سے لب و لہجہ کی حد سے یہ کتاب بہت جلد مدنی شریعہ کا عمدہ نمونہ بنی۔ اس کے مصنف اور مدنی مکتوب میں نمایاں مشاعرہ ہو گیا۔ اس زمانہ کے بعض سائنس پر مشہور مدنیوں کے مکرر دستور زمانہ کے مطابق بعض مخالفین نے اس کتاب کی اشاعت پر مصنف کے خلاف فتویٰ مانے کفر شریعہ کے اور ان کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ مقام کے بارے میں مبالغہ و غلطی کا سراپا ہے۔ اور خود ہم ہونے کا دعویٰ کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے دو حصے ۱۸۸۰ میں تیسرا حصہ ۱۸۸۲ میں اور چوتھا حصہ ۱۸۸۳ میں شائع ہوا۔ پانچواں حصہ ان کی وفات کے بعد چھپ کر سامنے آیا۔

مرزا صاحب کو ماموریت کا پہلا ایہام ۱۸۸۲ میں ہوا (مگر آپ نے مامور اور مجدد ہونے کا دعویٰ ۱۸۸۵ میں کیا)۔ اس ایہام میں جو عربی کے ستر فقرات پر مشتمل ہے اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جو مرتبہ بھی عطا کرے گا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت سے ہوگا۔ ۱۸۸۲ ہی میں آپ کو بتایا گیا کہ لوگ دور دور سے آپ کے پاس آئیں گے۔ لہذا اس وقت قادیان ایک کورہ تھا جس کو کوئی چاہتا بھی نہ تھا۔ پھر دور جو خلق ہوا کہ راستوں میں گڑھے پڑ گئے۔

۷ نومبر ۱۸۸۳ کو آپ کا نکاح ثانی حضرت خواجہ میر درد کے خوادو میں ہوئی۔ مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی نے اس نکاح کا اعلان کیا۔ اس بیوی کے بطن سے دس اولادیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمیں جن میں سے پانچ نے بی بی مرپائی۔ سب سے بڑے بیٹے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفہ مسیح الاول حضرت حکیم مولوی نور الدین کی وفات پر ۱۹۱۳ میں ان کے خلیفہ ہوئے۔ ۱۹۶۵ میں ان کی وفات پر ان کے بڑے بیٹے حضرت مرزا ناصر احمد نے تیسری خلافت کی رد اور دوسری۔ چوتھے خلیفہ بھی خلیفہ ثانی کے بیٹے حضرت مرزا طاہر احمد تھے اور اب ۲۰۰۳ میں ان کے وصال کے بعد بانی سلسلہ عالیہ کے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت مرزا شریف احمد کے پوتے حضرت مرزا سرور احمد ایدہ اللہ تعالیٰ خلافت سے ختم ہوئے۔ اس طرح آپ کی نسل میں رشد کا سلسلہ جاری ہے۔

خامسہ کے منصب پر فائز ورنہ نذر کا سران ہیں۔ اس طرح آپ کی نسل میں رشد کا سلسلہ جاری ہے۔

آپ نے پہلی بیعت ۱۲۳۳ھ تا ۱۸۸۹ء کو لدھیانہ میں قبول کی اور اس طرح جماعت احمدیہ کی بنیاد رکھی۔

۱۰۔ افراد نے باری باری بیعت کی پہلے بیعت کنندہ حضرت مولوی نور الدین صاحب تھے۔ ۸۹۰ء۔ ۹۱۔

میں آپ نے متعین موعودوں کو یاد دلائی یا۔

بانی مسند احمد یہ ۱۹۱۱ میں سینہ ر۔ یہ جلسہ کے وقت کا اجتماع تھا۔ ۲ دسمبر ۱۸۹۰ کو پہلے جلسہ میں ۵۰۰ افراد شریک ہوئے۔ ۱۹۰۶ میں قاریوں کے آخری سال نہ جلسے پر کم و بیش تینتیس ہزار افراد حاضر تھے۔ درود میں ہونے والے سال نہ جلسہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے تجاوز تھی۔ حکومت پاکستان نے ۱۹۸۴ سے جد اب تک سالانہ جلسہ کے انعقاد کی اجازت نہیں دی اس لئے دنیا کے مختلف ممالک میں یہ جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ یہ جلسہ جماعت احمدیہ کا اہم سالانہ اجتماع سمجھا جاتا ہے ۱۸۹۲ میں آپ سیاحوت تشریف لے گئے۔ اس شہر میں آپ نے مدت کے کچھ سال بسر کئے تھے اس لئے جو یہ خدق دیکھنے سے متعلق رہتا تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ شخص جس نے اپنی نوجوانی کا کچھ عرصہ ہمارے درمیان پاکیزگی اور نیکی سے گزارا ہے اب کیسا ہے۔ اس سفر کے دوران ان کے بہت سے پرانے جاننے والوں نے آپ کی بیعت میں شمولیت کی جن میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد بھی شامل تھے۔ اقبال اور ان کے برادر بزرگ شیخ عطاء محمد صاحب اس وقت سے ہی اپنے کو بیعت میں شامل سمجھتے تھے۔ ور ۱۹۱۳ تک ان کا جماعت کے ساتھ تعلق رہا مگر بعد بعض سیاسی مصالحت کی بنا پر اقبال بیعت سے الگ ہو گئے۔

نجس کی پرانی پیشگوئیوں میں مذکور تھا کہ مہدی موعود کے ظہور کے وقت چاند اور سورج کو ایک معین وقت میں گر سن گئے گا اور اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا۔ کسی مامور کے لئے یہ آسمانی نشان ظاہر ہوا ہو۔ چنانچہ ۱۸۹۳ ج ۱۸۹۳ کو چاند گرہن اور ۶ اپریل ۱۸۹۳ کو سورج گرہن ہوا اور انہوں نے اس کسوف و خسوف کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔

۱۸۹۵ میں مرزا صاحب نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر اعلان کیا کہ صری قوت ہو چکے ہیں اور ان کا مدفن محمد خانیہ سرینگر میں موجود ہے۔ ۱۸۹۶ میں لاہور میں جلسہ اعظم مذاہب ۳۶-۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو منعقد ہوا اس میں مرزا صاحب کا معرکہ آراء مضمون "اسلامی اصول کی فطرتی بنیادیں" بہت تاب تک لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا موجب ہو چکی ہے اور دنیا کی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ۱۶ مارچ ۱۸۹۷ کو پنڈت لکھنرم جوسریہ سماج کا بڑا اوریدہ دہن میڈر تھا مرزا صاحب کی ننداری پیشگوئی کے



عاقبت ایک بادشاہ نے ہاتھوں تلے اس کی ساریوں میں سے پادری کی ماٹنگ لگا رکھنے  
مرزا صاحب پٹلی مارشل کے نام سے اس میں درج نہیں ہونے کے لیے مرزا صاحب کی بریت  
کے ساتھ بیدار کئے اور دشمن خائب و خوار ہوا۔ دیکھو، دشمن نے جو کچھ سیور کے اپنی کشتی  
اور نہایت محنت سے تھے ۲۳ گرت ۱۹۰۰ کو نہیں اس مقام سے بری کر دیا۔ یہیں دھکس جو کشتی  
دھکس کے عہد تک پہنچے مسوین صدی کی چھٹی دہائی تک رہے تھے اور اپنے اپنے واسطوں کو مرزا صاحب  
کے مقدمہ کے بارہ میں بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے انہوں نے مرزا صاحب کی جماعت کو سیکڑوں سے  
اکھوں ہوتے دیکھا تھا اور اس کی گواہی دیتے تھے۔

۱۹۰۱ میں سرکاری مردم شماری کرنے والی تھی اس لئے مرزا صاحب نے اپنی جماعت کے لئے فرقہ احمدیہ کا  
نام تجویز کیا اور احمدیوں نے اس کے مطابق اپنے نام رجسٹر کروائے۔

۱۳ جولائی ۱۹۰۳ کو اس کے مرید صاحبہ "سید عبدالصغیر کو سٹارک کے شہید کر دیا گیا۔ اس پر مرزا  
صاحب نے کامل کی سرزمین کو انتخاب کیا۔ اسے کامل کی سرزمین تو خدا کی نظروں سے گزرتی۔ اور دنیا آج  
تک اس سرزمین کی ذلت جہاں اور سوائی کا مشاہدہ کرتی چلی آ رہی ہے۔

۲۶ مئی ۱۹۰۸ کو مرزا صاحب نے لاہور میں انتقال کیا اور اگلے روز ان کی نعش کو قادیان میں دفن کیا گیا  
مرزا جہان کے پہلے خلیفہ مولوی نور الدین بھیرائی نے پڑھا۔

ان کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد صاحب کے قول کے مطابق مرزا صاحب "کا چہرہ کتابی تھا، اور رنگ  
سفیدی بالکل گندمی تھا اور خط و خال نہایت تناسب تھے۔ سر کے باں بہت مٹم اور سیدھے تھے مگر باؤں  
کے آخری حصے میں کسی قدر خوبصورت خم پڑتا تھا۔ ذرا ہی گھنٹہ اور تھی مگر رخسار باؤں سے پاک تھے۔ قد  
درمیانہ تھا اور جسم خوب سڈول اور تناسب تھا، اور ہاتھ پاؤں بھرے بھرے درندگی فراخ اور مضبوط تھے۔  
چہنے میں قدم تیزی سے اٹھتا تھا مگر یہ تیزی ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ زبان بہت صاف تھی مگر کسی کسی لفظ  
میں کبھی کبھی خفیف سی کھٹ پائی جاتی تھی۔ جو صرف ایک چوکس آدمی ہی محسوس کر سکتا تھا۔ "پچھتر سال کی عمر  
پائی مگر کمر میں خم نہیں آیا۔

دیوبند شہر میر محمد اسماعیل دہلوی نے ان کے بارہ میں لکھا "میں نے آپ کو اس وقت دیکھا جب میں دو

سب کا یہ تھا پھر آپ میری آنکھوں سے اس وقت عجب سوئے جب میں ۲۷ برس کا جوں تو عمر میں  
 حد تک قسم کھ کر بیان کرتا ہوں کہ میں نے آپ سے بہت آپ سے زیادہ محبت کی آپ سے زیادہ دیکھ آپ  
 سے زیادہ دوزخ آپ سے زیادہ مدد اور اس کی محبت میں غرق ہوئی شخص میں لکھا۔ "آپ ادا حق  
 میں کامل تھے مگر آپ نہایت رؤف رحیم شخص تھے جتنی تھے مہمان واز تھے انجے اس تھے۔ بتاؤں  
 کے وقت جب لوگوں کے دل بیٹھے جاتے تھے یہ شیرازی طرح آگے بڑھتے تھے۔ غلو چشم پوشی یا مضمی  
 دینت 'خاکساری' صبر 'شکر' استغناء 'حیا' 'عش' 'بصر' 'عفت' 'محنت' 'قیامت' 'وفاداری' 'سب' 'کلفی' 'سادگی' 'شفقت'  
 'وہابی' 'امید' 'رسول' و 'بزرگان' دین 'علم' 'میانہ روی' اور 'نگی' 'حق' 'ایمان' 'عبد' 'چستی' 'ہمدردی' 'اشاعت'  
 دین 'تربیت' 'غیرت' 'حسن' معاشرت 'مال' کی 'عبدالاشت' و 'قادر' 'طہارت' 'زندہ' دلی اور 'مزاج' 'غیرت' 'احسان'  
 'ظہر' 'مراتب' 'حسن' ظنی 'ہمت' 'ادب' 'العربی' 'خودداری' 'خوش' 'روئی' اور 'شہاد' 'پیشانی' 'کف' 'غیظ' 'اعتدال' و 'کھب'  
 'سان' 'یاد' 'معمور' اوقات ہونا 'انتظام' 'اشاعت' 'مہم' و 'معرفت' خدا اور اس کے رسول کا 'عشق' کامل 'تہا'  
 'رسول'۔ مختصر یہ آپ کے اخلاق و عادت تھے۔ آپ میں یک سطر طبعی جذب تھا ایک عجیب کشش تھی  
 'عجب' تھا 'برکت' تھی 'موانست' تھی 'بات' میں اثر تھا 'دعا' میں قبولیت تھی 'خدم' پر 'داند' اور 'حق' ہندہ کر آپ  
 کے پاس بیٹھتے تھے اور دوس سے رنگ خود خود دھست جاتا تھا۔"

-----

## تازہ بستیاں آباد

مہاجرت انسانی زندگی کا ہمیشہ سے حصہ رہی ہے۔ کیونکہ انسان ایک ماحول یا ملک میں قسبی زندگی یا عدم استحکام کے آثار دیکھتے تو نفس مکانی کر جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا ارتقاء مہاجرت کی گونا گوں کیفیتوں کا مظہر رہا ہے اور ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ایک عظیم مہاجرت وقوع میں آئی۔ اس ہجرت کو بیسویں صدی کی سب سے بڑی ہجرت قرار دیا گیا کیونکہ کھو کھبا انسان اپنے پرکھوں کا وطن چھوڑ کر اپنے نئے وطن کی طرف چلا۔ پڑے وہ وطن جس کا خواب ن لوگوں نے دیکھا تھا۔ امن سکون، آشتی اور آزادی کا وطن۔ اس وطن تک پہنچنے میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ پتھر اور میں کھیت رہے کچھ یہاں پہنچ کر غریب انوطنی کے آسرا کا شکار ہوئے۔ میں ۱۹۹۰ میں دوسری بار مہاجرت کا شکار ہو تو میں نے انگریزی میں ایک فلم کی THE GENERATION GAP اس فلم کا اب تک اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہو مگر اس فلم نے بین الاقوامی ادبی حلقوں سے بہت تحسین وصول کی۔ اس انگریزی فلم کا عنوان تھا "دو نسلوں کا بعد"

"صنفِ صدی پہلے"

میرزا آباد و اجداد نے

آزادی اور طمعیت کی خاطر

پنی خوابوں کی سرزمین کی طرف مہاجرت اختیار کی۔

اٹھارہ صدی کے بعد

ان کی اولاد نے بھی مہاجرت کی

نمرا ایک سرزمین کی جانب

جو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔"

یہ داستان پہلی مہاجرت کے بعد کی داستان ہے۔ ہمارے قادیان سے نکلے تو انفرادی طور پر جس کے

جہاں جیسے سیٹلنگ، جامینہ مگر جماعت کو بہت مال ایک مزرہ کا تھا۔ ساری مزرہ کس سے تھی؟  
جماعت کو یہ خطہ زمین کی شہرت تھی جس کو اپنا مزرہ ترقی کر کے اپنے متعلق و چاروں گھسے۔ اس  
قدرت مہربان تھی اس نے صدیوں سے ایک بے آب و خشک مزرہ کے لئے محنت کر رہا تھا۔ یہ بے  
آب و گیہ خطہ زمین دریا کے کنارے پر ہونے کے باوجود روئیدگی سے بھر رہی تھی ڈاکٹر ویرا صاحب  
نے بعد ازاں مجھے بتایا کہ یہ علاقہ اتنا بے آب و خشک تھا کہ وہ وہاں میں بھی یہاں سے نڈرتے  
سوئے ڈرتے تھے اور موٹر کی رفتار تیز کر دیا کرتے تھے۔ شور سے پھر در زمین اور کالے لکے پہاڑ ایک  
دیران قبرستان۔ خوف کے سارے قریبے موجود تھے بہت سے لوگ اس قطعہ زمین کو دریا سے پانی انھ  
کر یا زمین سے پانی نکال کر سیراب کرنے میں ناکامی کا اعلان کر چکے تھے اور انکوں روپیہ بہا کر چکے  
تھے۔ چنانچہ جماعت احمدیہ نے اس بے آب و گیہ خطہ زمین کو چنا تو ارد گرد کے لوگوں نے یہی سوچا ہوگا  
کہ یہاں سیر پھرے ہوئے ہیں اس غیر زمین کو لے کر کیا کریں گے؟ نہیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ جماعت واقعی  
سیر پھروں کی جماعت ہے ظاہری مشکلات اس جماعت کا راستہ نہیں روک سکتیں کریں گے اہل نظر تارہ  
مستیاں آباد۔

ریوہ میں کچے مکانات کی آبادی تھی لمبی لمبی قطار میں جتنی اینٹوں سے بنے ہوئے مکان۔ انجمن کے دفاتر کا  
بھی یہی اسلوب تھا۔ تین چار میز پر کئی کئی جنٹلمین چھوٹے چھوٹے کمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔  
ہم بچوں کو دفاتر کی طرف جانے کی اجازت نہیں تھی صرف ایک دو بار اپنی کو بلائے کے لئے جانا پڑ  
۔ کیونکہ لی بہت بڑا تھیں۔ آخر اسی بیماری میں انہوں نے اپنی جان چاں آفریں کے سیر کردی و ریوہ  
کے بہشتی مقبرہ کے اولین آباد کاروں میں شمار ہوئیں۔ یہ ۱۹۵۱ کی بات ہے اس وقت میں دسویں  
جماعت میں تھا اور چند مہینوں بعد میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اسی لئے گھر کے اداس اور پریشان  
خانہ سے دادر کھنے کے لئے ابا جی نے سکول کے بورڈنگ باؤس میں داخل کروا دیا مگر ہمارا سارا وقت  
جنائی صاحب کے ہاں پھوٹی صوفیہ مرحومہ کے ہاں گزرتا تھا۔ سردار مصباح الدین صاحب کے گھر  
والوں سے اور سردار نذر حسین صاحب بوج کی بیٹی ساطیعی کے ساتھ قادیان سے تعلق تھا اس لئے ان  
دونوں نے اس غم بھلا دیا اور ہم امتحان دے کر ریوہ آ گئے۔ ریوہ کے ابتدائی دنوں کی آدھی قیمتوں میں

تھی مگر اس نے نہیں دیکھا کہ وہ رات میں رہتا تھا صاحب نے جیسوں کا ذکر تقی نہیں سے  
 کیا ہے۔ رات میں رہتا تھا۔ میں نے یوں آبادی میں کھوں نہیں بات کی تھی۔ اتنا صاحب تھا  
 کرتے تھے کہ پہلی رات سوگ خواب کے رہے سوچیں نہیں سے۔ آجہ جن حد کا خوف اسی دن کا اور  
 چھویدوں کی دوسو۔ جیسوں میں رہنا تو بہت دلوں کے لئے چھوچے کی بات نہیں تھی کیونکہ خدا کے  
 جماعت میں جیسوں میں رہنا چاہتا تھا۔ ایسا تو یہ بات یاد ہے۔ حضرت صاحب کا قصہ حالت بھی کیا  
 تھا اس سے ساتھ ایک بچی مسجد تھی اس میں حضرت صاحب نماز کے سے تشریف لے آتے اور بعد کا خطبہ دیا  
 کرتے تھے۔ سخت گرمی کے دنوں میں بھی حضرت صاحب ظہر عصر کی نماز کے بعد مجلس عرفوں کے سے  
 تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ ذہن میں بھی ایک اور تصویر مستحضر ہے حضرت صاحب محراب میں تشریف  
 رکھتے ہیں۔ ایک دو دم پکھا جھل رہے ہیں۔ حضرت صاحب کی قمیض پینے سے جسم پر چپک رہی ہے۔  
 ایک دو دم حضرت صاحب نے سر سے چڑی بھی اتاری مگر ہمیں حضرت صاحب کا وہی پہننا یا نہیں۔  
 ربوہ میں بجلی تو بہت بعد میں آئی۔ اسی حالت میں گرمیوں بھی گزر جاتی تھیں سردیاں بھی۔ پھر ہمیں وہ  
 قیامت بھی یاد ہے جب حضرت اماں جان کا انتقال ہوا۔ ہم نے کسی جنازہ کے ساتھ لیے لیے ہنس پہلی  
 بار بندھے ہوئے دیکھے۔ لوگ زار و قطار رو رہے دیکھے۔ حضرت اماں جان کی وصال کی خبر ریڈیو سے تین  
 بار نشر ہوئی۔ لفظ تک ذہن میں ہیں "بڑے افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ مراد امام احمد قادیانی کی  
 بیوہ اور امام جماعت احمدیہ مراد بشیر الدین محمود احمد کی والدہ محترمہ آج ربوہ میں انتقال کر گئیں۔" اس  
 وقت ربوہ کا فظ سن کر بہت چنچا ہوا کیونکہ اماں کا مسئلہ نہیں پڑھا تھا۔ پڑھا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا  
 جو امت کے اکثر مقررین کو امانے سے آج تک بے اعتنائی کرتے سن اور دیکھ رہے ہیں مگر ریڈیو دلوں  
 نے ایک ہی نشریہ میں امانے کا مسئلہ ذہن نشین کروا دیا۔ آبادی ریڈیو سے لائن کے دونوں طرف تھی۔ ہم  
 موجودہ درمختار والی طرف رہتے تھے اسے محمد الف کہا جاتا تھا لائن کے پار بھی کوارٹروں کی قطاریں  
 تھیں۔ چچا جی بھامز کی صاحب اور ماجد شاہدان کوارٹروں میں رہتے تھے گاڑی بھی دن میں شاید ایک  
 ہی آتی تھی۔ صبح چھ بجے کے قریب اور شام کو چھ بجے کے قریب ہم لوگ چھیوٹ جاتے تو ن گاڑی سے  
 آتے جاتے تھے۔ گاڑوں میں تھے تو اپنے گاؤں سے تو نمایاں کے قصبہ تک پیسوں ہی آتے جاتے تھے۔

بکی چنیوٹ کے جتن دھندلے ہو کر پیدل آتا جا رہا تھا۔ اچانک نہیں تھا۔ بس وہاں میں تھا جس سے صبح کے  
 بارے میں سوچا کرتے تھے۔ چھوڑتی تھی۔ وہاں میں صاحب خوش رہا۔ یہاں الیہ ریٹہ سائیکل  
 خریدی۔ خشکی صاحب سائیکل رکھنے اور سوار کرنے کے بارے میں بہت مت شکوک تھے۔ کبھی کاٹھیاہٹ کے  
 شوقین تھے شاید اب بھی ہوں اس لئے ثابت ہے ہمارے دوست تو سبیل کانٹے سے جس سوکرار یا پر پہنچ  
 جاتے تھے۔ یہ سائیکل ان کے حوصلوں کا ساتھ دینا۔ یہ سبیل اس لئے آپ سے بچاؤ کی اپاہی سے دفتر  
 سے پہنچنے کے کریمہ قیمتی سائیکل میں روپ میں خریدی۔ خاہر سے اپاہی اپنے بھائی قس و خوش کے ساتھ  
 سائیکل پر بیٹھنے سے تو رہا ہے اس لئے سائیکل ہمارے چنیوٹ آنے جانے کے لئے خریدی گئی۔ ماجد شاہد  
 جو ہم سے ایک کلاس کے تھا اور جٹ میں ہم سے زیادہ، تو ساتھ ہمارا ساتھی قرار پایا۔ ماجد سائیکل چاہا ہم  
 طمینان سے کیرئیر پر بیٹھنے مگر دو دو سائیکل سواروں نے ایک ڈبل ٹرسٹر سسٹم ایجا کر لیا۔ وہ یوں کہ دیر کی  
 چیز چھائی چیز جتنے ہوئے پیچھے کیرئیر پر بیٹھ سو سو پیچھے سے پیڑ چھاتا تھا اور گدی پر بیٹھا ہوا سوار بھی اس  
 کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا رہتا تھا جس طرح چیز چھائی کا مرحلہ طے ہو جاتا تھا مگر یہ ڈبل ٹرسٹر اکثر سارا سارا  
 رستہ ہی استعمال ہونے لگا تھا کہ ایک فاصلہ کو سارا وقت سائیکل نہ چھائی پڑے۔ ماحول طور پر جب مواہز  
 اور مختلف موٹی تو یہ سسٹم بہت کارآمد رہتا۔ سڑک پر اکا دکلا ریل چلتی تھیں اور بھی کیس پلانٹ سے چلتی  
 تھیں اکثر یوں ہوتا تھا کہ بیسوں کا گیس پلانٹ اور یا کی چیز چھائی چیز جتنے سے لئے سب قوت میا نہ کر سکتا  
 تو بیسوں کا ٹینک دم توڑا رہتا۔ تب سوار یوں ترک کر دھکا لگاتے اور انجن کی مدد کرتے۔ خدا خدا کر کے چیز چھائی  
 ختم ہوتی تو سوار یوں باہمی کا پتہ ہی میں سوار ہو جاتے۔ (استادی پروفیسر مبارک احمد انصاری نے یہ  
 مدد ملاحظہ فرمایا تو فرمایا کہ اس پلانٹ میں مکڑی کا کونڈا جایا جاتا تھا۔ کیمسٹری کے استاد ہیں ٹھیک ہی کہتے  
 ہوں گے 'ہم نے تو ادب کے ماحول مکڑی کے کونڈا کا ایک ہی مصرف بن رکھا ہے' میں پاپن کچھ ایسی جلی  
 دیکھ بھونہ رہا تھا۔) بیسوں کے ڈرائیور ہم سائیکل سواروں پر بہت مہربان تھے کیونکہ بسا اوقات نہیں  
 ہمارے دھکوں پر انھیں کرنا پڑتا تھا۔ سڑک چھوٹی سی تھی بمشکل ایک بس گزر سکتی تھی۔ روڈ رولریت کے  
 باعث سب نے ہمیں سڑک سے اتارنا پڑا تو ہم سائیکلوں سے ہی اتر جاتے تھے کیونکہ ریت میں دھنسنے  
 جانا کے بعد سائیکل کو کھینچنا مشکل کیا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ٹرک اس زمانہ میں بہت شاذ ہی نظر آتے تھے



بربر کی کتے تانے یا کھڑے کام میں اسے بات تھے۔ ربوہ کے بڑی بیٹے، اے بیٹا سے  
 کی تے اور انہیں باتوں کی بات تھے۔ اس ربوہ میں مدد بھی۔ ربوہ کی کتے۔ مہتمم  
 ہوتا تھا۔ آن کل تو صرف بیٹیں دھونے کے لئے یہ ربوہ کا کھینچنے کے تے۔ تنوں میں آتا ہے۔ ربوہ  
 میں سب سے پسے گدھوں کے ذریعہ باربر بربر کی کا کام ہمارے۔ ایک کلاس فیوضت نے شروع کیا۔ اس  
 کے پاس ایک مدد تھا وہ اس سے کس زمانہ میں واروپ دیہاڑی کا تھتا تھا۔ ہمیں بھیجا تھا کہ یہ کہتا تھا کہ  
 میں نہ اچھے ہوں تم لوگ ماں باپ کے گھڑوں پر پڑتے ہو۔

ربوہ کی پہلی پہلی عورتوں میں جی کچی عورتوں میں جو عمارتیں ہمارے سامنے نہیں دفتر تحریک جدید کی  
 عمارتیں تھیں۔ تحریک کے دفاتر ایک چور احاطہ کی صورت میں تھے۔ یہ احاطہ بعد کو جامعہ احمدیہ کے  
 ہاسٹل کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ایک احاطہ در بھی تھا سے احاطہ کہا جاتا تھا اس کے اندر غرباء کے  
 خاندان رہتے تھے ہمارے سکول کے دوستوں میں سے ایک دوست اس احاطہ میں رہتا تھا اس لئے ہمیں  
 اس احاطہ کے اندر آنے جانے کا موقع ملتا رہا۔ اب تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت خوش حال اور اس  
 اولاد والا ہے اور لندن میں قیوم پذیر ہے مگر اس میں ذرا حوت ہلی آئی ہو۔ اسے اپنے بچپن کی ساری باتیں  
 اور غربت کے سارے حالات یاد ہیں۔ یہی انسان کی بڑائی ہے۔ شش کش میسر ہو تو عدم کش کش کے زمانہ  
 کو بھوں نہ جائے۔ مگر بہ دوست بری مست نہ گروی مردی۔ نہ ہاری گلی میں دونوں طرف کوڑے تھے سچ  
 میں استادہ راستہ تھا ہمار مکان پہلا تھا مقابل کے پہلے مکان میں بھائی محمد عالم حضرت صاحب کے باڑی  
 گھر اور ان کے اہل خانہ حسین رہتے تھے دوسرے مکان میں بھائی جان محمد احمد نعیم در پھو چھاتی حضرت  
 موسوی غلام نبی مصری تھے ہمارے ساتھ کے مکان میں قوری محمد امین صاحب اور تیسرے مکان میں  
 مولیٰ محمد یعقوب صاحب طاہر تھے ان سے آگے چوہدری اعجاز نصر اللہ خاں تھے جو ان دنوں معاون  
 ناظر امور عامہ تھے ان کی جگہ چوہدری عطاء اللہ صاحب آئے۔ نشین کی جانب جہاں گلی ختم ہوتی تھی  
 حافظ غلام محی الدین صاحب نے ایک چھوٹا سا جائے خانہ کھول رکھا تھا۔ حضرت مولوی مصلح الدین راجپوت  
 وہیں تشریف رکھتے تھے اس کے ہمارا وہاں آنا جانا تھا۔ دیسے ربوہ کے چائے خانوں میں سیلونی کا چائے  
 خانہ بہت مشہور تھا۔ سیلونی صاحب عجیب خوشبودار چائے بناتے تھے خدا معلوم کون سی پتی استعمال کرتے

تھے اور چنے میں یہ خوشبو مالتے تھے کہ ان کے ہاں سے ایک بار چائے پینے والا نہیں کا سو کہ وہ جاتا تھا۔ ایک کچے دار کے ایک طے میں ایک ست بڑا خیمہ ہوں نے کیا تھا۔ چرخہ جانے یہ کوک پڑا کہ بیوی صاحب اپنا بوریا ستر سمیٹ کر ربوہ بنی سے چلے گئے مدتوں بعد ہمیں جھنگ کی ضلع پٹنری میں ڈیرہ لگائے بیٹھے دیکھ مگر ان سے بات چیت کا موقع نہ ملا کہ اس سے پوچھ لی لیتے کہ ربوہ کے لگے گائے گا کہ چھوڑ کر جھنگ میں آ بیٹھے میں کیا تک تھی اس کے ہاں صرف چائے ہی چھی نہیں ہوتی تھی صفائی کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا صاف تھریں۔ صاف ستھری میزیں کرسیاں۔ اپنے خان میرافغان صاحب قریاں کے زمانہ سے حضرت صاحب کے باڈی گارڈ کے طور پر معروف تھے آپ نے بھی اک چائے خانہ کھوں رکھا تھا اس میں پٹھانوں والی نرک چائے بیچتے تھے۔ فیاض خاں صاحب کرمانی بھی چائے پلاتے وہ اپنی خاموش گفتگو سے گاؤں کو متنع کیا کرتے تھے۔ ربوہ کی آبادی میں ایک اور بڑا سا خیر تھا دو ملک عمر علی صاحب کا خیر تھا۔ آپ اس خیمہ میں رہتے تھے۔ تحریک جدید کے دفاتروں میں کام کرتے تھے ناب ذکیل البشیر تھے اور بشیر کی خاطر ہی آپ نے ایک جرمن خاتون سے بیاہ بھی کر لیا تھا ربوہ میں اس بیوہ کا خوب چرچا ہوا۔ ہمارے پڑوس ہی میں کبھی ملی میں حضرت قاضی عبدالرحیم اور قاضی عبداللہ صاحب رہتے تھے۔ قاضی عبدالرحیم صاحب کی گھرانی میں مسجد مبارک ورنیا قصر خلافت تعمیر ہوا۔ محسن و تحریک کے دفاتر کی عمارتیں بھی غالباً انہی کی گھرانی میں بنیں۔ نہایت محنت کرنے والے بزرگ تھے حضرت قاضی محمد عبداللہ صاحب سے تو کافی دیر تک متنع ہونے کا موقع ملا رہا۔ قاضی صاحب بہت ادنیٰ سننے لگے تھے مگر شہر بھر میں آپ کا بہت احترام تھا۔ بزرگوں کا ذکر شروع ہو گیا تو حضرت مفتی محمد صادق صاحب یاد آ گئے۔ آپ بہت ضعیف تھے۔ لمبی سفید داڑھی سر پر سبز چڑی بر میں ایک لہا سا جھنڈا نہا ہوا جگہ تھا یعنی اس میں رانگی بھری ہوئی ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب آہستہ آہستہ چلتے اور محمد کے بچوں میں ٹانگوں گونیاں بانٹتے رہتے تھے جدھر سے ان کا گزرتا ہوتا بچے قطاروں میں کھڑے ان کا انتظار کرتے۔ جو بچہ سلام کرتا حضرت مفتی صاحب اسے ایک گولی دے دیتے۔ کئی بچے ایک جگہ سے ٹانگی یا آؤں لینے کے بعد پک کر دوسری جگہ جا پہنچتے اور پھر اپنا حصہ وصول کرتے۔ حضرت مفتی صاحب مسکراتے مگر اسے دوبارہ گولی یا ٹانگی دینے سے انکار نہ کرتے۔ حضرت مفتی صاحب کی تقریریں جبر

ماں نے روبرو صوب کے موضوع پر موتی تھیں اور بہت رنجی اور ختم سے کی جاتی تھیں مستی صاحب  
کی رہاں میں سے موتی تھیں، رخصت صاحب کی رہاں سے موتی تھیں۔ موتی صاحب کی رہاں سے  
کرتے کرتے وقعت نہاتے نہاتے شب دیدہ ہو جاتے سارے مجمع رونے لگتا میں حضرت موتی صاحب  
کی رہاں سے رخصت صاحب سے کاجوڑا آیا وہ کسی ور سے منے میں نہ آیا۔ غائب نے جو ہر رکھا ہے، اگر  
اس پر ہی دل کا اور پھر یہاں اپنا دل بھیجے تو صاحب کی تحریریں سن کر آئی۔

دیکھتے، دیکھتے ربوہ کی آبادی میں چنے مکوں کی نشا ت ہوئی۔ انجمن کے دفتر کچے بن گئے۔ تم بہتوں  
بہن طرک کرتے تھے تو کئی عورت میں بہتیاں قائم تھیں۔ یہ کمرہ میں ٹلر، روڈ، آٹھ بیٹے تھے  
دوسرے میں ڈپسری تھی جہاں سے راست احمد خاں، بھائی حفیظ اور ان کے زن بھائی عہد قیوم  
دو، میں ہانفتے۔ ایک کمرہ میں 'علی یعنی حنف الرحمن شا کر بیٹھا' پالی پالی لکھو' کرتا لگتا اور خون  
جا بچتا رہتا۔ پھر بڑا ہوتا تھا۔ ربوہ کا نقشہ بدل گیا۔ بسوں کا ڈوبن گیا۔ شیش پر کڑی کی گیلیوں سے  
بنے ہوئے چھوٹے سے کمرہ کی بجائے ڈرا بڑا کمرہ بن گیا۔ پلیٹ فارم تو بجا کر کہیں نئی عورت کے  
بعد اونچا ہوا اسے اس زمانہ میں ہانگل ہی رہیں پر لیتا ہوا تھا۔ ایک دوبار حضرت صاحب نہیں تشریف  
گئے تو ان کے لئے کڑی کا بنا ہوا پائیدان ملندہ سے مہیا کیا گیا جلسہ سالانہ بھی خوب ہوتا تھا۔ کچی بیرئیں  
بنیں۔ ان پر سرند کی چھت ڈالی جاتی۔ ایک بار ہمیں یاد ہے کہ ایک بیرک میں اچانک آگ لگی اور  
دیکھتے دیکھتے ساری بیرئیں اس کی زد میں آگئیں شنگ سرند کی چھتیں اور اندر والی چشم زدن میں  
ساری چھتیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ خدام نے تنگ و دوکر کے آگ بجھالی۔  
گلے روز پھر چھتیں ڈال دی گئیں جلسہ کا ختام جاری رہا۔ ہم نے شعلوں کی پکتی رہا نہیں، کیجیں تو بہت  
خوف آیا مگر کام کرنے والوں کے حوصلے بند تھے کوئی ریہ و فرق نہیں پڑا۔ بعد وجہ سامانہ کے موقع پر  
چینٹ یا سر ہوا، ہکی میڈیکل کینیٹوں سے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کا ریتا منگوئی جاتیں اور جسے کہہ انوں  
میں ربوہ میں موجود رہتیں ہم نے کبھی انہیں استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہی رہا اللہ تعالیٰ نے  
اس جماعت کو ہمیشہ ہر قسم کی آگ سے محفوظ ہی رکھا ہے۔ الحمد للہ۔ ڈاک خانہ بھی ایک کچی عورت میں  
تھا اس میں پوسٹ، سڑا ایک صاحب برج لال شا تھے ہم لوگ حیران ہو کر تے تھے کہ یہ عیسائی ہو کر

شہ کوں کہتے ہیں؟ پھر سوچو برادر شاہ کی طرح کے شہاموں کے بارے میں تحقیق آئی تھی صاف  
 سترے کپڑے پہنتے۔ حاجی رنگ کی زین کے کپڑے۔ سر پر سیاہیٹ۔ میاں نور احمد صاحب جب  
 روہ کی نوٹیفیکیشن ایریا میں گئی کے کرتا دھرتا تھے۔ کبھی کی طرف جاتے تو برن۔ ل شہ صاحب ہیٹ اتار کر  
 نہیں سلام کیا کرتے تھے۔ کبھی کا ایک دو کمروں کا دفتر ڈاک خانہ کے ساتھ ہی تھا۔ اپنے حاجی برکت  
 بند صاحب جدوڑوہ کے پوسٹ آفس میں آئے یا شاید اس وقت بھی موجود ہوں ہمیں علم نہیں۔ حاجی  
 برکت اند صاحب کے ایک صاحبزادے مطیع اللہ درو تھے اور دوسرے رفیع اللہ ٹیلیفون کے ٹکڑے میں تھے  
 اب بھی شاید ہوں۔ حاجی صاحب بھی ریٹائر ہونے کے بعد ایک سب پوسٹ آفس بنا کر کام میں  
 مصروف رہے۔ معلوم نہیں حیات میں یا گذر گئے۔ خوب آئی تھے عابد مولانا اور صاحب کے عزیزوں  
 میں سے تھے یا بھائی تھے؟ واللہ اعلم بالصواب۔ بسوں کا اڈہ دتوں قصر خلافت اور مسجد مبارک کے  
 پاس رہا جہاں گھاس کے سرسبز دشا ب قطعات کے دائیں بائیں واں سڑکیں ملتی ہیں۔ ایک کونے پر اڈہ  
 تھا دوسرے کونے پر مہمان خانہ۔ در الضیافت بھی اب نئی جگہ پر بنا ہے پیسے اڈہ کے عین ساتھ تھا ب  
 جہاں مسجد مبارک کے محن کے آگے کا وسیع میدان نظر آتا ہے یہاں مہمان خانہ تھا کہ مہمان بس سے  
 اترتے سیدھے مہمان خانہ میں پہنچیں۔ مسجد مبارک وال گیت بھی بعد کو بنا ہے جب حضرت صاحب پر  
 قاعدہ حملہ ہوا اس کے بعد۔ حضرت صاحب پر قاعدہ حملہ ہوا تو غائبانہ طور پر عصر کی نماز کا وقت تھا۔ ایک  
 شخص خدا معلوم کس طرح عین حضرت صاحب کے پیچھے نماز میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک تیز چاقو اپنی  
 چادر میں چھپ رکھی تھی۔ یہ بے داروں کو اس کی حرکات پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ نماز کے دوران یا نماز  
 پانے کے بعد جب حضرت صاحب جگھے ہوئے تھے رکوع کی خاطر یا جوتے پہننے کی خاطر اس شخص نے  
 میں گراں پر چاقو سے حملہ کر دیا چاقو گردن میں گھرا پیوست ہو گیا۔ خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔  
 ہمارے سکول کے پٹی ٹی ماسٹر، سرنامہ نقی صاحب اتفاق سے اس وقت موجود تھے آپ نے پک کر  
 حملہ آور کو قہقہہ کیا۔ اس کے سارے کپڑے حضرت صاحب کے خون سے سرخ ہو گئے۔ بہر حال حضرت  
 صاحب اندر شریف لے گئے۔ اس قاتلانہ حملہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ سب لوگ  
 قلعہ خلافت کی طرف لپکے۔ حملہ آور کو قہقہہ کیا تو حضرت صاحب نے فرمایا اس کی پوری حفاظت کریں

وہاں تھیں۔ شبہ یہ ہے کہ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت قسمت ٹھیکس و تیکس کر کے اس کی خدمت  
 دینی کر دی ہے۔ ہمیں اتنا یاد ہے اس وقت حضرت صاحب کا ایک بیٹا حضرت کے نام پر چھارہ سال کا تھا  
 بعد و غرض میں بھی چھپا اس درونک بیٹے میں بھی حضرت صاحب نے یہی کہا تھا کہ حضرت کو حوصلہ  
 مندی کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ بیٹے کی ساری باتیں تو اس وقت ذہن میں نہیں تھیں مگر  
 اس کا لب باب یہ تھا کہ اگر تو میرا وقت مقدار آ گیا ہے تو جماعت کو حوصلہ کے ساتھ جماعت کے کھام کے  
 ساتھ رہتے رہنا چاہئے کیونکہ خدا کو تو بہرحال مرنا ہی ہوتا ہے جماعتیں نہیں مریں گیں۔ میں یہ ساری  
 تفصیلات چنی یادداشت کے زور سے لکھ رہا ہوں اس لئے ہو سکتا ہے حضرت صاحب کے بیٹے کے اصل  
 الفاظ سے کچھ اختلاف ہو لیکن اتنا یقین ہے کہ ان الفاظ کا یہی مطلب بننا تھا واللہ اعلم بالصواب۔ ربوہ  
 دلوں کے لئے خاص طور سے وہ وقت بڑا اثر اوقات تھا۔ ہمیں یاد ہے حضرت صاحب کی رحلت کے بارہ  
 میں روز بیٹن شائع ہوتے تھے۔ دعاؤں کی تحریک سوتی تھی اور لوگ رو رو کر دعائیں کرتے تھے۔ ساری  
 جماعت از حد بیقرار تھی۔ ربوہ کے درود یوں سے ادا کی جاتی تھی۔ حضرت اس جان کی وفات کے وقت  
 جو نظر رو دیکھا تھا، وہی کیفیت سامنے آ رہی تھی مگر اللہ کا فضل ہو، اور حضرت صاحب ٹھیک ہو گئے  
 اگرچہ اس زہریلے چاقو کا اثر اعصاب پر پڑا اور یہ ربوہ برس بعد جب حضرت صاحب کا وصال ہوا تو  
 بھی یہی جانا گیا کہ اس قحطی نے حملہ کا اثر جسم اور اعصاب پر باقی ہے۔ حملہ آوروں کو قدامت کے جرم میں پانچ  
 یا چھ برس کی قید ہوئی۔ اس وقت ساری جماعت کو احساس ہوا کہ امام کا وجود جماعت کے لئے کیا ہوتا ہے؟  
 حضرت صاحب نے تقریباً نصف صدی تک جماعت کی رہنمائی فرمائی۔ اس عرصہ میں دو ٹیلیں پیدا ہوئیں  
 بڑی ہوئیں اور جوڑی بھی ہو گئیں اس لئے حضرت صاحب کا وجود ہی جماعت لگتا تھا انہی دنوں ایک  
 فقہ و مفتین بھی جماعت میں برپا ہوا۔ اس فتنہ کی باگ ڈور تو بعض بڑے مفتین کے ہاتھوں میں تھی مگر  
 ان لوگوں نے چھوٹوں کو آگے کر رکھا تھا۔ اس فتنہ کی سرکوبی کا حل بھی ہمیں خوب یاد ہے۔ ایک روز  
 اچانک اخبار الفضل میں احسان پڑھا کہ جماعت اللہ رکھا اور اس کے ساتھیوں سے بیزاری کا احسان  
 کرے کیونکہ یہ لوگ جماعت میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ساری جماعت چونک گئی کہ یہ اللہ رکھا کون  
 ہے اور جماعت میں فتنہ کیوں پیدا کرنا چاہتا ہے؟ جماعت نے پورے خلوص اور اتحاد کے ساتھ ہمدردی

کے نامزد واری اور اعانت کا عہد کیا۔ عہد کو یہ جان کر دیت سوئی کہ اس فتنہ میں حکومت کے فضل  
 و عہد سے اس فتنہ کا نتیجہ کیا اس سے بدعت کو یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اس کی قیادت سے زیر  
 و رلوبو ہزم امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس فتنہ کے بعد خدام اور اہلکار اور انصار کے عہدوں میں امام وقت  
 کی ہر معروف امر میں اطاعت کرنے کے سناظ مشل کے گئے۔ پہلے یہ غلام صورت میں موجود نہیں  
 تھے۔ ہم لوگ محلہ الف سے اٹھ کر محلہ دارالرحمت، مٹی والے مکان میں آ گئے۔ ساتھ چو پھرتی کا ایک  
 کمرہ کا مکان تھا اندر سے صحن ایک ہی تھا اس نے باہر سے مکان بڑا لگتا تھا ہمارے اپنے گھر میں تباہی  
 محمد خاں امی ابا تین نہیں تین بھائی سب کی سوتی تھی۔ پھر دوسرا کمرہ بنا۔ اس وقت ہم شاید ایف اے کا  
 امتحان دے رہے تھے۔ ربوہ میں بجلی آ گئی تھی مگر ہمارے گھر تک نہیں پہنچی تھی بجلی کے ٹکڑے میں کمرہ  
 زہان صاحب تھے اب ان کی اولاد جرمنی میں پہنچی ہے۔ سید سجاد حیدر شاہ صاحب تھے ان کی اور ابھی  
 ہماری شاگرد ہوئی۔ نعیم حیدر کسی ڈائجسٹ میں کام کرتا تھا خدا معلوم کہاں ہے اور کہاں ڈائجسٹ ہو گیا ہے  
 اس کا ماموں سید رشاد علی شاہ ہمارا کلاس فیو تھا۔ اس کے نانا سید سمیع بخش صاحب ہمارے استاد  
 تھے۔ اسے بخشے خوب آدمی تھے۔ خدا خدا کر کے بجلی ہمارے گھر تک بھی پہنچی مگر صرف روشنی کے لئے  
 استعمال میں آتی تھی۔ پچھلے چارے کا رواج بعد میں آیا پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے گھر میں اڑکنڈہ بشر  
 بھی لگے۔ مگر وہ وقت بھی نڈر ہی گیا۔ ربوہ میں بجلی کی وہ آکھ بھولی رہتی تھی کہ پناہ بخدا پہلے پہل میں  
 مظفر احمد صاحب نے اصرار کر کے حضرت مرزا بشیر احمد کے ہاں اڑکنڈہ بشر لگوایا حضرت میاں صاحب  
 نے واپڈا کے احمدی جنرل مینجر چوہدری عبدالحمید صاحب کو ایک خط لکھا چونکہ ہم اس خط کے کاتب ہیں  
 اس لئے میں یاد ہے لکھا تھا ”میرے کمرہ میں عزیزم مکرمرزا مظفر احمد نے اڑکنڈہ بشر لگوادیا ہے اگر  
 بجلی کی کمی بیشی کی وجہ سے اسے کچھ بڑا تو ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی“۔ ظاہر ہے یہ خط تفلن کے طور پر  
 لکھا گیا مگر وہ اڑکنڈہ بشر تو سواپڈا کی دست برد سے محفوظ رہا۔ ہمارے اپنے تجربے میں یہ بات  
 آئی کہ ہم واپڈا کے ڈائریکٹرنس کے کمرہ میں بیٹھے تھے کہ چٹک بجلی چلی گئی اور جاتے جاتے ڈائریکٹر  
 صاحب کے اڑکنڈہ بشر کی جان بھی ساتھ لیتی گئی۔ بجلی تو آ گئی اڑکنڈہ بشر صاحب دوبارہ زندہ نہ کیا جا



ملک عربی صاحب کو بھی قریب تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ پیسے اور ہو گئے۔ دو چار چائیں بھی تلف ہوئیں۔ ہم نے وہاں بھی تو بہت خوف کیا وہاں سے آتے وقت تک نہ گئے۔ تیر دن خود اپنے آپ کو وحشت پیش کیا۔ انہی دنوں میں ہمارے ایک محلہ دار تھے ملک محمد اشرف صاحب غاہا بشیر سے دفتر میں کام کرتے تھے ۱۱ مئی کو جاتے ہوئے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کی کسی بس میں سفر کرتے ہوئے حاکم کا شکار ہونے اور جل جہنم کی۔ ہمارے ساتھ دو قیعت نہیں تھی مگر ہمارے یہ ملک فضل علی کے عزیزوں میں سے تھے۔ مدد بخشنے روہ کے غاہا پیسے باشندے تھے جو بس کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ روہ میں ان کی حادثاتی موت کا بہت چرچا رہا۔ ان دنوں بسوں کے حادثات غیر معمولی سمجھے جاتے تھے آج کل تو حاشے زندگی کا سموں ہیں ورسل میں ہزاروں دگ ان کا شکار ہوتے ہیں۔ ملک فضل علی کا ذکر آئی تو اپنے زمانہ کے انجمن کے ساتھی کلروں کا خیال آ گیا آج بھی انہیں کلر کی کرتے دیکھتے ہیں تو اللہ کا شکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آزمائش سے جلد ہی نکال لیا۔ فضل علی ہماری طرح ہمارے ساتھ ہی کلر کی کے میدان میں تر تھا۔ بھیرہ کا رہنے والا نہایت با وفا دوست ہے۔ ہماری عمریں یک جہتی تھیں اس لئے ہمارا بارانہ بھی بہت تھا فضل علی کلر کی چھوڑ کر مونگ رسوں کے اور سرنگول میں داخل ہو گیا اور محکمہ انہار سے اسٹنٹ انجینئر کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر اب سعودی عرب میں کسی کمپنی میں کام کرتا ہے اس زمانہ کے ساتھیوں میں سے ارشد شاہد آفس سپرنٹنڈنٹ ہے۔ مولوی جمیل صاحب تو ریٹائر ہو گئے انجمن کے دفاتر پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو بہت سے لوگ اس زمانہ کے تھے ہیں مگر ان سے شش سالی کا سلسلہ نہیں تھا۔

حضرت میاں بشیر احمد صاحب کی وفات بھی ساٹھ کی دہائی کے شروع میں ہوئی۔ ہمیں یاد ہے ہم یونیورسٹی لائبریری میں بیٹھے تھے کہ ایک دوست نے حضرت میاں صاحب کی وفات کی خبر سنائی ہم سیدھے ۲۲ مئی کو رس روڈ پہنچے۔ ساری جماعت احمدیہ لاہور وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ کوشی میں مظفر احمد صاحب کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ حضرت میاں صاحب کا جنازہ اندر رکھا تھا لوگ ایک دروازہ سے دیدار کے لئے اندر جاتے دوسرے سے نکل جاتے۔ بیماری کی نوعیت کا تو ہمیں علم نہیں مگر اتنا سنا کہ بخار اتا تیز تھا کہ بار بار برف کے پانی سے جسم کو تر کرنے کے نہیں اترتا تھا اسی بخار میں آپ نے جاں دے

۱۔ بس صدمہ ہوا حضرت میں صاحب نے حمدی ہونے کے نام سے جو تعلق تھا ہوا قاضی اس  
 سے نہیں لیا تھا۔ اہم نے بھی دیکھا کہ اس کے سامنے میں یہ بات تھی کہ اس نے وہاں سے  
 ہمیں تعلیم کا شوق دینے میں نہ بہت ہاتھ تھا۔ جب ہی منہ دیا تو تعلیم کی ترقی کا پوچھتے رہتے۔  
 کاش ہمارے بیٹے کی سچی ڈی ہو جائے تک رہند رہتے تو انہیں تعلیمی خوشی ہوتی۔ انہیں اس بات کا شوق بھی تھا  
 کہ ربوہ میں ان کے سامنے میں پڑھائی کے تعلیمی لحاظ سے اس مرتبہ تک پہنچے۔ ماسور سے اس کا جواز  
 ربوہ دیا گیا۔ ہم بھی ایک ہی میں ساتھ آئے۔ اگلے روز ان کا جنازہ ہوا۔ حضرت مرزا ناصر احمد  
 صاحب پر نسیا تعلیم ہمد کا بنے جنازہ پڑھایا۔ ربوہ میں ہم نے یہ جنازہ جو حضرت مرزا ناصر احمد کی  
 مات میں پڑھا تھا یہی تھا۔ خلافت کے مرتبہ پر تو وہ ۹۶۵ میں فائز ہوئے۔ ربوہ کی ساری آبادی  
 ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی۔ کچے مکانوں سے کچے مکانوں کو گلیوں تک سب کے ہم چشم دید  
 گواہ ہیں۔ پہلے پہلے ربوہ میں ملک صاحب خاں صاحب نون نے اپنی خوشی بنائی۔ ملک صاحب خاں  
 صاحب نون اپنی کمشنر کے طور پر ریٹائر ہوئے تھے اور نہایت مکلف احمدی تھے۔ عمر بھر زینہ اور ان کی خواہش  
 میں گھٹنے رہے آخر اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا دیا ملک احمد خاں نون۔ مگر ملک صاحب کی وفات کے بعد وہ  
 ربوہ چھوڑ گئے۔ ملک صاحب خاں صاحب نون سرگودھا کے بڑے زمینداروں میں سے تھے۔ انگریز  
 حاکموں کا دستور تھا کہ وہ مقامی شرفاء میں سے بعض لوگوں کو انتظامی عہدوں پر متعین کیا کرتے تھے۔ ملک  
 سر فیروز خاں نون کے والد کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ملک صاحب کی کوٹھی ربوہ کی پہلی پہلی  
 کوٹھی تھی۔ ہم نے ملک صاحب کو ایک یہ دو بار دیکھا۔ نہایت متین اور سنجیدہ آدمی تھے مگر ہمیں اس رہنہ  
 میں ان سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا یہاں تک لکھا تھا کہ خیال آیا کہ اگر کوئی پڑھنے والے پوچھ بیٹھے کہ  
 شروعات میں آپ نے لکھا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ تک اس زمین میں نہیں تھا تو ہم اتنے مکانات اور کوٹھیوں  
 پر تعمیل کہاں سے بناتے چلے جا رہے ہیں؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟ ربوہ میں پانی کی یافت بھی عجیب  
 معجزہ ہے۔ جس طرح پہلی مسجد ہسپتال کے احاطہ میں مسجد یادگار کے نام سے کھڑی ہے اسی طرح پہلا  
 نبوب ویل البشری والے چوک میں پہلی منور احمد صاحب کی کوٹھی دے کوئے پر لگا تھا۔ یہ وہ جگہ ہے  
 جس کے بارہ میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کو بتایا گیا پادشاه کے نیچے سے مرے پانی بہ رہا یہ جگہ

دوست میں آئیں گی۔ شہزادہ کی جہت سے جس سے کسی اور ملک کے بادشاہ کو بھی کسی پانی  
 نہیں آیا صرف وہیں سے نہیں نکلا۔ وہ میں ہر جگہ سے مل گیا پانی نہ تھا تو آبائی گہر سے بولی گئی  
 پانی سرد میں اتنا ٹھیک تھا کہ بالکل سرد و محسوس ہوتا تھا اور پینے کے سے احمد گھر سے پانی مانا پڑا تھا جب تو  
 وہ شہزادہ کا مصفا پانی پیتے ہیں اور سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی زمانہ میں وہ پانی سرد ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ  
 پانی کی کمی کم ہوتی گئی اور نہیں ملتا تو پانی کا پانی بچنے کے قابل ہو گیا۔ شہزادہ رحمت دہلی  
 کا پانی شروع سے ہی بہت ٹھیک تھا۔ اب بھی ہے مگر دارالصدر کا پانی اب بھی اب پینے کے قابل ہو گیا ہے۔  
 اس وقت نکلے بھی بہت گہری پڑ چکر گئے تھے اس زمانہ میں قریشی فضل حق عبدغنی صاحبان نے بہت  
 محنت کی۔ اسی محنت کا صلہ اللہ تعالیٰ نے دیا کہ اب پورنگ کے سلسلہ میں اتنی گہرائی میں نہیں جانا پڑتا۔  
 پھر جنوب و مل گئے۔ کالج کی عمارت بنانے کا مرحلہ تھا مگر کالج کے احاطہ میں یا کالج کے قریب پانی کا نام و  
 نہ نہیں تھا۔ اس سے کالج کا جنوب و مل دارالاحصوم میں جا کر کا دیں جہاں آس پاس میں ہمارے  
 دوست جسٹس محمد سلام بھٹی صاحب کی زمین تھی۔ پانی اتنی دور سے مانا پڑتا تھا مگر کام نہیں رکا کرتے ہیں  
 کالج کی عمارت کی کالج ابور سے روبرو منتقل ہوا۔ ہوٹل میں کئی سولہ درجے تھے سب ہی پانی کے  
 سلسلہ میں مطمئن رہے۔ صرف یہ تھا کہ گھر میں اگر ذاتی نکلے پڑوگی پپ لگا کر پانی اٹھ کر غسلی نوں تک  
 پہنچا دیا جاتا تھا تو چائے بنانے میں آسانی رہتی تھی۔ قارئین حیران تو ہوں گے کہ یہ کیا شکر ہے؟ تفصیل  
 اس اجمل کی یہ ہے کہ ہم نے ڈوگی پپ سے پانی اٹھ کر اپنے گھر کے غسل خانہ تک پانی پہنچا رکھا تھا کہ  
 نہانے دھونے میں آسانی رہے۔ ہمارے ایک زندہ دل مہمان لاہور سے تشریف لائے ہوئے تھے  
 نہانے کے سے غسل خانہ میں گئے تو تھوڑی دیر کے بعد نوکر کو آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا گیا تو فرمائے گئے  
 نہانے کے سے ایک کپ اور چائے کی پتی لے آؤ۔ وہ اس مطالبہ پر بھونچکا رہ گیا۔ تو مہمان موصوف نے ڈانٹا کہ  
 جاتے کیوں نہیں میرا وقت ضائع کر رہے ہو؟ بیگم صاحب سے کہو چائے کی پتی اور ایک کپ دے دیں اور  
 بیچارہ بولنا خواستہ آیا اور ہماری بیگم تک مہمان موصوف کا مطالبہ پہنچایا انہوں نے ہمیں بھگایا کہ جا کر  
 مہمان کی خیر خیریت دریافت کریں کہ نہاتے میں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ ہم نے چائے کی پتی کی  
 پوچھی فرمانے لگے نہیں اب ضرورت نہیں رہی پانی ٹھنڈا ہو گیا ہے ورنہ شروع شروع میں اتنا گرم پانی لگا

تھا کہ میں نے سچا اس موقع پر اندہ تختہ کوٹنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی تکلیف سے بچ گیا۔ میں  
 گئی۔ سو جناب کا یہ پانی کا یہ نام ہی رہا ہے۔ اب تو ہمیں پانی ہے۔ درباری، میر میں غنڈا اسی ہو  
 جاتا ہے۔ راجہ کے، شہزادے، اس درباری عورتوں کا انداز نہیں کر سکتے۔ مگر یہ سراسر مسدودیا کو حیران کر  
 دیے کے لئے کافی تھا کہ وہ جڈ جس لوگ ہر روز یہ خرچ کرنے درباری وقت میں تیار ہوتے  
 کرنے کے باوجود پانی حاصل کر سکتے تھے۔ اس جماعت کے پاس یہ نسخہ تھا کہ جھٹ پانی نکل آیا۔ نسخہ تو  
 ہمیں بھی معلوم ہے مگر ہمارے کوئی نہیں چاہتا کیونکہ وہ نسخہ ہر ایک کے کام نہیں آتا۔ اس نسخہ کی تیرہری میں  
 رتوں کی دھنیں درخشاں کا تھڑا شل کرنا پڑتا ہے۔ یہی اجزاء آجکل نایاب ہو رہے ہیں۔ پانی کے  
 مسدود میں کافی دقت بھی رہی۔ گھر وں میں لکھے ہونے کے باوجود پینے کا پانی بعض خاص جگہوں سے ملتا،  
 پڑتا تھا مثلاً انجمن و تحریک کے وائزر جس جگہ واقع ہیں وہاں کا پانی پینے کے قابل نہیں ہوا۔ ان لوگوں کو  
 زندہ پیسے خرچ کر کے سٹھ ملوانا پڑتا تھا جو دارالرحمت سے پانی ڈھونڈتا تھا۔ اس وقت پینے کے پانی کی قدر  
 ہوئی پھر جن محلوں کا پانی ٹنکین تھا وہاں یہی لم بھی تھا کہ پانی میں نمکیات کی کثیر مقدار شامل تھی ہم مذاق  
 میں کہا کرتے تھے کہ حکومت انہی توانائی کے سلسلہ میں خواہوا۔ ”بھاری پانی“ کے مہیا کرنے میں  
 اتنی تک دودھ کر رہی ہے ربوہ سے پانی ملگا لے۔ بھاری پانی کا مسئلہ حل ہو جائے اس پانی کی ایک اور  
 خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس پانی سے نہانے کے بعد بالوں کا میل وغیرہ نکل جاتا تھا مگر خود پانی نہیں ہٹتا  
 تھا۔ پانی کے سرے اجزاء بالوں کو یوں گھما چھبنا دیتے تھے کہ امان والی لفظ۔ مگر اس سب کچھ کے  
 باوجود ربوہ آباد ہوا پانی کی فراوانی ہوئی سترہ بھی ہو گیا جہاں ایک تنکا نہیں آتا تھا وہاں گلشن احمد زمری  
 کے اشتہار سے لفض میں شائع ہوتے ہیں۔ زمین گل و گل زار ہو گئی ہے۔ گھروں میں پائیں باغ کا  
 رواج بھی ہو گیا ہے۔ کالج کا نیا کھمبے تو نسبتاً زرخیز زمین پر قائم ہوا ہے وہاں روئیدگی تھی مگر وہاں  
 امرودوں کا باغ لگانے کا کوئی نہیں سوچ سکتا تھا۔ امرودوں کے باغ لگائے سے ایک امرود بیجے دایا دسیہ  
 اس نے کالج کے مردوں کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ ادھر کوٹ میر شاہ کی طرف ایک امرودوں کا باغ تھا۔  
 اس نے کالج کے امرودوں کو کوٹ میر شاہ کے مردوں سے تمیز کرنے کے لئے غروا بیج دیا تھا۔ کہا کرتا  
 تھا ”لوئی یونیورسٹی کے پڑھے لکھے مرد“۔ کالج کے لئے کھمبے کو زبان خالق نے ہمیشہ یونیورسٹی ہی کہا

ان صلی شاہ دہندہ سوئے ہے۔ کچھ تو یہ کہہ سکتا ہے تو اس سے وہ بڑی بات کہہ لیتے۔ حیرت انگیز تھی۔

بہارِ ہند - ۵۷

روہ میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ سراسر ایسی جادوئی رہا جس کی وجہ سے وہاں کے لوگ اس زمانہ میں حکیم انصاری صاحب دارالشفیاء کے گھر میں حکیم صاحب سب سے زیادہ شریف و کرشمہ مند تھے۔ انہیں بہت دلچسپی اور دلچسپی تھی کہ ان کا صاحب دارالشفیاء بہت تھا۔ ہاتھ میں یہ کھونڈ بھی رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میں ان کے موصوفے پر آج کر رہے تھے حکیم صاحب ہایت احترام سے انہیں کھانا لے دیا کرتے تھے کسی نے کہا یہاں فقیروں کو کھانا دیتے رہے گا تو سارے علاقہ کے فقیر اپنے اپنے شکلوں سے آ موجود ہوں۔ حکیم صاحب سراسر فرمایا "یہ میری کھونڈ اس مرض کی دوا ہے" مگر ہم نے کبھی نہیں کسی فقیر کو جھڑکتے دیکھا انہیں سے انکار کرتے نہیں دیکھے۔ فرماتے تھے جس کا فکر ہے اس نے یہی طریق رکھنا تو میں کون ہوتا ہوں اس کو بد نہ دیا اور انصاف میں مہمانوں کی رہیں ہیں رہتی تھی۔ صبح کے وقت کھانے میں اس وقت کہ یہ شہم گوشت ہوتا تھا۔ یہ طریق پر تھا اور خدا مظلوم کسب سے چھ آتا تھا صاحب کا ان رہا تھا حضرت میں ماضی میں صاحب سب سے بڑی پر رات جلدی جلدی کھاتے اور کچھ پہنچ جاتے تاکہ کچھ کے کام کی گھرائی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ میں وہ ایک بار انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ خاموشی سے آتے والی روٹی جو کچھ میسر ہوتی کھاتے اور یہ جادو ہے ایسا ہی ہم نے جلسہ سالانہ کے موقع پر مرزا احمد صاحب کو دیکھا تو پر ٹیٹھے روٹی اترتی دیکھ رہے ہیں۔ ایک روٹی کھا رہے ہیں سانس کی پوائیس آ کر کسی نے سانس نہ رکھ دیا تو فقیر اس میں ڈال دیا اور وہ روٹی کھا کے چلے گئے۔ گھرائی بھی ہوئی نمونہ بھی چکھ لیا ایک پختہ دکان۔

دارالشفیاء نئی عمارت میں منتقل ہوا تو مرزا اعظم ایک صاحب اس کے گھر سے بنے۔ یہ بزرگ روہ کے ماحول کے نہیں تھے کہیں باہر سے تشریف لائے تھے اس لئے زیادہ دیر نہیں گئے اب تو منور جاوید صاحب نے خواب کا سہنجال یہ سے حال کا مہم پورہ میں جہاں سے تشریف لائے ہیں ریوے و رکشہ تو موجود ہے مگر زندگی ٹریٹنگ کا کوئی بندوبست نہیں ہے یہ نہیں اتنا تجربہ ان سے لے آئے کہ اس عالمی شکر و نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ خدوم تھے تو گنج مغلپورہ کی مجلس کی وجہ سے بہت معروف تھے ہم سمجھ



## خاموش علماء

وہی کا دستور ہے کہ ہر سال میں یہ علماء موجود رہتے ہیں جو اپنی خاموشی یا فطری خواب کی وجہ سے سامنے نہیں آتے مگر اپنے اپنے میدان میں مکی خدمات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ان کی حیثیت نکل یہ روں کی سی ہوتی ہے جو سامنے نہیں ہوتے مگر مشین وقت بہم پہنچاتے رہتے ہیں ان میں سے کسی کل پرزے کو نقصان پہنچ جائے تو ساری مشین کی قوت متاثر ہوتی ہے۔ انسانی تمدن کی ترقی و این خاموش طبع عالموں کی رہیں منت رہی ہے۔

میں نے قادیان میں درویش بنش یہ عالموں کو دیکھا۔ ان سے حسب عمر و استطاعت استفادہ کیا جو بڑے باکل خاموش بیچتے تھے مگر بہ باطن طبع کا حربہ کراں تھے۔ اپنے گھر میں حضرت مولوی غلام نبی مصری کا دوسرا سنے تھا۔ آپ نہایت مسکین طبع خاموش طبع عالم تھے۔ عربی میں ان کا کھ مستند سمجھا جاتا تھا مگر کبھی حوان کے منہ سے نہ غری کی کوئی بات سنی ہو۔ نہیں وہ تو یہ عالم الطبع تھے کہ ہم بچوں میں سے کسی کو کسی بات پر روشنی بھی کرنا پڑتی تو گھبر جاتے۔ قادیان کے مدرسہ احمدیہ میں استاد تھے اور حضرت ضیاء المسیح اس کے خاص ان خاص شائروں میں سے تھے ان کے شاگردان کے حرام میں بچے جاتے تھے مگر پھوپھو جی کہ ہاری پھوپھی بیگم جی اس کے عقد میں تھیں ان سے بھی بڑھ کر ان سے تواضع سے پیش آتے تھے۔ کوئی شاگرد فرط ادب سے آنکھیں جھپکا کر بات کرتا تو آپ فروتنی سے اور زیادہ جھک جاتے۔ زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی ہاں یہ میں جواب دیتے۔ ہاں کسی مسئلہ پر تفصیل بیان کرنا درکار ہوتی تو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر تفصیل بیان فرماتے۔ مگر میں یہ گھر سے باہر ہم نے ابھی نہیں کسی بات پر بر افراد سے ہوتے نہیں دیکھا۔ عربی زبان ان کا تخصص تھا کہتے بھی عربی رسم الخط میں تھے مگر عربوں کے بر عکس اس کے کلام میں جامعیت تو ہوتی تھی مبالغہ نہیں ہوتا تھا۔ اختصار ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ مقلان و ذل۔

حضرت مولوی غلام نبی مصری اپنے شائروں کو اپنی اوار کی طرح چاہتے تھے ان کی بہبود کا خیال رکھنا



اس کے سے ہوا تھا کہ نہیں کرتے رہا۔ مگر صحت مریض صاحب بخونہ رئیس میں وچو پوجی سے صاحب  
 "تقیدت تھی" سے حدیث کا اس بھی کیا کرتے تھے رئیس تھے مگر وہاں سے تھے میں سے تو مری  
 یہ روپانی پر بیٹھ کر درس دیتے ہیں۔ ملک صاحب نے بارہا میں فرمائی کہ وہ ہیں۔ پھر چوچی نے صاحب  
 یتردی سے ان کی صحت کے لئے دعا میں کہیں کہ بہت رشک کیا کرکے ہمارے ہاتھ نہیں کہ ملک  
 صاحب میرا کبھی آدمی میں اس لئے پھوپھو جی ان کے لئے کہتی یتردی سے دعا میں کہ رب میں مگر کچھ  
 عرصہ بعد کہ دین سے ملک صاحب مدین صاحب کی طرف سے دعا کی درخواست کی تو ہم نے ایکھا کہ  
 ملک صاحب المدین صاحب کی صحت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ اپنا اور تفرغ سے دعا میں کہ رب سے  
 میں۔ تب اندازہ کہ ان کے دل میں سارے ہی شاعروں کے سے محبت کا ایک خاص گوشہ اور  
 جب کسی شاعر کو یہ پڑتے ہیں تو اس کی صحت کے لئے دل و جان سے مدد فرما کر دعا میں کرتے ہیں۔  
 ستر اپنے شاعروں کو دروس بھی کیا ملتا ہے؟ اور جن شاعروں کو ایسے سنا دھیب ہو جائیں اور انہیں  
 چاہئے بھی کیا؟ چھوٹے منہ بڑی بات ہے مگر ہم نے اپنے شاعروں سے محبت کرنے کے قرینے حضرت  
 پھوپھو جی سے ہی سیکھے ہیں۔ ورنہ ہم کیا ہادی استاد کی کیا؟ قاری والوں کا کہا تو ہمیں یاد ہے دوری  
 ادیب گروہ مزہ دھسکتے۔ جو ملک آدو و فضل گریز پائے رہا۔ مگر بات صرف ملک محد و انہیں  
 رانی چاہئے۔ حضرت پھوپھو جی نے اپنے شاعروں سے تعلق کو زندگی مگر کا تعلق بنایا و رہی بھی سمجھ کر نہیں۔  
 ان کی "خبری پوری کے دوران ہم۔ ان کے شاعروں کو جس طرح یتردی کے ساتھ ان کے سے  
 دعا میں کرتے دیکھا اور توش کا اظہار کرتے دیکھا وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ ایک کمرہ کا چھوٹا  
 سا مکان تھا۔ لوگ آتے۔ ہر ایک سے حال پوچھتے و دعا میں کرتے وہاں چلے جاتے۔ پھوپھو جی آخر  
 وقت تک سوش میں رہے اس لئے جس جس کے بار میں انہیں اطلاع کی جاتی کہ وہ عیادت کے سے  
 حاضر ہوئے تھے تو بہت ممنونیت کا اظہار کرتے اور بہت دعا میں دیتے۔ دعا ان کا خاص وصف تھا۔ ان  
 کے سب بروقت ذکر بھی سے تر رہتے تھے۔ ان کی وفات پر معلوم ہوا کہ تہ بڑا و ربرگ ماہر دنیا سے  
 اٹھ گیا ہے۔ موت العالم موٹ العالم۔

راہل اس مضمون میں ایسے علماء کا ذکر کرنا مقصود ہے جو شیخ کے آدمی نہیں تھے یعنی تقریر کے مرد میدان

ضمیمہ تھے۔ ان کے پاس دو سو روپے نقد تھے جس طرح وہ مقررہ رقم کا ہوتا ہے۔  
 ۱۸۷۰ء۔ اب اس وقت میں مددگار بن گیا کرتے تھے کہ ہر دو دن کو یہاں بیٹھتے تھے۔ ایک بار مولانا  
 حنین صاحب نے اپنی جہت ابھی سے کہنے سے آپ جہت احمدیہ کے جلسہ سالانہ پر تقریریں نہیں کرتے؟  
 ان کے کہا میں شیخ کا آدمی نہیں ہوں۔ مسئلہ صاحب نے آپ کے ٹرپ کے مسئلے میں وہ خوب تقریریں  
 کرتے تھے۔ بانی نے کہا درست مگر جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسے میں اور چھٹنگے کے جلسے میں  
 بہت فرق ہے۔ جلسہ سالانہ کا شیخ ایک مجلس سے جو اس سلسلہ کے علماء جماعت کا علمی موقف دینا کے  
 سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہر لوگ دیہاتیوں کے طور طریقوں سے دیہاتیوں تک پیغام پہنچاتے ہیں اور  
 بس۔ سلسلہ احمدیہ میں غرض اس وقت تک جو شیخ کے آدمی نہیں تھے مگر سلسلہ کے لئے ان کا وجود  
 اسی طرح لاپرواہ تھا۔ حضرت حافظ مختار احمد شاہ جہاںپوری نے بوسے عالم تھے مگر شیخ کے آدمی نہیں تھے۔  
 اگر کہیں جو ان میں شیخ پر تقریر کی ہو تو وہ عام بے ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ ہم نے سلسلہ کے اکثر علماء کو  
 ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے دیکھا۔ یہ تو ہمارے بچے تجربے کی بات ہے کہ حضرت  
 مرزا بشیر احمد صاحب نے کسی مسئلہ پر حضرت حافظ صاحب سے راہنمائی چاہی اور ہمیں ہی خط دے کر بھیجا  
 حضرت میاں صاحب کا استفسار بھی ہم نے ہی نکھا اور حضرت حافظ صاحب کا جواب بھی ہمیں نے قلمبند  
 کیا۔ جماعت کے علماء میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ حافظ صاحب نے بڑے شرعی نہیں تھے بڑے  
 تجربہ عالم تھے۔ ایک بار سلسلہ کے کسی معاملہ نے حضرت بانی سلسلہ عابد احمدیہ کے کلام پر اعتراض کیا کہ  
 حضرت صاحب نے ”کہتا“ کی ترکیب باندھی ہے جو سراسر غیر فصیح ہے۔ ”اگ برہند سے نہ یہ ہوگا کہ  
 تاباندھے از را۔ ہم حاضر تھے۔ حضرت حافظ صاحب فرمانے لگے میں بتاؤ تو کس کس استاد شرعی نے  
 ”کہتا“ کی ترکیب باندھی ہے؟ ہمارا اس را علم غالب تک پہنچ کر تم ہو گیا کہ ”آکھ کی تصویر سنا ہے“  
 کھینچی ہے ”کہتا“۔ اس پہ کھل جائے کہ اس کو حضرت دیدار ہے۔ حافظ صاحب نے اس تذو شعرا رد  
 کے کلام سے اپنی یادداشت کے زور پر خدا جھوٹ نہ بلوائے ”تو بیسیوں اشعار ہمیں ایسے سنا دئے کہ لو  
 ان اساتذہ نے ”کہتا“ کی ترکیب باندھی ہے اور معترض نے کہا اپنے کو بڑا مستند و عالم صوفی جانتے ہیں  
 کتنا بودا اعتراض کیا ہے انہیں ان اساتذہ کے کلام کا علم ہی نہیں۔ اب ایسے وجود کہاں؟ مگر حضرت حافظ

صاحبِ حاشیہ مسمیٰ تھے۔ جنکو میری کہانیوں سے دوستی ہوئی تھی۔ میں ہامید نہیں تھا۔  
 حضرت صاحبِ دین، دستِ مہربان جیسی تھی۔ خود نہیں دے رہے تھے۔ ایک بار یہاں سے  
 حاضر تھے۔ حضرت حافظ صاحب کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑی۔ ان کا کمرہ کتابوں کا کہانہ خانہ تھا۔ فرمایا  
 میں اتنی تھیف گردوں کے سامنے کتابوں کا جو ذخیرہ ہے اس میں ساتویں یا چھٹے نمبر پر ایک کتاب پڑی ہے  
 اس کے صفحہ ۱۵ پر آٹھویں یا دسویں سطر میں ایک حوالہ ہے جو مجھے درہر ہے ذرا ہاتھ بڑھاؤ۔ ہم  
 حیران رہ گئے۔ حافظ صاحب کی بات باند تو ہے پاؤرتی کی تھی۔ حوالہ اسی مقام پر موجود تھا۔ آپ نے  
 ملاحظہ فرمایا۔ درپھر کتاب رکھ دی۔ دو ہفتوں کے بعد غرض سے اسی حوالہ کی ضرورت پڑی تو کسی اور مقام  
 پر رکھی ہوئی کتاب کا محل وقوع نہیں یاد تھا۔ ہم سمجھتے تھے ان کا کمرہ کتابوں کا کہانہ خانہ ہے مگر وہ تو کتب  
 خانہ کا۔ اس کتب خانہ کی ساری کتب، حافظ صاحب کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اسکی یادداشت ہم نے  
 بہت کم دیکھی۔ جاپان میں ایک ابراہیم بن کی یادداشت میں حضرت حافظ صاحب کی یادداشت کا یہ تو نظر  
 آیا مگر ان کا میدان ہی کتاب خانہ تھا۔ ہمارے شعبہ اردو کی، بریری اپنی نئی عبارت میں منتقل ہو رہی تھی۔  
 ساری کتابیں ایک ذخیرہ صورت میں بکھری پڑی تھیں۔ اتفاق سے جاپانی وی "ین ایچ کے" اور  
 کو کسی حوالہ کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے ہم سے استمداد کیا۔ ہم حوالہ دیکھنے کے لئے ابراہیم بن میں پہنچے  
 تو ساری کتابوں کے پشتے گئے اودے تھے۔ ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ اب کیا ہوگا؟ ابراہیم بن  
 سے رہ گیا۔ فرمانے لگیں کہ آپ کی مطلوبہ کتاب فلاں پشتے میں قدس نمبر پر پڑی ہے ہم نے دیکھا کہ  
 کتب موجود تھیں۔ یہ صفت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے مسدود احمدیہ کو ایسے عالم دے  
 رکھے تھے جو اپنی ذات میں چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ ہمارے مولانا دوست محمد شاہ کوئی کم حوالہ شناس نہیں  
 انہیں بھی ہزاروں حوالے زبانی یاد رہتے ہیں۔ ربوہ کے ہندائی دنوں میں ایک صاحب ابراہیم بن میں تھے  
 حکیم نام حسین خان بان کا نام تھا۔ وہ بھی کتابوں کے عاشق تھے۔

ایک خاموش عالم مولانا عبداللطیف بہاولپوری تھے۔ جامعہ احمدیہ میں استاد تھے۔ ہمیں ان کی خدمت میں  
 حضرت مولانا راجیکی صاحب نے ایک بار کسی کام کی غرض سے بھیجا تھا۔ مولوی صاحب راجیکی صاحب  
 کے گھر کے قریب (قریب کیا "مقرب" یعنی بالکل سامنے کونے پر) رہتے تھے۔ ہم گئے تو اس وقت

اس کتاب کی تصنیف میں مصنف تھے حضرت مولانا نیک صاحب کا بیٹا ستاؤ نور اس کی تفسیر کی  
مذہب کی بات یہ اس کے بارہویں صفحہ میں جیسے قوت نے بھی مرتبہ ۱۰۰۰ میں  
تبیعت میں یہی خاموشی اور مدت مزید تھی کہ اس میں بھی یہاں نہیں لکھا۔

جماعت کے خاموشی کا ذکر ہو رہا ہے تو خیال آ رہا ہے حضرت مرزا بشیر احمد در حضرت مرزا شریف  
احمد صاحب بھی تو خاموشی میں تھے کیونکہ یہاں مرگ بھی پہنچ گئی تھی۔ حضرت مرزا  
بشیر احمد صاحب کا ذکر تو ہم کئی جگہ کر چکے ہیں مگر حضرت مرزا شریف احمد صاحب کا ذکر خیر اب تک نہیں  
نہیں مولا جانکہ اس سے تو قادیان کے زمانہ سے تعلق تھا بلکہ ان سے تو ہمارا آباؤ اجداد کے زمانہ سے  
تعلق تھا۔

ہمارے دادا مولوی محمد فضل خاں سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہوئے تو قادیان میں آجے۔ ابھی خاصی  
زمیندار کی تھی۔ زمین غائی پردہ کی اور حبیب پر دھونی رہا کر بیٹھ گئے در حضرت مرزا شریف احمد  
صاحب کے دربان ہو گئے۔ ہمارے دادا محمد خاں حضرت نواب مہارک بیگ صاحب اور حضرت نواب مہارک  
الحفیظ صاحب کی کونٹھ کی در بانی کرتے تھے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو چاہا اور اللہ تعالیٰ نے کیا چاہا نہیں دیا وہ  
سب خاندان بانی سلسلہ کی در بانی کا حقد ہے۔ مگر الحمد للہ۔ ہمارے دادا نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے  
ایک سو میں برس کے قریب عمر پائی۔ ہم نے جب بھی انہیں اپنی ہوش میں دیکھا اپنے گھر میں ہم کے  
درخت کے نیچے چار پائی پر بیٹھے اور قرآن پڑھتے دیکھا۔ دادا جان کی رہائی معلوم ہو کہ حضرت میاں  
شریف احمد صاحب کی کونٹھ کی در بانی ان کے سپرد تھی۔ عمارت میں توسیع ہو رہی تھی جو دیواریں اس کے  
بارہ میں دادا جان کو خیال ہوا کہ اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے ٹھیک سے نہیں بنی۔ آپ نے حضرت بیگم صاحبہ  
سے ذکر کیا۔ فرمائے لگیں بابا فضل خاں "دیوار اتنی ہی کمزور ہے تو بھلا اسے ایک دھکے میں ر تو دو"۔  
دادا جان نے ایک ہی دھکا دیا تو سینٹ چنی ہوئی دیوار وہ جا پڑی۔ سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ حضرت  
میاں صاحب نے معماروں کو بلا کر دوبارہ دیوار بنوائی معماروں نے اعتراف کیا کہ واقعی دیوار کی تعمیر میں  
ان لوگوں نے پورا سینٹ استعمال نہیں کیا تھا۔ ایک اور واقعہ بھی ہم نے حضرت میاں شریف احمد زبان  
مبارک سے سنا کہ ایک بار کونٹھ میں ایک سانپ نکل آیا۔ سانپ کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ ہر طرف

وہاں شکیں ۱۰۱ جوں سے چھاپا ہوا معلوم ہوا اس میں ہے ۱۰۱ جوں سے ہمارے گھر سے۔ اس سے دس سال پہلے دیکھوں کی دیکھوں نے گا یہاں ۱۰۱ جوں سے کسی۔ اس سے اس صاحب کے لڑائی کا قصہ دیکھا اور صاحب کو کھمراہ کہ اس حلقہ میں سمجھ کر بیٹھ جائے۔ دو بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے سرزنش فرمائی اور باخبر رہ کر سندوں بزرگوں کی ۱۰۱ کو تنگ نہ کرنا۔ یہ بہرہ کرنا آپ کو چھپے جانے کا حکم دیا پھر اس کو شکیں میں بھی کوئی صاحب نظر نہیں آیا۔ مہینے کے گھر میں یوں نصیحت چرتے تھے جیسے ہمای گھر سو راولہ میں حضرت مرزا شریف احمد صاحب اصداق وارث دار کے نظر تھے۔ ہم انجمن کے کمرے ہونے کے باوجود حضرت میاں صاحب کے دلت میں کام نہیں کرتے تھے مگر میاں صاحب کو خاموشی سے آتے جاتے دیکھتے رہتے تھے دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھ کرنا۔ حضرت میاں صاحب نہایت کم گو آدمی تھے۔ دفتر کی طرف سے ہوئے مئی ہاں نہیں دیکھا مگر خاموش اور خود پنی ذات میں گمن۔ یہیں چن انہیں بہت پسند تھا۔ اس زمانہ میں آپ دار احمد سے یعنی اپنے گھر سے بیٹے اور خلیفہ صلاح مدین صاحب کے گھر متحدہ رہیں یہیں کبھی کبھی سائیکل پر جاتے تھے۔ پاؤں حوال میں آتے جاتے مگر چہرہ پر رونا نہ ہوتی۔ خلیفہ صلاح الدین صاحب سے ان کی کاڑھی چھٹی تھی۔ دونوں دوست پہروں ٹیلے ہاتھ کرتے رہتے۔ دونوں میں کیا گفتگو رہتی ہوگی معلوم نہیں کیونکہ ہم نے انہیں گفتگو کرتے نہیں سنا۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے دونوں دوست خاموش بیٹھے یک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہوں۔ اس بات کو بھی محبت ان سے سمجھا جاتا ہے کہ آئیے، میں خاموش ایک دوسرے کو سنتے رہنا۔ جب بے تھکنی اور محبت سے اس کے پہنچ جائے تو باتیں کرنے کو وہ بھی یہاں جاتا ہے ۱۰۱ ہم نے حضرت میاں شریف احمد صاحب کی اس خاموش محبت کا دور سے ہی نظارہ کیا ہے۔

یک بار خلیفہ صلاح مدین احمد سے ملنے کے لئے ان کے در دولت پر حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ہم کسی سال کے لئے کوئی مضمون لکھ رہے تھے فلسفہ کی کوئی بات تھی جو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کسی نے بتایا کہ خلیفہ صلاح مدین صاحب فلسفہ کے عالم ہیں ان سے رابطہ کرو۔ چنانچہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسئلہ حل ہو گیا مگر خلیفہ صاحب سے بے تکلفی نہ ہوئی کہ پھر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی جسارت کرتے۔ ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب دقعتاً بڑے عالم آدمی تھے مگر خاموش و روشہ



سے ہوا۔ قہدمولی صاحبہ بیمار ہیں اور ہسپتال میں ہیں۔ وہ ایس سوے سے تو ہمارے تاکید "کی کہ ب نہیں کو سہتا میں جا کر تک نہ بچے کا کیونکہ اس نے نہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔ اس پر وہ رکی نہیں گئی۔ آپ نے مجھے بھی پچھا نہیں؟ میں امتہ الباسط ہوں ملک مبارک احمد صاحب کی بیٹی۔ اب باسط ہمارے ہاتھوں میں پل کر جوان ہونی تھی اور کچھ روز پہلے ہم نے سے اپنے ہاتھوں رخصت کیا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر ہم بہت شرمندہ ہوئے۔ ہم نے بشیر اکبر بیٹی اندر آدھ مولوی صاحب کی بیگم سے ملو ہمارے گھر دوں سے پیرو۔ مگر اس کے میاں اتنے ناراض ہو گئے تھے کہ انہوں نے اندر تاپسند نہیں کیا باسط بیٹی ہمیں اس بات کا بہت فسوس ہے۔ ہم کب سے یہ بوجھ اٹھانے پھرتے تھے کہ تم سے منہ سو تو اس "گستاخانہ تاکید" کی معافی مانگیں۔ ملنا تو نہ ہوا۔ اب اس کے ابا کا ذکر آ گیا تو اپنے سر کا بوجھ اتار رہے ہیں۔ امید ہے امتہ الباسط اور اس کاموں ہماری کوتاہی سے صرفہ نظر کریں گے اور معاف کر دیں گے۔ اب تو وہ ماشاء اللہ آل اولاد والی ہوگی۔ لہذا اسے خوش رکھے۔ بعض اوقات ایک ذرا سی بات کتنے بچہ تروے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ (بچھے سال ہم نورتنو میں حمدیہ بوڈ آف ٹیس کی عمارت کے سامنے کسی کے انتظار میں صوف میں بیٹھے تھے کہ امتہ الباسط دور سے ہمیں پہچان کر آئی اور سلام کیا۔ ماشاء اللہ بڑی پیاری لگ رہی تھی مگر اس سے بات کرنے کا موقع تھا نہ وقت۔ لہذا کہ اب وہ بھی ہمیں کہیں گے میں آباد ہے۔ ہماری بیگم نے بتایا کہ اس کا بیٹا بھی اب ماشاء اللہ بڑا ہے۔)

خاموش عالموں میں سے حضرت مولوی محمد حسین صاحب مزہ گڑی والے بھی تھے۔ عام جیسوں میں تقریر کرتے تو آپ نے اس وقت شروع کیا جب کنو ناھوٹ الکھواء کے مصداق حضرت بانی و مجدد کے رفیقوں میں سے آپ آخری رفیق کے طور پر رہ گئے ورنہ اس سے پہلے جلسوں سے گریز پائی رہتے تھے۔ دیہاتی مبلغ تھے۔ ابا جی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ گیارہ واحد حسین صاحب جتہیں میں جماعت احمدیہ کے صوفیاء میں ایک نہایت بلند مرتبہ صوفی جانتا ہوں بھی ایسے ہی عالم تھے۔ گورکھی کے عالم تھے مگر ان کا قصور گورکھی نہیں سکھوں والی پنجابی زبان تھی۔ بولتے تو یونہی لگتے تھے سکھوں کا کوئی گیارہ بول رہا ہے۔ حضرت مولوی محمد حسین صاحب بھی نہایت سادہ طبیعت عالم تھے۔ ہم نے کئی مرتبہ انہیں دیہاتیوں میں بیٹھے ٹٹکھو کرتے سنا۔ خاموشی سے معترض کا اعتراض سننے اور پھر ہستہ سے کوئی ایسا نکتہ پیش فرما



یہ بحثیں جواب نہ جاتا۔ گورنمنٹ کا آکر آیا تو اپنے بیانی میں صاحب یا آئے۔ یہاں  
 سے آئے۔ اس گورنمنٹ اور حکومت تھ۔ یہاں سے گورنمنٹ میں آئے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں  
 نے بعد میں بددیوانہوں اور بدعنوانوں کے ساتھ ایک خاص پروگرام میں اور بار  
 تار کر کے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان لوگوں نے حضرت حفیظ جی سے کہہ کر جڑوا لگی کہ ہمیں  
 عیانی عہدہ صاحب کی خدمات کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے سوا کوئی یہ نہیں جو کمپنوں کا جواب  
 سبوں کی رہا۔ اور ان کے لڑکچہ سے اس کے لئے کیا بیانی عہدہ صاحب۔ گورنمنٹ میں ورکنگ کے  
 درمیان بہت مفید ہو کر نکلتی ہے جو نہ صرف سلسلہ کے لئے بلکہ قومی لیڈر کے لئے کتھا کے لئے ب  
 تک مفید اور متفہم سمجھا جاتا ہے۔

گورنمنٹ کے آکر سے بات اپنے بزرگ جو بددیوانہ اور صاحب تک پہنچی۔ آپ ہندی کے ارادان  
 تھے۔ ان کے صاحبزادے، جد شہاد ہمارے ساتھ سائیکل پر چینیٹ پرانے جانا کرتے تھے۔ چوہدری  
 صاحب نے بہت کوشش کی کہ جد اور اس کے ساتھ ہم ان سے اور کچھ نہیں تو ہندی کہنا پڑھنا ہی کچھ میں  
 ٹرہا ہوا کوشش کے طبعیت اور نہیں آئی۔ اب اس عمر میں سوینڈن لوں نے ہم سے فرمائش کی کہ آپ  
 ہندی سیکھ میں تو ہمیں آپ کو شعبہ ہندوستان میں جہد دینا آسان ہو جائیگا مگر ہری طبیعت پھر بھی اس  
 طرف مائل نہ آئی اور نہ ہمارے دوست اوم پرکاش عرف ہوشیار پوری نے تو ہمارے لئے ہندی کا ایک  
 قاعدہ باقاعدہ تصنیف کر کے شاگ ہالم سے بھجوا دیا۔ چوہدری عبد الواحد بھی بڑے ہی خاموش طبع بزرگ  
 تھے۔ ہندی کے رسالے منگواتے اور پڑھتے رہتے تھے اور سلسلہ کے مفید مطلب حوالے نکالتے رہتے  
 تھے۔ اصلاح و ارشاد کے دفتر میں نائب ناظر تھے وضع داری سے شلواریس کے اوپر ہاف کوٹ پہنتے اور  
 ٹوپی اوڑھتے تھے ہم نے بہت کم نہیں کوٹ کے بغیر دیکھا۔ خالد زینب ان کی بیگم ہم سے اپنے بچوں کی  
 عمر کیا کرتی تھیں ان کا گھر ہمارے لئے اپنا ہی گھر تھا ہم نے گھر میں بھی چوہدری صاحب کو خاموش  
 اور مود میں مصروف پایا۔ عجیب کتابی قسم کے بزرگ تھے مگر خشکی انہیں چھو کر بھی نہیں جاتی تھی۔ ان کے چہرہ  
 پر ہر وقت ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ کھلتی رہتی تھی۔ کچھ وارنڈوں میں رہتے تھے تو ہم سائیکل پر ان کے گھر  
 پہنچتے۔ جد باہر آتا اور ہم چینیٹ کے لئے روانہ ہو جاتے۔ چوہدری صاحب کچھ دور تک ہمیں دیکھتے

رتے تھے۔ چھ ماہ تک رہے۔ ان کی دعا میں بارگاہِ مبارک سے رخصت ہو گئے۔

مکرم ملک سیف الرحمن مطلق سلسلہ کے بلند مرتبہ رہا کرتے۔ ہم نے قیام میں حضرت سید مراد شاہ صاحبؒ کو دیکھا، وہ بھی وہی جہاد تارک بنے بغیر نہیں آئے تھے۔ ان کے قریب ان کے ہاتھ کاٹا اپنے مرتبہ کا بہت عطا کرتے تھے مبادا کوئی مسئلہ چڑھے، ان کے پاس دایچہ کریں کے مرتبہ کا اندازہ نہ کر سکے اور شاہ کرکھا جائے۔ مگر ہم نے مکرم ملک سیف الرحمن صاحب کو اور بغیر اپنے قبیلہ مولوی محمد احمد حیل کو اس بارہ میں بے پروا کیا۔ مولوی حیل صاحب تو کٹر باہر جاتے ہوئے شیر دلی زرب تن فرماتے ہیں مکرم ملک صاحب کو ہم نے کئی بار بلکہ کٹر بغیر شیر دانی کے جامد آتے جاتے دیکھا۔ ٹوپی ضرور اوڑھتے تھے انہیں نگلے سرد یکجا نہیں۔ سلسلے کے علماء میں سے ایک ایسے بزرگ کا بھی ذکر پڑا کہ ہے کہ وہ ٹوپی نہیں اوڑھتے تھے بلکہ حضرت امام جماعت اشرفی کے سرداروں میں سے تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ ٹوپی اوڑھنا کوئی دینی مسئلہ نہیں تہذیبی مسئلہ ہے اور نماز نگلے سر بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ ہمیں کسی سے وہ بزرگ بہت اچھے ملتے ہیں۔ جملہ مقررہ۔ ابھی پچھلے دنوں عزیز مراد میر احمد صاحب صدر خدام احمدیہ کی ایک دو تصویریں نکادے گذریں جن میں آپ نے ایک نہایت نیکی کمر ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ ہم نے نہیں پینا سمجھو یا کہ اگر صدر ایسی نیکی کمر ٹوپی اوڑھے گا تو ہمتیں کون سی ٹوپی اوڑھ کریں گے؟ اس کا جواب آیا کہ وہ ٹوپی آپ نے کسی کی تالیف قلب کے لئے اوڑھی تھی اس لئے ہمتیں کے بارہ میں فکر مند نہ ہوں ہم اس وقت سے یہی سوچ رہے ہیں کہ اس فقرہ کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ ہمتیں کسی کی تالیف قلب ہرگز نہیں کریں گے؟ یا تالیف قلب کے لئے ٹوپی اوڑھنا ہی پڑی تو ایسی نیکی کمر ٹوپی نہیں اوڑھیں گے؟ ہم ملک سیف الرحمن صاحب کے ذکر سے چلے تو کہاں پہنچ گئے۔ مکرم ملک صاحب سے ہماری دوستی کا تعلق بھی یہاں تھا۔ جہاں ملتے بہت شفقت فرماتے۔ دوستیوں شروع ہوئی کہ ان کی بیگم امہ الرشید شوکت بوند کے رسالہ مصباح کی ایڈیٹر تھیں اور ہم اس زمانہ میں مصباح میں خوب چھپا کرتے تھے کیونکہ یہ رسالہ ہماری نظمیں مضامین چھپ دیتا تھا ایک بار رسالہ چھپنے سے پہلے مکرم ملک صاحب سے سر راجد قات ہوئی۔ فرمانے لگے اب کی بار مصباح میں آپ کی نظم آ رہی ہے۔ بڑی اچھی نظم ہے۔ ہم نے شوخ چٹشی کی اور کہا "اچھا تو آپ ہیں امہ الرشید شوکت؟"۔ ملک صاحب بہت ہنسے۔ ہماری

باقی بچی ہوئی۔ آپ جامعہ کے پرنسپل تھے۔ سلسلہ سنی تھے مگر انہوں نے کامرہ کی دینی اور سنی  
 باقی میں حاصل کیا۔ پھر ان کے بیٹے اور سناؤ اس کے قریب یا رشتہ میں یہ ملک صاحب بھی  
 خاموش عام تھے۔ تقریریں ضرورت شعری کی وجہ سے کرتے مگر گئے کہ جامعہ کے پرنسپل تھے مگر  
 جامعہ میں انہیں تقریریں کرتے نہیں دیا۔ کالج کے ادبی اجلاسوں میں اور خاص طور سے  
 مت عروس میں ضرورت شریف لیا کرتے تھے۔ ایک بار تاسیس ہو۔ دعوت دہانہ میں نہ پہنچی یا رشتہ میں کہیں  
 ضائع ہو گیا۔ اس کے باوجود شریف اسے فرمانے گئے میں نے سوچا یہ تو نہیں سنتا آپ نے دعوت نامہ  
 نہ بھیجا ہو۔ فقینارستہ میں کہیں ضائع ہو گیا ہوگا۔ اس سے میں گھبرا گیا۔ مگر دعوؤں کے بارہ میں بہت محتاط  
 تھے۔ کالج کی ہر دعوت میں پرنسپل جامعہ ہونے کی وجہ سے مدعو ہوتے تھے اور دعوت نامہ نہ پہنچ سکتا تو کبھی  
 نہ آتے۔

روہ کے ناظر صاحبان و کل صاحبان اور چندہ عہدہ کوہناروہ کی ویرایون کے نام سے پکار کرتے  
 تھے کہ یہ ولیمہ میں بھی ڈوب روہ کے ممتاز شہری ہونے کی وجہ سے مدعو ہوتے تھے اور ہیں۔ ملک صاحب  
 اس ایون میں شامل ہونے کے باوجود دعوؤں کے رسیا نہیں تھے۔ شوگر کا مریض ہو جانے کے بعد تو محتاط  
 بھی ہو گئے تھے مگر ہمیں یہ فلسفہ بھی ملک صاحب ہی نے سمجھا کہ انسانی جسم کو یک مناسب مقدار میں  
 میٹھے کی ضرورت بہر حال باقی ہے اس سے جسم کو محروم نہیں رکھنا چاہئے۔

اس طرح جسم کے صحت مند خلیے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا شوگر سپیشلسٹ یورپ کا ناہوا شوگر  
 سپیشلسٹ ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس کے زیر علاج رکھنے کا انتظام فرمایا ہوا ہے۔ اس نے دیگر ہدایتوں  
 کے علاوہ یہ ہدایت بھی دی ہوئی ہے کہ جسم کو مکمل طور پر شوگر سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ شوگر زیادہ ہو جائے  
 تو اس کا تدارک کیا جاسکتا ہے مگر جسم میں شوگر کی کمی ہو جائے تو اس سے جسم کو ایسا نقصان پہنچے گا جتنا ہو  
 سکتا ہے جس کا ازالہ نہ کیا جاسکے۔ یہاں تو ایسی بہت سی میٹھی غذا میں میسر ہیں جو شوگر کے مریضوں کے  
 لئے ہی بنی ہیں اور بے دریغ شوگر کے مریضوں کو کھلائی جاتی ہیں ہمارے یہاں ابھی ایسی خوراک میسر نہیں  
 اس لئے شوگر کے مریض پھرے ان سے محروم رہتے ہیں۔ پچھلے برس ہم کینیڈا گئے تو عزیز میٹر ملک  
 نے ایڈمشن بلایا۔ ہم نے اسے مصحافی کے کاروبار میں ملوث کیا تقصیر سے ہوئے دیکھ تو یہی سوچا کہ ملک

صاحب خود تو بیٹھے سے اس طرح نصیب نہ ہو سکے۔ ہش سکوئی راہ پر چلے۔ سر پر تھوڑا سا پر قلم  
کند۔

روڈ میں تاج احمدی نام سے دکان تھی۔ ایک قہر مولوی تاج لدین صاحب، حمزہ، اور دوسرے تاج  
لدین مولوی داخل گڑ بکھڑتے تھے۔ مولوی داخل گڑ اس نے کہ ان کے شاگرد مولوی داخل کا امتحان  
دیتے تو پاس ہو جاتے خواہ امتحان میں بیٹھتے تو کامیاب نہ ہوتے تھے۔ اس سے فرمایا کرتے تھے میں  
مولوی داخل نہیں مولوی داخل گڑ ہوں۔ نہایت حمید الطبع اور منکسر الخلق بزرگ تھے۔ سادہ سے  
باس میں جیوت رہتے۔ کئی بار انہیں دیکھا کہ دودھ دہی کی دکان پر قطرہ میں کھڑے ہیں۔ ایک دو بار  
حزامانہیں پیسے باری دین چاہی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔ ان کے شاگردوں سے ان کے بارہ ایک سا کہ  
بہت عام آدمی ہیں۔

جماعت احمدیہ کے کاموں اور دوسروں میں فرق دیکھنا ہو تو کسی پرانے سدا کا یہ شعر پیش نظر رکھیں تو بات  
 واضح ہو جاتی ہے دوسرے صاف و فخر ہے کہ ”ہم نہ نکبت ہیں نہ گل ہیں جو مہکتے جاویں۔“ گلاب کی طرح  
جدھر جاویں دیکھتے جاویں۔ مگر ہمارے علماء جدھر جاتے پھوس کی طرح مہکتے جاتے تھے۔ ان کے علم کی  
خوشبو چاروں طرف پھیلی جتنی تھی اسی خوشبو نے انہوں کو اپنی طرف کھینچا تھا اور کھینچتی ہے۔  
ذکر خاں موش علماء کرام کا تھا ایک بزرگ تھے جنہیں جامعہ میں بائبل پڑھانے پر مامور دیکھا۔ ان کا اسم  
گرمی عبدالخالق تھا۔ عیسائیت سے تائب ہو کر احمدی ہوئے تھے۔ بائبل کے ایسے حام کہ گویا ساری  
بائبل ان کی انگلیوں کی پوروں پر تھی۔ لوگ بائبل بائبل کا حوالہ تلاش کرنے کے لئے انہیں پیری جانے کی  
 بجائے انہیں جانتے تھے۔ انہیں دودھ جلیبی کا بہت شوق تھا بیٹھے کے مانتے تھے۔ چینی بیگم سے پرانی  
شہ سالی تھی ایک بار انہیں سانپ نے ڈس لیا۔ ہفتہ دس دن بعد ٹھیک ٹھاک ہو کر جامعہ آئے تو دوستوں  
سے بڑی مایوسی کے عالم میں فرمایا کوئی کیمخت بڑا اسی جو سانپ تھا۔ میری دو روپے کی دودھ جلیبی ضائع  
کر دادی خاک خوشہ چڑھا ہو۔ اس فقرہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو فلک سیر کے عادی ہوں انہیں  
سایہ کا زہر چھ نہیں کہتا انسان کے لئے لطف کا باعث بنتا ہے۔ قہر و کعبہ مولانا جلیل صاحب مدظلہ سے تو  
نک دوتی تھی۔ ہمارے پاس بھی ان کا پرانا تعلق تھا۔ جب کبھی ہمارے ہاں تشریف لاتے ابا ہمیں

دہتے کہ باہر رات جیسی لے کر آؤ۔ پھر اندر سواتے کہ رات میں جیسی سارے باہر جیسی ہیں خوب  
 دی گئے جانے۔ یہ آپ میں میں غائب ہیں۔ تو جیسے تیرے سات قرآن کے حادیہ تو  
 سمجھنے بہت، ایسے شخص صاحب باطل کے حافظ تھے۔ اب ہم نے جس زمانہ میں نہیں دیکھا وہ دور  
 بینین یا صدر شمس کا زمانہ تھا۔ ہم نے کے مرتبہ اور مقام سے آتا نہیں تھے مگر اپنے پرانے گوان کا حد سے  
 زیادہ احترام کرتے دیکھا۔

اب بات ایک ایسے لمحہ پر آئی جس کے بارے میں کھانا سنان مانتا تھا مگر کھانے کا ہوں تو مثل میں  
 ہوں۔ آپاں کھوں، وہ شخص محض عالمی نہیں تھا، ہمسایہ بھی تھا، ایسا ہم سب پر سارے ہی فخر کرتے تھے  
 درجہ۔ حسب دستور، رنی اور ان کی عروں میں بہت تفاوت تھا مگر ہم پر مہربانی فرماتے تھے۔ یہ ان کی  
 ذر و ذری تھی اور نہ میں کیا مری حقیقت کیا۔ مولوی محمد دین صاحب۔ صدر صدر انجمن محمدیہ۔ جوانی میں  
 امریکہ میں بٹل بھی رہے۔ ہمارے سکوں کی زندگی سے پہلے ہیڈ ماسٹر کی بھی کی ہم نے جب سے انہیں  
 دیکھا بڑے اور مہر سید ہی دیکھا۔ انگریزی زبان سے بہت شغف رکھتے تھے انجمن کے دفتر میں صدر کی  
 کری پر تھے ہم نے انہیں بھی کتاب کے بغیر نہیں دیکھا ہاں آخری بیماری سے قبل بہت کمزور ہو گئے تھے مگر  
 دفتر آنا چاہا جاری تھا ڈاکٹروں نے عرق ریزی سے کام کرنا منع کر دیا ہوگا اس لئے خاموش اور اکیسے بیٹھے  
 دکر اہی کرتے رہتے تھے کیونکہ اس کے مونت بٹنے دکھائی دیتے تھے۔

حضرت مولوی صاحب کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا ہم نے اپنی سوش میں انہیں انجمن پہنچے نہیں دیکھا سادہ  
 سا کرتا اور ٹخنوں سے ونچا یا جامہ پہنتے تھے۔ پاؤں میں بھی سادہ دیسی جوتا ہوتا تھا۔ ہمارے اب بھی یہ  
 بخشنے لباس کے معاملہ میں بالکل دیہاتیوں جیسے طور رکھتے تھے شلو اور تو حضرت ضیفہ اسات نے ناظر  
 ہاتے وقت صفا پہنائی۔ شلو میں بہت بے آرائی محسوس کرتے تھے اس سے تہہ بند بندھتے تھے۔ گھر میں  
 تہہ بند اور اس کے اوپر بنیوں مہمان بھی آتے تو اسی لباس میں ان سے ملتے تھے بے تکلیف کے مزاج کا  
 حصہ تھی تقریبات سے اسی لئے گھبراتے تھے کہ ان میں لباس کا تکلف کرنا پڑتا ہے۔ سرکاری فیسوں سے  
 بھی اسی شل سے جالتے تھے ورنہ افسران ان کی وجاہت اور وید بد کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے  
 تھے۔ بات حضرت مولوی محمد دین صاحب سے چل تو ان کے پڑوسی کو پیٹ میں لے لیا۔ ان کا مکان

ہمارے گھر کے سامنے ہی تو تھا ایک بے بی رہتے تھے دفتر احمدیہ میں ان کی ساری تنہا رہائش تھی۔ ان کے متعلق کے دنوں میں ایک بار ان سے تقریر کی گئی تھی، وہ چپ کی نہ دیتے تھے۔ ان کے لئے اگلے دن صبح تک انتظار کرنا پڑا کہ دفتر چلے کے سے گھر سے نہیں گئے تو ان سے پوچھیں گے۔ طبیعت میں اس بات کا بہت جواب رہتا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے پر نہیں خود دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے آنا پڑے گا۔ یہ تاہم نہیں بیٹے کے سے آتا تھا اس میں دفتر جاتے تھے۔ باقی رات میں سوتے تو نہیں اپنی جیب میں لے جاتے۔ صدر صدر انجمن احمدیہ نے کبھی اس بات کی خواہش نہیں کی کہ انہیں بیٹے کو سونے بھیجی جائے۔ تاہم کی سواری پر خوش اور تامل تھے عجیب صوفیانہ زندگی کرتے تھے جیسے زندگی کی آسائشوں سے انہیں کوئی علاقہ ہی نہ ہو۔

ہماری بیگم میں حضرت مولوی ملاح محمد صاحب تھے اپنے نسیم سیفی صاحب کے والد سرائی۔ ایک اور تاجدار جامعہ میں غیر ملکی طلبہ کو اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ ان کا طریق تدریس یہ سادہ تھا کہ غیر ملکی بڑے دنوں میں ہی فر فر اردو بولنے لگتے تھے۔ مولوی صاحب بھی دیہاتی بودا باش رکھتے تھے گھر پر تو تہ بند باندھتے مگر جامعہ جاتے وقت شہوار کرتا کہن لیتے پاؤں میں وہی دیہاتی جوتی۔ سر پر بکڑی نہیں صاف باندھتے تھے گھر سے نکلتے تو دھڑا دھڑا کیے بغیر سیدھے جامعہ کا رخ کرتے ذرا لمبی باقاعدگی سے کرتے ایک دو بار انہیں پہاڑ، زہند بھی ذکر الہی کرتے سنا۔ واپس آتے تو گھر میں وہی دیہاتیوں والا لباس پہن لیتے۔ نمازوں کے لئے باقاعدگی سے مسجد میں جاتے کڑی دوپہر میں جب چیل اندھ چھوڑتی ہے انہیں مسجد کی طرف رال داس دیکھا۔

بچپن ہی کا ذکر ہو تو ہمارے فضل حسین صاحب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ہمارے فضل حسین صاحب کو جس زمانے میں ہم نے دیکھا اس زمانہ میں ان پر فوج کا حملہ ہو چکا تھا دائیں ہاتھ پر فالج کا اثر تھا چپنے میں بھی دقت ہوتی تھی مگر اپنے کام میں مگن رہتے تھے۔ سلسلہ کی بہت سی سفید کتابیں انہی کی چھاپی ہوئی ہیں۔ بہت احتیاط سے مواد اکٹھا کرتے اور چھاپتے تھے۔ ربوہ کی وسطی بیڑی کے عین دامن میں ہوں گے پرانے ڈھ کے قریب ان کا مکان تھا گرمیوں میں ربوہ کا یہ حصہ آگ کا ککڑا بن جاتا ہے مگر ہمارے صاحب کو ہمارے اس گرم مکان میں بھی ٹھنڈے دل سے کام کرتے دیکھا ہے۔ ایک ماریا ہوا کہ





ن۔ والدہ ماجدہ کے تصوف کا رنگ حوصلہ تھا

فارسی کا۔ سلسلہ دینی روایت کا، مہربانہ ہے حضرت شیخ مولانا حبیب صلوٰۃ اللہ علیہ کے علم کا معتد بہ حصہ فارسی میں ہے اور اپنی شگنی رفتی میں سائنس کے علم سے نکلتا تھا ہے۔ اس نے ہر اہم دینی سائنس کے ناطے سے بھی فارسی سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ ہمارے فارسی شعرا میں سے حضرت حکیم عبید اللہ صاحب نکل کا ذکر ہندوستان کے فارسی گوشترا کے تذکرہ میں ہے۔ احترام سے یہ لکھا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر کا انتقال ہوا۔ ان کی فارسی نظمیں سلسلہ ادبی سراپا کا پیش بہا حصہ ہیں۔ فارسی کی طرف کما حقہ توجہ دینا ضروری ہے ورنہ ہمارے علم کا کثیر حصہ لوگوں کی نگاہ سے اجمل ہو جائے گا۔ ہمیں توجہ دینی ملتا ہے ہمارے پاس فارسی جاننے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔

ایک بار ہمارے گھر کے سالانہ مشاعرہ میں ہمارا ایک شاگرد صاحب مرحوم ایک بزرگ کو اپنے ساتھ لایا۔ کہنے لگا میرے نانا ہیں پنڈی میں رہتے ہیں اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔ تعارف ہو تو، سر عبد الرحمن خاں کی نکلے۔ ان کا کلام سلسلہ کے پرانے جرائد میں نظر سے گزر چکا تھا ان بزرگوں سے وہ پہلی اور آخری مذاقات تھی اس مشاعرہ میں تو یہ صاحب مرحوم بھی موجود تھے ان کی خوشی قابل دید تھی۔

ہاتھ رہو سے نکل کر پنڈی پہنچ گئی تو ماہور کے دو تین خاموش عالموں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اپنے شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی شیخ عبدالقادر صاحب بائبل سکالر اور بھائی محمد احمد پانی پتی۔ شیخ اسماعیل پانی پتی ان کے ہوملن تھے ان کے شاگرد تھے مگر شعر نہیں کہتے تھے۔ انہوں نے عربی حلقوں میں ان کا درجہ کے بیٹے شیخ محمد احمد پانی پتی کا نام بڑے وقیع نام تھے۔ انوش والوں نے جو اتنے بڑے بڑے ضخیم نمبر چھاپ رکھے ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں شیخ صاحب کی عملی معاونت بھی شامل ہے۔ شیخ صاحب سے ہمارا تعارف ان کے صاحبزادے مبارک محمود پانی پتی کی وساطت سے ہوا۔ کئی بار لاہور جانا ہوتا تو ان کے ہاں نمبر ۴ رام گلی میں قیام کا موقع تھا قبلہ شیخ صاحب سے گھر پر تو کبھی مذاقات نہ ہوئی کیونکہ وہ صبح اپنی دینی فطوحات پر نکل جاتے تھے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلہ رکھتے جس میں کتبیں مسودے اور پتہ نہیں کیا کیا بھرا ہوتا۔ سر پر پھندے والی سرخ ٹوپی پہنتے۔ پاؤں میں گرد آلود جوتا بر میں شیردانی۔ شیخ صاحب بہت تیز بوتے تھے ان کی باتوں کو سمجھنے کے لئے خاص مشق بہم پہنچانا پڑتی تھی ورنہ یونہی لگتا تھا الفاظ



سے باہر تھے۔ ”سچ کف قمرن“ پر آپ کی تحقیق شریع ہوئی تو یہ سنی دنیا میں ایک تندرست  
 ہو گیا۔ شیخ صاحب کا نام گزری میں ماثبات بہت کی یونیورسٹیاں انہیں پی ایچ ڈی دی گئی، بقیں۔  
 ہمارے وہاں یہاں کون کرتا ہے شیخ صاحب کی ممت سے یہاں پیدا ہو گیا ہے جو اظہار پر سونا نظر نہیں آتا  
 مگر خدائی سسوں کے کام بھی رکتے ہیں؟

-----

## اپنے اساتذہ کے بارے میں

اپنے استادوں کا ذکر کرتا چاہتا ہوں۔ مگر قلم رک رک جاتا ہے۔ کہیں اس کی شان میں کوئی ستافنی نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے جو استاد یاد آتے ہیں وہ ماسٹر حسن محمد صاحب تھے۔ قادیان کے قریب ایک گاؤں کلاہ سوہل تھ وہاں سے اپنی مہٹھچر سی سائیکل پر تشریف لاتے تھے۔ پرائمری سکول میں تیسری اور چوتھی برعت کو پڑھاتے تھے۔ نہایت شفیق اور مہربان مگر سبق کے معاملہ میں سخت گیر۔ ان کا ایک ہاتھ کسی بیماری کے نتیجہ میں یوں ہی مڑا ہوا تھا۔ اس لئے ایک ہی ہاتھ سے لکھنے اور مزادینے کا کام لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے سردیوں میں اگر کسی روز سبق یاد نہ ہوتا تو آپ پاؤں پر ہائیں ہاتھ سے ضرب لگاتے تھے۔ بعد کے زمانہ میں جینوٹ کے اساتذہ کے ہاتھوں سیر کی چھڑیوں سے ہاتھ سناتے ہوئے بھی محسوس کئے مگر وہ ہائیں ہاتھ کی پاؤں پر لگی ہوئی ضرب پھر بھی نہ بھولی۔

ماسٹر حسن محمد صاحب ربوہ میں ہی ہمارے محلہ میں قیام فرما رہے۔ جہاں کہیں مل جاتے نہایت شفقت سے پیار کرتے اور کندھے چھبھتاتے تھے۔ اللہ کے فضل سے لمبی عمر پائی اور ربوہ میں ہی بیوند خاک ہوئے۔ ان کے صاحبزادے حمید احمد چوہدری تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی کے استاد رہے پھر ناٹھیر یا چلے گئے اور آج کل شاید جرمنی میں مقیم ہیں۔ قادیان کے زمانہ کے ایک دراستہ یاد آتے ہیں ماسٹر جے غ صاحب کھارے کے تھے۔ اونچے لمبے اور وجہ مگر ان سے پڑھتا یا رکھانا یاد نہیں۔ ایک اور استاد ماسٹر سولنگی صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ماسٹر محمد بخش نام تھا۔ قادیان کے سکول میں بہت سے اساتذہ کو دیکھا مگر پرائمری کے بچے کی یادداشت کیا مگر سکول کا حوالہ یاد ہے۔ اساتذہ کی شفقت، ماننے کے پنے، ولایت حسین کے گلاب جامن یا ماسٹر ذراعتی صاحب یاد ہیں۔ ماسٹر اللہ بخش صاحب ذراعت پڑھاتے تھے۔ مگر ذراعتی صاحب کے نام سے موسوم تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ ان کے صاحبزادے مجید طاہر نے ہمیں بتایا کہ جب سویڈن میں ہاراول کا ایریشن ہوا تو اتفاق سے ذراعتی صاحب جرمنی میں آئے ہوئے تھے۔ ہر نماز سے پہلے سب کو بار بار تاکید کرتے کہ ناصر کے لئے بہت دعائیں کروا دیں!

چہتا شہداء سے بہت پریشان ہے۔ یہ استاد کو خائب کرتے ہیں۔  
تقسیم کے بعد اپنے گاؤں کے سکول میں ماسٹر عبد الرحمن صاحب سے تھک دیر پڑھنا یاد ہے۔  
ماسٹر عبد الرحمن صاحب ہمارے پچو پچا راجہ عبدالرزاق خاں صاحب کے بڑے بھائی۔

تھے۔ تھوڑے عرصہ میں ہمیں پاس کے قصبہ قاضیاں کے ٹڈل سکول میں منتقل ہونا پڑا۔ قاضیاں اب تو بڑے  
شہر بن گیا ہے۔ اس زمانہ میں چھوٹا سا قصبہ تھا۔ قاضیاں سکول کے دو استاد ہی تھے۔ قاضی اکرم صاحب  
ہینڈ ماسٹر تھے۔ قاضی صاحب ٹھیکری پڑھاتے تھے۔ ہاتھ کی انگی میں ٹکٹھی پہنتے در دوسرے ہاتھ کی  
انگی سے اسے گھماتے رہتے۔ سبق پڑھانے میں بھی گھمانے کا یہ عمل جاری رہتا۔ ماسٹر عبد انیس صاحب  
ال زبان بھاجتے تھے۔ اور پتہ نہیں قاضیاں کیسے پہنچ گئے تھے۔ ان کی میز بھی مانگ یاد ہے۔ پھر ہمر بوہ منتقل  
ہو گئے۔ ربوہ میں وقت کچھ مکانات کی آبادی تھی۔ ربوہ میں اس وقت ہماری عمر کے بچوں کا کوئی سکول  
نہیں تھا۔ چھوٹے بچے تو لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑھتے تھے مگر میں تعمیر اسلام ہائی سکول چینٹ میں جانا  
پڑتا۔ ربوہ سے ایک گاڑی صبح چھ بجے چلتی تھی ہم لوگ اس سے جاتے اور شام چھ بجے کے قریب واپس  
آتے۔ گاؤں میں تھے تو، تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کرتے تھے۔ یہاں گاؤں کا کھول نہیں تھا۔ اس لئے سارا  
دن گاڑی کا انتظار کیجتے۔ سردیوں کے موسم میں صبح چھ بجے گاڑی سے چینٹ پہنچتے۔ ریلوے لائن کے  
ساتھ ساتھ چلتے اور کھیتوں سے گاجریں سولیں اکھیرتے اکھڑتے اور کھاتے سکول پہنچتے۔ گیٹ پڑے  
ماسٹر سے ملاقات ہوتی اور شرواب شرواب چھڑیاں پڑتیں۔ درہم سوں سوں کرتے ہاتھ ملنے کلاسوں میں  
جا پہنچتے۔ سکول کی دیواروں کے ساتھ کثیر کی بازگشتی ہمارے استادوں نے وہ ہمارے ہاتھوں پر صرف کر  
لی۔ اب وہ سکول نڈ منظر آتا ہے۔

چینٹ سکول کی یادوں میں حضرت سید محمود اللہ شاہ صاحب کا بدعب چہرہ یاد ہے۔ حضرت شاہ صاحب  
اپنے دفتر سے کم ہی باہر نکلتے تھے۔ مگر جہاں نہیں نظر آجاتے طلباء دیک جاتے۔ حالانکہ وہ کبھی طلباء سے  
تعرض نہیں کرتے تھے۔ نہایت پر وقار اور دھیمے دھیمے انداز سے چلتے تھے۔ سر پر ٹوپی آنکھوں پر کالی سینگ،  
جسم پر سات ان کا گھر سکول سے سامنے نظر آتا تھا اور خاصے فاصلے کے باوجود نظر آتا تھا اب تو درمیان

میں۔ شہر میں میری زندگی میں۔ قہر شہر میں۔ دب سس کھٹے۔ اوقت سے پہلے شریف لے آتے  
 میں۔ ابھی اسیں سس کھٹے۔ بعد آئے نہیں دیکھا۔ اٹلی میں نہایت وقار کے ساتھ صاحب کرتے  
 تھے۔ مختصر، عام تھے۔ زیادہ باتیں کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ سس میں، سہ محمد بریکہ صاحب  
 سے جیسے دُکات کی جوں کی رہائش کے لحاظ سے جہوں کہتے تھے۔ گکریزی پڑھی۔ ماسٹر صاحب  
 انگریزی خوب پڑھاتے تھے۔ Tense یاد کروانا ان پر تھا۔ اب بھی جو دو چار، نئے، گکریزی لے آتے  
 میں یہ انہی کا فیضان ہے۔ درنگاٹ میں، استاد کی مرزا خورشید صاحب سے تو سوائے تلفظ کے اور کچھ نہیں  
 سیکھا اور حیات یہ ہے کہ اب تک Th کی آواز نہیں نکال سکتے۔ (برا سو ہے۔ کلپی کا ہم اپنے استادوں سے  
 بھی چہل کرنے سے باز نہیں روکتے)۔ صوفی محمد ابراہیم صاحب اور صوفی محمد صاحب سے سائنس۔  
 مکرم، ماسٹر، عبد اللہ خان صاحب سے تاریخ و جغرافیہ، مرزا عیادت صاحب سے عربی، پروفیسر محمد  
 بریکہ صاحب ناصر سے حساب پڑھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ حساب کے باب میں تب بھی کورے تھے اور اب  
 بھی کورے ہیں۔ ماسٹر نور الہی صاحب سے ڈرامنگ پڑھی۔ یسکی سوتی تو کچھ نہ کچھ کھینچا، آج تا۔ نہ  
 آیا۔ اہاں جس شخص نے ادب کی چاٹ لگائی وہ ماسٹر نہ براجم صاحب رحمانی تھے۔ اللہ اللہ کیا استاد تھے۔  
 سکول کا زمانہ۔ ترکیب کی عمر۔ رحمانی صاحب غالب پڑھاتے تو یوں گدا جیسے غالب نے ہمارے ہی نئے  
 شعر کہہ رکھے ہیں۔ ذوق پڑھاتے تو زبان کی چاشنی پنی زبان پر محسوس ہونے لگتی۔ حالی کا ذکر کرتے تو  
 تمام باتیں پہلی جمعیت میں بیان کرتے۔ رحمانی صاحب نے زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ ان کے بیٹے سعید  
 احمد غالب تو دیان کے زمانہ سے ہمارے کلاس فیلو تھے۔ ہم لوگ اس طرح شہر و شکر تھے کہ سعید صاحب  
 ہمارے گھر کو اپنا گھر اور ہم سعید کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ ہماری، تمیں بھی ہمیں ایک جیسا پیرا دیتی  
 تھیں۔ وہ ہماری امی کو پھوپھی بھی اور ہم اس کی امی کو پھوپھی بھی کہتے تھے۔ بت رحمانی صاحب سے چلی تو  
 پھوپھی صوفیہ تک چلی گئی۔ مگر وہ رشتے ہی اتنے کپے تھے۔ چار پانچ برس پہلے ہم بھائی رشید رحمانی کے گھر  
 پھوپھی صوفیہ سے کوئی پینتیس سال کے بعد ملے۔ آپ نے اس طرح پک کر ہمارا تھا جو ما جیسے پین میں  
 چو، کرتی تھیں۔ بہت ضعیف ہو گئی تھیں چونکہ ابا جان اور پھوپھی جی کی وفات کے ایک سب عرصہ بعد ان  
 سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لئے بھائی اور بہن کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئیں۔ افسوس کہ دوسرا سب سے پھوپھی

صوفی بھی تہ کو یہی سوئیں 'رحمانی صاحب' تو آئی۔ یقیناً جس میں پھر راحت ہوئے تھے  
سکون کے ساتھ میں سے رحمان صاحب نے حد جس استوائی رہا وہ متاثر یا وہ جوان صاحب ہیں۔  
پتلے جیسے کے آدمی میں۔ اچکن ماروین تو بالکل سینک ملائی نظر آتے ہیں۔ ناک کرٹ پروری کا یہ عام  
ہم نے دیکھا ہے کہ سکون کی نیم اندر کھیل رہی ہوتی تھی، ابھر میں صاحب باہر بیچ پر کھیتے تھے۔ باور کے  
ساتھ باں کر داتے اور بیت مین کے ساتھ بیٹنگ اور بعض اوقات پک کر بیچ بھی لیتے وہ ہم لوگ ٹیم کی  
کرٹ سے ریڈ وہینڈ، سٹر صاحب کی کرٹ سے محفوظ ہوتے تھے۔

عزیز موصوفی، صاحب، الحیب، راشدی، مدد رت کے زمانہ میں میں کان یونین کا انچارج تھا۔ ایک انگریزی  
مباحثہ میں ہم نے مکرم میاں صاحب کو جج کے طور پر مدعو کیا۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ شاگردوں نے  
اپنے سکول کے سٹوڈنٹ کو کانج کے مباحثہ میں جج بنایا ہے۔ میاں صاحب عمر آدمی ہیں مگر اللہ کے فضل سے  
ذہنی طور پر خوب مستعد ہیں۔ مباحثہ کے بعد سٹاف روم میں چائے پیتے ہوئے کہنے لگے۔ میاں! تم نے  
خوب چن کر مجھے مباحثہ کانج بنایا! تمہیں معلوم ہے ناکہ میں ریوڈ والوں کے سائے انگریزی کی "ماہا" ہوں  
میں نے عرض کیا "درست فرمایا، آپ کی عمر کو پہنچ کر آدمی کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ ماں ہے کہ باپ  
ہے" اس پر لب قہقہہ بند ہوا اور سب سے بند قہقہہ میاں صاحب کا تھا۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے  
ہینڈ، سٹری سے بھی ریٹائر ہوئے۔ کرٹ سے بھی اور امریکہ خدمت دین سے بھی! اب صرف مضمون  
لکھنے پر گزارا ہے۔ اللہ انہیں خوش و خرم رکھے۔ اب تو انہیں ہم سے رخصت ہوئے مدتی ہو گئیں۔ اللہ  
انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔



## کچھ بے نفس لوگ

حضرت مولوی شیر علی صاحب کی سوانح پڑھنے والے حضرت حکیم عبید اللہ راجہ صاحب کا نام سے آیا۔ وہاں یہ بارے خدایہ کس کا نام آیا۔ قادیان کے زمانہ سے سن ۱۱۰۰ سے گھر جیسے حقیقت تھے۔ ان کی حکیم بیوی بھی رہے۔ بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی بیویاں صاحبہ صفیہ اور قیدیہ نام تھیں۔ ان کی بیویوں کی طرح بیوی بھی تھیں۔ کبھی ان کے گھر جانا ہوتا تو ہمارے آگے پیچھے پھر تھیں اور ہمارے زانگوں میں۔ پھر وہ میں بھی حملہ داری رہی۔ اور ارحمت و سہی کی جنوبی جانب آخری گلی میں ان کا مکان تھا۔ مکان کیا ایک کمرہ سا تھا اس کے ساتھ صحن۔ یہاں بھی ان کی محبتیں اسی طرح قائم رہیں۔ ہماری بیوی بھی جی بی بی تھیں اور بیوی بھی رہا۔ یہاں دوستانہ تھا اس لئے کئی بار ان کے ہاں جانے کا حکم ہوتا تھا اب پھر بھی رہا۔ یہ سب کے سب اب پھر بھی رہا۔ یہ چیز دے کر تو۔ اور پھر بھی رہا اور ان کی بیویاں ہم سے تقابلاً کرتی تھیں کہ ہمیں کئی بار ان کے ہاں جانا کھانا نہیں تھا۔

حکیم صاحب کو ہم حکیم صاحب ہی کہتے تھے۔ ان کی باتوں میں اتنی مانت مونی تھی کہ ہمیں ان جیسا ماں گوار کوئی یاد نہیں پڑتا۔ دھیمے مزاج کے بزرگ تو ہمارے ہی تھے مگر بچوں سے جس مانت سے حکیم صاحب پیش آتے تھے وہ ان کے لئے خاص تھا پھر حکیم صاحب ہمارے پھر پاجی حضرت مولوی غلام نبی معری صاحب کی طرح ہر وقت ذرا ہی کرتے رہتے تھے۔ حکیم اپنے نام کے ساتھ لگتے تھے تو حکیم ہوں گے بھی مگر ہمارے انہیں کبھی علالت کرتے دیکھا نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم ان کے گھر تو جاتے رہے ان کے مطلب نہیں گئے۔ حکیموں میں سے تو ہمیں اپنے گھر میں حاجی محلہ میں حضرت حکیم عبید اللہ راجہ صاحب طبری باب گھر والے یاد ہیں۔ سنا ہے حضرت حکیم عبید اللہ راجہ صاحب بھی ہمارے محلہ دار تھے مگر ان کی کوئی یاد ذہن میں موجود نہیں۔ انہوں نے لمبی عمر پائی۔ ہمارے ابا کے حکمت میں استاد تھے وہ حاجی اکثر ان کا ذکر گھر میں کرتے تھے۔ حکیم عبید اللہ راجہ صاحب حضرت مولوی شیر علی صاحب کے ہم وطن تھے اور پنجاب کے رہنے والے تھے مگر اردو بولتے تھے۔ شاید حضرت حکیم نور الدین صاحب کی

طرح حکمت کی حکیم نہیں اور انہوں نے واسطہ میں یابی کو ہمارے چہرہ کی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے اور انہوں نے حالت رات کوئی سہانہ نہ ملے سہانہ کی وجہ سے اور انہوں نے جو بھی راجہ جانی بھی بڑی انجمنی ہوئی تھیں مگر وہ تھی ہمارے ساتھ اور ان کی حالت چیت رتی تھیں۔

حکیم عبید اللہ راغما صاحب کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ سر پر صاف ہاندھتے تھے۔ بعض وقت کادولی چڑائی بھی ہم سے ان کے سر پر دیکھنی ہے مگر صاف انہیں پسند تھا۔ سفید مٹل کا صاف سفید کرتا انٹوں سے وپٹی تنواری اور پاؤں میں دیکھی جوتی۔ دور سے آ رہے ہوں تو ہو بہو حضرت مولوی شیر علی صاحب کہتے تھے۔ ظہیر زمین پر رہتی تھیں ہونٹ دیر الکی سے تر رہتے تھے چھتے تو دھواہٹ نہیں دیکھتے تھے مگر تیز قدم تھے۔ قدم میں نہ تھا اور جسم دبلا۔ ہم نے حکیم صاحب کو عیسائیوں میں دیکھا دیکھا ہی رہو میں پایہ دبلے پتے اور مسکین طبع۔ سائے گھر کی خصوصیت یہ تھی کہ صوفیائے کٹکانوں کی طرح سامان دنیا سے بے نیاز تھا۔ ہمیں حکیم صاحب کے گھر میں فرنیچر کے نام پر سوائے چار پائی کے اور کوئی چیز نظر نہیں آئی مگر بے سرو سامانی اس وجہ سے نہیں تھی کہ توفیق دے رکھتے تھے اللہ کے فضل سے توفیق رکھتے تھے مگر سامان دنیا کی طرح سے بے نیاز تھے۔

بزرگوں کے ہاں حاضری دیتے رہنا ہم نے حکیم صاحب سے سیکھا۔ ان کے قریب ہی حضرت مولانا زبیدی صاحب کا دوست کدو تھا۔ آتے جاتے وہاں حاضری دیتے تھے۔ ہر روز غلی میں سے گذر ہوتا تو حضرت پھوپھو جی سے سلام کے لئے ضرور آتے۔ خاندان کے لوگوں سے عشق کی حد تک پیار کرتے۔ کوئی بچہ بھی سامنے آ جاتا تو احترام انا کھڑے ہو جاتے۔ یہ وصف حضرت مولانا شیر علی میں بھی تھا پھوپھو جی میں بھی تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے سارے ہی اصحاب میں موجود تھا۔ بانی و سلسلہ کے عشق کا رنگ ان کے راقیوں پر تا مگر اتنا کہ یہ لوگ ان کی ادا و بکاء اور ادا دے نے کسی عشق کا اظہار کرتے تھے۔

حکیم صاحب و حکمت کرتے تو ہم نے دیکھا نہیں ان کی روزی کا کیا وسیلہ تھا ہمیں باطل مہر نہیں مگر اللہ کے فضل سے وافر تھے ہندوؤں ان کی حاضری پڑی کرتا تھا۔ جو اللہ پر توکل کیا کرتا ہے اللہ اس کے لئے کس سے۔ و من یتوکل علی اللہ فہو حسنہ۔ ان کی بیویاں میں سے ایک مانتا سفید راغما بعد کو سکون میں سوتا ہوئی تھیں مگر بڑا ہوجانے کے بعد ان سے اس طرح رابطہ نہ رہا شاید پھوپھو جی بعد اور

تو صاحبِ اہانت کے خلاف یہی تھیں تھیں۔ اس کا وہ علم سوچ کر حضرت نعیم  
ساحب کی زبان کے کسی واقعے میں ہو چکا تھا۔ اس بات سے معلوم ہوتا تھا کہ صاحبِ اہانت  
اس نے یہ بات کہی اور اس نے اس کی طرح پرانی اور ہم نے بھی اس موقع پر نصیحت دینا چاہی  
یہ بات کا ذکر فرم کر کے چوتھی ہی کتابیں۔ یہ خبر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب و استغوث کے ذکر کے طویل  
دار کے لئے کوئی کی ہدایت کا موجب رہا۔

قادیان کے پڑوسیوں میں سے حضرت شیخ فضل احمد ندوی صاحب بھی تھے۔ ان کا بیٹا لطیف ہمیں سب  
سے جدا رہا تھا کہ ہمیں شیخ صاحب کے ذکر خیر میں۔ تو لکھنا چاہئے مگر ہم اسی حید سے لطیف کو مانتے  
آ رہے تھے کہ وہ خود کیوں نہیں لکھتا؟ اب قادیان کے بے نفس اور خاموش لوگوں کا ذکر کرنے میں ہوں تو  
شیخ صاحب سامنے آئے ہیں۔ قید شیخ فضل احمد صاحب ندوی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ  
والسلام کے صوبہ میں سے تھے۔ ہمیں حضرت مولانا جی صاحب کے اہانت سے معلوم ہوا تھا کہ قید  
شیخ فضل احمد صاحب کی بیوی بھی بی بی محمدی بیگم سے پہلے بھی کوئی بیگم تھیں جن سے وہ نہ سوئی در شیخ  
صاحب کھل وادہ ہونے کی خاطر انہیں طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ مدتوں سے ان کا پردہ دکھایا اور  
ان کی وراثت کے بعد شیخ صاحب نے دوسری شادی کی۔ اس بیگم سے جو اولاد ہوئی ان میں سے بھائی  
جان محمد احمد وقت زندگی ہیں۔ بیوی آپ بشارتی امینہ میر و دھاری بڑی انہیں تھیں۔ بیویوں میں سے لطیف  
ہمارا کلاس فیلو اور ہم عمر ہے مبارک مرحوم ایک دو برس بڑے تھے۔ رشید چھوٹا تھا اور نیت تو بہت ہی چھوٹا تھا (میت  
سے مراد مولانا نیت احمد صاحب مرگت نا ہیں)۔ قادیان کے زمانہ سے ہم بھائی کے ناٹے ان  
کے گھر میں پورے آتے جاتے تھے جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ لطیف اور اس کے بہن بھائی ہمارے ابا کو ماموں اور  
ہم ان کی امی کو پچو بھی کہتے تھے۔ یہ تعلق رہا تو تک چلا بلکہ اب تک چلا آتا ہے۔ لطیف رنہ سے نکلا تو  
فریق چلا گیا۔ فریقہ سے نکلا تو حرمی، کریم، پچھلے برس اس کا ایک مضمون کینیڈا کے احمدیہ گزٹ میں  
چھپنے کے لئے آیا تو عزیز بی ہدایت اللہ ہادی نے وہ مضمون ہمیں بھیج دیا کہ قادیان کے اہل مکہ کا ذکر سے  
۔ اس بہانہ سے کوئی چالیس برس بعد واپس آیا۔ بھائی جان محمد احمد سے ایک بار جرمنی کے جسہ  
پر ملاقات ہوئی تھی اگرچہ ان کی خیر خیریت کی خبر عزیز محمد احمد ملک سے ملتی رہتی تھی۔ ہمیں اس شہر پر کی

کسی مرتبہ کسی کو قید شدہ محض صاحب نام ہی تھا ہوتا تھا۔ لیکن ایک بہائی ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "یہ خوب صورت جواب"۔ یہ کتاب تمام مذاہب میں پھیلی ہوئی ہے۔

شیخ صاحب کو ہم نے قادیان میں جس حال میں دیکھا وہ وہاں بھی تین تین دنوں میں وہاں تھا۔ ہاتھ میں چھری ہر پر پکڑی۔ صاحب نہیں ہندھتے تھے طاہرین پکڑی ہوئی تھی۔ مسجد کی طرف رواں دواں۔ قادیان میں سب کوٹ محمد در غرض میں رہتے تھے مگر مسجد نور قریب پڑتی تھی اس سے سب کوٹ مسجد در میں نہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ شیخ صاحب گھر سے نکلتے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری سے دروازے کھٹکتے جاتے کہ جو بھی نماز کا وقت ہو گیا۔ ربوہ میں بھی ریوے روڈ کے دروازوں پر دستک کے نشانات اُتر موجود ہوں گے تو قید شدہ صاحب کی چھری کے نشانات ہوں گے۔ ہم نے تو ہمیشہ نہیں بوزھایا دیکھا۔ ظاہر ہے صحابی تھے تو بڑی عمر کے مرنے نگران کی اولاد تھی۔ بہر مرقی۔ ان کی بیٹی چھوٹی تھی محمدی بیگم بڑی شخصہ دلی خاتون تھیں۔ قادیان میں بھی محلہ میں اس کا مد بہ تھا ربوہ میں بھی۔ ہا۔ بیالہ کی تھیں۔ پان کھاتی تھیں ان کا پاندن بھی ہمیں یاد ہے بہت بھاری ہوا کرتا تھا اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار حضرت امام جان دار سے گھر تشریف لائی تھیں تو چھوٹی بیٹی نے بھگایا تھا کہ جو چھوٹی بیٹی محمدی بیگم کے ہاتھ کا پان لے لے قادیان میں سم نے پان لے لیا تھا تو پان کے ساتھ ساتھ چھوٹی بیٹی محمدی بیگم بھی چھٹی چلی آئی تھیں حضرت امام جان قادیان کے بر گھر میں بلا حلف آیا کرتی تھیں۔ ہمیں اپنے گھر میں ان کا ایک سے زیادہ دفعہ کا تشریف لایا ہے۔ ہمارا گھر تو حضرت مرزا شریف احمد صاحب کی کوشی کے رستہ میں پڑتا تھا اس لئے شاید سنانے کے لئے رک جاتی ہوں۔ لیکن نہیں وہ چھٹی چلی آئی تھیں؟ ہم نے حضرت امام جان کو دروازے کے محو تک بھی جاتے دیکھا ہے چپے میں نہیں نقاب نہیں تھا۔ حضرت مرزا شریف احمد صاحب نے شاید اپنی ماں سے یہ ورثہ پایا ہو مگر چہ تو حضرت اقدس مسیح موعود کی سنت تھی۔ حضور کی واحد اور سچ چہ تھی اور حضور بہت چہ کرتے تھے۔

قید شدہ صاحب کی طبیعت میں تنجیدگی اور متانت کا غلبہ تھا۔ ہم نے انہیں ہتے نہیں دیکھا مگر اس کا یہ مسلح نہیں کہ خد خد سے سخت طبع یا سخت گیر تھے یا بچوں کے ساتھ درشتی سے پیش آتے تھے۔ نہیں۔

طہارت کی بے حد اہمیت یہ ہے کہ اس کی باتوں میں شیعیان کا عقیدہ نہیں رہتا تھا۔ بھت نہیں کرتے تھے مگر اپنی بات پر اتنے سہمے رہتے تھے۔ یہودیوں کی نسبت۔ وہ حدیث بن ماری سے انہیں بہت تحقیق خاص تھی۔ اس کے پاس بیٹھتے تو ہمہ حدیث کی باتیں کرتے رہتے۔ ہمارے ہاں باقی سے ملتے تو ان سے ان کے کام کی باتیں سنتے۔ ہمارے داد کے پاس بھی آیا کرتے تھے۔ ہمارے دادا ام کے درخت کے نیچے بیٹھے قرآن پڑھتے رہتے تھے شیخ صاحب آتے تو ان کی پاشی بیٹھ جاتے اور شاید چھ باتیں بھی کرتے ہوں گے ہمیں اس کے بارہ میں وثوق نہیں ہے ہاں، داداں کے پاس انہیں میٹھ مولو لکھنا یاد ہے۔ ملک صاحب مدین صاحب کو تو ہم نے دادا جان کے پاس بیٹھ کر آچوتے ہوئے دیکھا ہے۔

بارہ میں آکر آبا دوسرے تو مسجد کے دیگر بزرگوں کی صرح انہیں بھی قادیان ہست یا آتا تھا ہر کسی سے یہی کہتے تھے کہ کروجدی قادیان جانا ہو۔ اور اصل قادیان وہاں جانے کی تمنا اس زمانے کی سب سے بڑی آرزو تھی ہر شخص جو قادیان سے نکلتا تھا قادیان واپس جانے کا آرزو مند تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آرزو کا صاحب کر دیا۔ خلافت ثانیہ اور ثالثہ میں یہ وقت نہ آیا خلافت راشدہ میں حضرت صاحب بڑی شان و شوکت سے قادیان تشریف لے گئے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانتا ہے۔ قادیان کی واپسی کی تمنا صرف شیخ صاحب سے مختص نہیں تھی سب لوگ اسی تمنا کے اسیر تھے مگر شیخ صاحب کو دیکھا کہ قادیان کے ذکر پر ایک آہ ہی بھرتے تھے۔ ہمارے استاد ماسٹر نذیر احمد رحمانی مرحوم نے یہ نکتہ ہمیں بتایا کہ قادیان کا ذکر کرتے ہوئے اہل قادیان کے سینہ سے جو آہ نکلتی ہے اسے ہوک اٹھنا کہتے ہیں ہوک کا مطلب اس مثال سے ہمیں سمجھ میں آیا تھا۔

شیخ صاحب کے ذکر کا فیض ہے کہ اپنے دادا جان کے بارہ میں کچھ لکھنے کی تحریک ہوئی ہے ہمارے دادا جان مولوی محمد فضل خان چڑگا سکال ضلع راولپنڈی کے مالک راجپوتوں میں سے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنے علاقہ کے معززین میں شمار ہوتے تھے

۱۹۰۹ء کے اوائل کی ہے۔ وہاں نے حضرت ائمہ کی خدمت میں سے جا کر مرہٹوں کی خدمت کی۔  
حضرت صاحب کی طرف سے خدمت صاحب کے تحت سے جواب دہ رہا۔ پچھلے سال وہاں  
رہیں مددگار خادمہ دین ہوئے۔ یہ جواب جو ایک کارنامہ تھا، وہاں اس روز موصول  
ہو جس روز حضرت قدس کے وصال کی خبر پہنچی۔ وہاں جان واکھ ہو کہ وہاں وقت کو پیچھا مگر اس کی صحت  
میں رہا نام نہاد صاحب وہاں اس وقت سے انہیں ٹوٹی گئی کہ اب سب کچھ تو کراہی میں چل چاہئے۔  
چنانچہ اس سال وہاں تو دین اٹھ آئے۔ معاش کے لئے پہلے حضرت نواب مہاراجہ جیسے کی درباری  
نقدیاری اس کے بعد حضرت مرزا شریف احمد کی کوٹھی میں گئی تو وہاں مسئلہ ہوئے اور مدت العمران کے اور  
درہنہ کے دربان رہے۔ تاجا جان محمد خان اس کی طرح نواب محمد علی خان کے دربان رہے۔ چھوٹے تاج  
حافظ خان نے یکے چھانا شروع کیا اور قادیان کے مسلمانوں کو بنالے لے جاتے رہے۔ حافظ  
قرآن تھے دھرم ساری کو بھی کر رہے نہ ہوتے اور قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے۔ قادیان کی منزل تک  
پہنچتے پہنچتے مہمان کو قرآن کی کئی منزلیں نہ دیتے۔ فرمایا کرتے تھے ایک تو مہمانوں کے کانوں میں دین  
کی باتیں پڑتی رہتی ہیں دوسرے میرے تامل میں غوغا کوئی نہیں کرتا۔ وہاں مددگار کے فضل سے  
اونچے بے، درجہ کے مضبوط آدمی تھے۔ بڑھاپے میں قدرتی کیفیت نمایاں ہوئی تھی مگر اپنا کام خود کر  
سکتے تھے اور کرتے تھے مددگار کے فضل سے انہیں کسی قسم کی محتاجی نہیں تھی بلکہ کئی بار وہاں مرہٹوں کی  
خدمت کے لئے وضو کے لئے پانی نہیں۔ کر دیتے تھے۔ ادا کی جاں بیماری موتی کی وجہ سے آنکھوں  
سے اچھر ہو گئی تھیں۔ قادیان سے ہجرت کے وقت ان کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ آنکھوں سے  
مدد دہیں مگر چھڑی کے سہارے چل پھر لیتی تھیں۔ ہجرت کا صدر مہاراجہ کو لگا کر چارپائی سے لگ گئیں  
مگر چٹا نکال پہنچ کر جیسے اس کی توانائی عود کرتی شاید اس لئے بھی کہ اپنے مستقر پر واپس آ گئی تھیں۔ ہر  
کام ان کے اشارے اور مرضی سے ہونے لگا گاؤں کی بڑی بوڑھیاں ان سے ملنے کے لئے آئے گئیں تو  
انہیں معلوم ہو گیا کہ اب نہیں اپنی پرانی لکڑی دارا کرتی ہیں۔ ان کا رعب داب ایسا تھا کہ  
مرہٹوں خود گھڑ کر ان کے دو جہات ادا کرتے تھے۔ جو بار بار بکلی کی فصلوں کی بانی کا حصہ ملنے لگا تو  
ہم لوگ بھوکوں نہیں مرے، درہنہ سٹ پٹ کے واپس آ بیٹھے پر کوئی کسی کا پرسان حال ہوتا؟ دونوں

تاریخ میں مستعمل ہو گئے۔ مگر میں پتا چھڑتی تھی وہ دعائیں میں کہتے تھے۔ غرض ابوبی کے  
دعائیں سے ہم کو آئے۔ تب نور وقت شیش سے پس کا تو شیشی رشتی محی مدد سے نکل سے ہم نے  
نہیں دیکھی۔

دادا جان کے سپہ و حضرت مرزا شیر احمد صاحب کا ذرا ہم بھی تھا ہم بہ خوف و خطر اس فردت و دم میں جا  
کرتے تھے فرد و جان کا رعب ایسا تھا کہ صوفیوں کی بھی پھل و توڑنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی  
تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم بھی دادا جان کی طرح اس باغ کے ٹکڑے ہیں۔ دادا جان باغ میں ٹیکے قرآن  
پڑھتے رہتے۔ کام کرنے والے اپنا کام کرتے رہتے۔ ہم نے کبھی کسی شخص پر دادا جان کو ناراض ہوتے یا  
غصہ سے اونچی آواز میں بولتے نہیں دیکھا یا سنا۔ باغ میں ان کی موجودگی ہی اس بات کی ضامن ہوتی تھی  
کہ باغ کا رکھوالا جو کس ہے۔ یہ باغ فردت کا رکھوالا تھا۔ اس کے آم بڑے لذیذ ہوتے تھے۔  
حضرت مرزا شیر احمد صاحب کا طریق تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے دوستوں کو آموں کا تحفہ بھیجا کرتے  
تھے۔ ان دوستوں میں مولانا عبد المجید صاحب بھی تھے۔ ہم کسی دور مضمون میں کسی جگہ یہ ذکر کر چکے ہیں کہ  
ساک صاحب نے ایک بار اپنے مشہور عام انکار و حوادث میں لکھا تھا کہ "قادیان والے مرزا شیر احمد  
صاحب کو قمر الانبیاء کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر سال آموں کا تحفہ بھیجا کرتے ہیں وہ اتنے  
لذیذ ہوتے ہیں کہ ان آموں کو کھا کر ہم بھی انہیں "قمر انبیاء" کہنے کو تیار ہیں" (نبی انبیا کی جمع ہے اور  
اہل زبان آم کو انبیا کہتے ہیں)۔

دادا جان کو حکمت میں بھی شغف تھا۔ جزی ہونیوں کی پچوں رکھتے تھے اور ان سے علاج وغیرہ بھی کرتے  
رہتے تھے۔ دم درد کرنے میں بھی انہیں مہارت تھی خاص طور سے سانپ کے کانے کا دم کرتے تھے در  
لوگ دور دور سے ڈسے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر لاتے تھے۔ دادا جان کے دم سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ  
نھیک ہو جاتے تھے۔

دادا جان کا ایک وصف ہم نے یہ دیکھا کہ ان کے دادا مولوی غلام نبی مصری بڑے عالم تھے دادا جان ان کا  
حد سے سوا احترام کرتے تھے۔ پھر بھی جی سے چوتھے رہتے تھے کہ مولوی صاحب کو کوئی تکلیف تو نہیں  
اسی طرح ہمارے تاج محل خان جناب احمد نور کالی کے داماد تھے۔ وہ کبھی ہمارے گھر میں آتے تو دادا جان



اور اس سے بڑھ کر ان قدر رستہ کا ذلیل رکھتے۔ کہتے تھے نبیوں نے شہید کی جو سوسو مٹی مانی ہے۔ محمدؐ کا بھی صاحب کی مٹائی کی مٹی سے جھٹائی تھی۔ یہ مٹی یا مٹائی کی مٹائی تھی جس کی چھٹک پر سری چٹک اتری رہتی تھی۔ بچے ان غنغان گنگو پر ہستے تو وہاں بہت براہ راست۔ انہیں یہ بھی یاد ہے کہ دراجان کا انتقال ہوا تو ہمیں محمدؐ کا مٹی صاحب کو طوع دینے کے لئے بھیجا گیا۔ دو کہیں اندر اس شہر میں رہتے تھے۔ مابا دراجان کو غسل دینے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔

سید احمدؒ کا مٹی صاحب حضرت صاحبزادہ عبداللطیف شہید کے شاگردوں درجوں تاروں میں سے تھے۔ سنگ رتی سے شہادت کے بعد شہید مرحوم کی خوش کنی انوں تک وہیں پتھروں میں مڑی رہی۔ بادشاہ وقت کی طرف سے نفیس مبارک کو وہاں سے بنانے کی ممانعت تھی۔ محمدؐ صاحب نے مٹی انوں کے بعد ان کی خوش کو وہاں سے نکالا اور قبرستان میں جا کر دفن کیا۔ ان کی زبان سے ہم نے سنا کہ تھے انوں کے بعد بھی خوش مبارک سے خوشبو آتی تھی۔ ظالموں کا نفیس مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا انہوں نے قبرستان میں سے ان کی خوش کاں کر کسی مظلوم جگہ دفن کر دی کہ شہید مرحوم کی کوئی ظاہری یادگار باقی نہ رہے۔ شہید مرحوم کی یادگار تو تہذیب و تمدن کی وجہ سے اب تک باقی ہے وہ ظالم کہاں ہیں؟ ان کا نام بھی مٹ گیا نشان بھی مٹ گیا۔ فاعلمر دیا اولیٰ۔ بھار۔

سید احمدؒ صاحب کا چہرہ بہت نورانی چہرہ تھا۔ جریب ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ سر پر نفوں والے صاف کی بجائے پگڑی ہوتی تھی۔ لمبا چنڈا پہنتے تھے۔ اواخر عمر میں شاید ذہن میں اختلاس آ گیا تھا جس لئے کوچہ گرد ہو گئے تھے مگر ضعیف تھے جگہ پہ جگہ تھک کر بیٹھ جاتے تھے قادیان کے لوگ ان کے مرجعہ کو جانتے تھے اس لئے کوئی ان سے بدتمیزی سے پیش نہیں آتا تھا۔ ان کی باتیں بے ربط ہو گئی تھیں مگر کبھی کبھی ایک کام کی بات ان کے منہ سے نکل جاتی تھی کہ لوگ سردھنتے رو جاتے۔ ان کے صاحبزادے چاچا جی سید محمدؒ نور ہوہ میں لمبے عرصہ تک زندہ رہے۔ ان کی سلاجیت روہہ میں بہت بکتی تھی۔ ان کی بیٹی جو ہماری نانی تھیں دو بیٹے چھوڑ کر جوانی ہی میں فوت ہو گئیں تو ہمارے تایا نے دوسرا بیٹا نہیں کیا۔ ان کی دوسری بیٹی نہیں ہم خانہ آمنہ کہتے تھے ہمارے ساتھ بڑی محبت کا سلوک روادار کھتی تھیں۔ ان کی اولاد یہاں کینیڈا میں آباد ہے کبھی کبھار انگریزی محاورہ کے مطابق "نیلے چاند میں ایک دفعہ" سے ملاقات بھی ہو جاتی

ہے چوہدری سید محمد در سے بیٹے یا جس نے سید سے روئے ہوں کہ بارہویں ایک بڑی نہیں کرے۔

ماں مہر دہتے جب تک جیتی رہیں۔ ہر سال ساتھ اسی محبت سے پیش آتی رہیں جیسے اپنے بہن بھوں بہت مہر مع اللہ سے پیش آتی تھیں۔ اب تو ان کے دونوں بھائی بھی اللہ کو یاد رہے۔ ان کی بیٹی زینہ چھوٹی سی تھی اور مدرسہ کا مقام دینے کے لیے ہم سے کمرہ کی بیڑیا کرتی تھی حد معلوم اب وہ کہاں ہے ہمیں کوئی خبر نہ تھی اب بھی یہ ہے۔ حد آمدن کا تعلق محبتوں والی دیکھی یاد ہے۔ حد نور صادق نور لکھی یاد ہیں۔ حد آمدن سید محمد نور کا بیٹا صاحب کا بیٹا اور یہ ہیں محفوظ ہے یا نہیں؟

دارل سہد کے امام ڈاکٹر محمد طفیل صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان کی گردن کوتاہی۔ تیز تیز چلتے تھے۔ سر پر سنہی رکھتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ اس گھر سے نکلے تو لگتا تھا بھگت کرم مسجد میں پہنچ گئے ہیں ہم لوگ اس سے ساتھ گھر سے نکلے تو مسجد تک پہنچتے پہنچتے ایک رکعت قضا ہو چکی ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب دراصل ماہر صاحب تھے سکس میں پڑھاتے تھے۔ ہمیں جو زمانہ یاد ہے اس میں ریٹائر ہو گئے ہوں گے۔ سب سڑک ان کا مکان تھا۔ مسجد راہ اور ان کے مکان کے درمیان میں کال کا میدان تھا۔ دو گھر سے نکلتے اور سڑک اھر دیکھتے بغیر مسجد تک جاتے ان کے جاتے ہی ہمیں خبر کی جاتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کی آمد و رفت گھڑی کی سوئی کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمیں اس زمانہ میں تا شعور کہاں "مرد و گوس" سے سنی ہوئی بات ذہن میں رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی قرأت بہت اچھی تھی نماز مختصر اور سنوار کر پڑھاتے تھے۔ نماز میں تیزی نہیں آتے تھے۔

ڈاکٹر محمد طفیل صاحب کا ذکر آیا تو اپنے چوہدری مظفر الدین صاحب یاد آئے جو اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں سمجھتے تھے مگر ہمارے سب بچوں کے معانی تھے۔ چوہدری مظفر الدین بنگالی ریویو انگریزی سے ایڈیٹر تھے مگر دیکھنے میں نہ ایڈیٹر لگتے تھے نہ ڈاکٹر۔ ان جیسے سادہ اور نرم و ملائم آدمی ہم نے دیکھا ہی نہیں دیکھے ہمارے اہل کوان کے دست شفا پر بڑا اعتقاد تھا۔ بچوں میں سے کسی کو چھینک بھی آتی تو فوراً آہٹیں جا چوہدری مظفر الدین صاحب سے دوائے کرف اور آفرین ہے چوہدری صاحب پر کہ دو پہر سورات سوان کے آرام کا وقت ہو کسی بھی وقت ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا ان کے چہرہ پر کبھی ناگواری کے

ہمارے ہم سے نہیں دیکھے۔ سفید مٹا کرتے ہیںے جینٹل کا۔۔۔ رکھتے۔۔۔ رش کی سیت سنتے۔۔۔ چھٹی  
جسٹائی تانڈ کی پریڈیوس میں ہوئیو پیتھک دوا یاں ہرے سیتہ سے ڈر لڑن پناں ہاے گتے۔۔۔ اول  
کے سارخہ وہ مٹی مٹی پناں بناتے رہتے اور ریرب پنچو پڑھتے رہتے۔۔۔ اس کے ہاتھ کی مٹی ہوئی مٹی مٹی  
پناں بڑی شفا بخش ثابت ہوتی تھیں در یہ ساری خدمت دو محض خدمت کی غرض سے کرتے تھے کوئی مالی  
منفعت ان کا مقصود نہ تھی۔ ہوئیو پیتھک ملان ان کا ذریعہ و درکار نہیں ذریعہ خدمت خلق تھا در ہم نے  
کم لوگوں کو اس خدمت کو بشت سے سر انجام دیتے دیکھا ہے۔ ہوئیو پیتھک علاج کے سیاق و سباق  
میں ثابت قدمی اور بشت قلمی سے علاج کرنے والے حضرت مرزا صاحب احمد ظیفہ مسیح اربع بھی تھے۔  
وہ مریض کی بات جس انہماک سے سنتے تھے اور جس طرح خوش دلی سے دوا دیتے تھے وہ اپنی جگہ ضرب  
مثل ہے۔ چوہدری مظفر مدین صاحب بنگال قادیان کب آئے اور کب سے وقف کیا ہمیں علم نہیں ہم  
نے ربوہ میں نہیں دیکھا شروع کیا۔ ہاں کچل دے ہو گئے تو ان کے علاج سے استفا دو کا موقع ملا۔ ان  
سے زیادہ نرم خو کوئی نہ دیکھا۔

بنگال کے دو تیس دیہاری جانا پچن کے ہیں۔ اپنے صوفی مطیع رحمن صاحب۔ امریکہ کے مبلغ  
رہے۔ ہم نے جب انہیں دیکھا اس وقت صاحب فرماں تھے اور معذور۔ ان کا بیٹا خلیل ہمارا شاگرد ہو۔  
خلیل بچہ را بھی ہے باپ کی طرح معذور کی تک پہنچی اور جوانی ہی میں معذور ہو گیا۔ اتنا اس کے بار  
بچوں کا حذور و ناصر ہو۔ آمین۔ اس کی بہنیں بہت سی تھیں خدا معلوم اب کہاں ہیں؟ دوسرے اپنے ماسٹر  
عبد رحیم صاحب بنگالی۔ ہم نے ان سے انگریزی پڑھی۔ انگریزی کے اصل استاد تو میں محمد ابراہیم  
صاحب جمونی تھے مگر کبھی کبھار ماسٹر بنگالی صاحب بھی کلاس لیتے تھے ان کی دوا دہ میں سے کہاں مدین  
مروجہ در جمال الدین ہمارے شاگرد ہوئے۔ کمال الدین پکارا جوانی میں نوجوان بچے چھوڑ کر راہی رہتا  
ہوا۔ اب اس کی اور دیہاں کینیڈا میں ہے۔ اس کی امی آ پامینا اور چوہدری مظفر الدین صاحب کی بیگم  
پار شیدہ ہادی بہنیں ہیں۔ اب بات ایک اور بے نفس آدمی طرف مڑ گئی پہلے ان کا ذکر کر لیں تو بات  
کے پڑھے۔

قادیان میں ہمارے محلہ میں یک بزرگ اور بوڑھے رسالہ دار با کرتے تھے رسالہ دار سردار محمد ود خان۔

پہلے ہی سے اصرار کرتے رہے تھے کہ صاحب کی حالت پر مستعد ہو جائے۔ ہم جیسے  
 لوگ تو اس وقت تک اس صاحب کی زندگی اور ان کے اپنے مایوس حالات سے واقف نہیں تھے۔ وہ اس  
 ادیب صاحب کی سوانح مصرت پر مختصر اور صاحب پر مبنی مآثرات کی ایک ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں  
 لکھ چکے تھے۔ ان میں سے ایک کتاب تھی کہ صاحب کی اس کا خیال ہو گیا۔ اس وقت سرور کریم و خان  
 برہانوی نے عمر میں تھے مگر اس کی سرارت اور طبع کو سمجھتے ہوئے وہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھوا کر حضرت مولانا محمد  
 نعیم صاحب حدادی کی لکھی گئی تھی۔ ان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ہمارے ہاں یہ پچھونچے کا نام نہ رہا تھا اور وہ  
 یہ وہ میں بھی عمر پانے کے بعد فوت ہو گئی۔ ان کی بیٹیاں پائینڈ اور رشیدہ تھیں ایک ہاں سر عبدالرحمن بنگالی  
 کے مقدمہ میں آئیں اور ایک چوہدری مظفر مدین بنگالی کے صاحبزادے کے مقدمہ میں۔ ہمارے یہ بیٹھیں حضرت میر  
 مسعود احمد میر، ذوالحمدر میر سید محمود، احمد، سرور کریم و خان صاحب کو ہم  
 قادیان کے زمانہ سے جانتے تھے اور انہیں پچھونچے کی مبنی کہا کرتے تھے شاید اس وجہ سے کہ ہمارے پچھونچے  
 جی کی ایک بہن جو پچھونچے کی تھیں وہ سرور کریم و خان صاحب سے بڑی بھائی تھیں جو ان کے عزیزوں میں  
 سے تھیں۔ ان کی بیٹی پچھونچے کی تھیں جنہوں نے جنیوٹ میں سکون کی قیام کے دوران ہمارے بہت دیکھ رکھے  
 کی۔ قادیان میں ہجرت کے وقت ہمارے بیٹھک میں ایک تو چچا رفیع حیات کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک  
 واصلی تھی ایسے انداز کا فہم و ادب اور ایک آپٹیمی کی تصویر تھی جس میں وہ ہمیں گود میں اٹھائے بیٹھی ہیں۔  
 ہجرت کے کوئی بارہ تیرہ برس بعد ہم قادیان گئے۔ بیٹھک میں وہ تصویر اور واصلی اسی طرح موجود تھیں۔ کوئی  
 سرور صاحب اس گھر میں مقیم تھے ہم نے کہا یہ ہمیں دے دیں کہنے لگے نہیں یہ لکھائی بہت خوب صورت  
 ہے میں نہیں دے سکتا اور دوسری تصویر تو یہ میری بیٹھک کی، حد ذکر کوریشن ہے۔ ہم نے اسے بتایا کہ اس  
 تصویر میں جو بچہ ہے وہ ہم ہیں۔ کوئی صاحب ذوق تھا کہہ گیا ”تو بھر گود سے نکل کر بھاگ جائیں۔ میں  
 تصویر نہیں دے سکتا۔“

جن پچھونچے ارادہ کا ہم نے ذکر کیا وہ بھی بڑی صاحب ذوق تھیں۔ ایک بار خود نے لکھی کہ میں حنا اور  
 گاؤں میں استانی تھی۔ لڑکیاں بہت بدتمیز اور جھگڑا لاتی تھیں۔ ایک روز بہت شور مچا رہی تھیں۔ درمیان  
 مسلسل انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ چپ نہ کئے تھیں۔ سکون میں ایک دھڑک

ہارنہ تھی اس پر غصہ آیا۔ اوٹھ اس کے بعد آگئی اور لڑکیوں سے پہنچنے پر تمہیں قد بدلتی ہو سکتی تھی  
 بات سے ہوتی رہی میں اور تم کوئی شک نہیں جو کہ اب جو کسی نے منہ سے آ رہا ہے وہ میں سے ہے۔ اچھا  
 گھوٹ دوں گی نہ کہنے لگیں اس بات پر سب سے زیادہ ڈنکی اس کی "ناروہ بندی" پر مجھے اس کے اس  
 کی نیک نیتی تھی کہ لڑکیاں چپ ہو گئیں اور میں اب تک اس کے ہینے پر منہ رہی ہوں۔

-----

## گورڈز میں کے اعلیٰ

مس طرح درخت اپنے پھل سے بچھا جاتا ہے اسی طرح شہر اپنے مینوں سے بچتے جاتے ہیں۔ شہر محسوس گلی کوئیوں پر مشتمل نہیں ہوتے۔ ہر شہر کا چاروں طرف اس کے مینوں کی افراط و تفریط سے معمیں ہوتا ہے۔ ایسے شہر اور بستیوں جہاں دوسروں کی دودھری کسی ایک ٹھوکے کے گرد گھومتی ہو دوسرے شہروں سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ رہنے والے کی بستیوں میں بھی فردوسی رہتے ہیں مگر ان افراد کا مزاج دوسروں سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ لوگ غریب مومن یا امیر، چھوٹے بڑے معاشرہ انہی سے بنتا ہے مگر کسی بستیوں میں نیکروں کے ذمیر میں سے ہیر۔ بہت نکلتے ہیں یعنی گورڈز میں سے ایسے ایسے اعلیٰ ہائے بہرہ نکل آتے ہیں کہ ان کی سب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ فردوسی دوسروں نے، اسی بات کو ذرا اور طریق سے کہہ دیا کہ "خاستارانِ جہاں را کھرت مگر"۔ پھر خاقانی حقیقی کی سنت ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بعض شہروں میں ایسے وجود پیدا کرتا رہتا ہے جو اپنے ارد گرد رہنے والوں کے لئے رشد و ہدایت کا موجب بنتے اور خاک کے ذروں کو یکساں بنا دیتے ہیں۔ آس و کہ خاک را بہ نظر یکساں کنند ایہ مضمون ایسی ہی بستیوں کے ایت ہی افراد کے ذکر پر مشتمل ہے جو بہ ظاہر غریب لگتے تھے مگر اپنے مرشد کامل کی نظر سے یکساں بن گئے تھے۔ رُت اشعث اغبر!

اس نے برصغیر کی تقسیم سے قبل ایک چھوٹے سے قصبہ میں آنکھ کھولی۔ سن شعور کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ قصبہ تو چھوٹا ہے مگر اس کے بننے والے چھوٹے نہیں ہیں۔ ہر شخص جو دیکھنے میں غریب و مسکین نظر آیا چشم بینا کی نگاہ سے دیکھتا تو اسے علم اور صبر میں مبتلا پایا۔ ایک بزرگ تو خود اپنے گھر کے اندر تھے۔ طبیعت کے غریب مگر علوم دینی سے مامور۔ مرشد نے کہہ دیا کہ فلاں کتاب کا ایک فن لے لے جو اس وقت مصر کے کتب خانہ میں ہے ہمارے پاس وہ کتاب ہوتی تو خوب ہوتا۔ یہ غریب اعلیٰ شخص تھا۔ سفر کی اجازت چاہی، پایا اور مصر کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ یہ بیسویں صدی کی بات نہیں کہ ہر قسم کے وسائل سفر میسر ہیں۔ انیسویں صدی کے برصغیر کی بات ہے جس میں چار کوس کا سفر بھی کالے کوسوں کا سفر سمجھا

جاتا تھا۔ اقبال فیذاں، منز میں مارتا، سفر کی صعوبتیں کھیپتا، ہنس چاہیے۔ وہ اس پہ تو معلوم ہو کہ اس کتاب کو رشتہائی سے قتل کرنے کی جرات نہیں۔ باریک بینی میں اس سے قتل کرنا تو بڑا ہی گھریلو فرس باریک تحریر کو سیاہی سے روشن کرنا اور جزو بہ جزو اپنے مرشد کو بھیجتا ورنہ میں سینہ رہا۔ پھر سب خانہ وادوں نے اس پر بھی پابندی لگا دی۔ کچھ حصہ اس کتاب کا باقی تھا۔ یہی طریق سوچا کہ ہر روز کچھ حصہ اس کا حفظ کرنا اور گھر پہنچ کر اسے لکھتا اور مرشد کی خدمت میں ارسال کرتا رہتا تا اس کہ کتاب مکمل ہوئی۔ جتنا حصہ وہں گذر، عہد دوسری صحبت میں گذرا۔ مرشد کے حکم کی تعمیل کے بعد وہی کا قصد کیا کہ سب وہاں رہنے کا کوئی جواز ہائی نہ تھا۔ واپس پہنچے تو اپنے معاشرہ میں ”مصری“ کے نام سے موسوم ہوئے ایک دینی مدرسہ میں عربی زبان و رسوم و حدیث کا درس دینے لگے۔ ہزاروں کو فیض پہنچایا۔ ہم نے ہوش سنبھال تو ہر شخص کو ان کا احترام کرتے پایا۔ جدھر سے اس کا گذر ہوتا لوگ باگ اذرو احترام و سرست چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے مگر ہم نے انہیں کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھتے نہیں دیکھا۔ سر جھکائے، خاموشی سے گذرتے چلے جاتے۔ سوٹ ملتے رہتے، بعد وہم نے جانا کہ یہاں لفظ و جملہ سبحان اللہ اعظم کا ورد کرتے ہیں۔ اول تو محضوں میں جانا انہیں کھلتا تھا مگر کسی دینی مجلس میں شریک ہوتے تو خاموش بیٹھے کہنے والوں کی باتیں سنتے رہتے۔ ان کا سکوت پہاڑوں کا سکوت ہوتا تھا۔ یہ بزرگ ہمارے پھوپھا تھے۔ ہمارے دادا کہ ہم نے انہیں دیکھا تو سوسے و بچے ہو گئے تھے مگر اس بڑھتی کی عمر میں بھی تو نا اور ماننے تھے، قد بھی سڑھے چھ فٹ سے زیادہ تھا، بڑے رعب و اب کے انسان تھے مگر ہمارے ان پھوپھا سے جوان کے دادا دتھے ملتے تو نہایت عجزی اور احترام سے انہیں ملتے۔ کہتے تھے مام آدمی ہیں ہم ان کی بربری کہاں کر سکتے ہیں؟ پھوپھا گھر میں تشریف لاتے تو ہماری پھوپھی سے پوچھتے ”کلرا ہے؟“ جو کچھ ہوتا وہ پیش کر دیتیں اور یہ بسم اللہ کہہ کے ماحضر تادوں کر لیتے۔ تھوڑے کی شکایت یا مزید کی فراہم کر کے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہم سوٹ اپنے آبائی گاؤں چنگا بکیاں میں چلے گئے۔ دادا اس گاؤں میں زمین کے، لک تھے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، آبائی زمین جو کچھ بھی تھی بڑی پر تھی، سارے خاندان کو حق بارانی زمین سے اپنا رزق کشید کرتا تھا۔ اس وقت میں ہم نے پھوپھا کی کوئی بار بار جہرہ اور کئی کی روٹی کو پانی میں بھگو کر چباتے دیکھا۔ بچوں کے لئے گھر والے لمبی کا انتظام کر



بیٹہ تھے بڑوں کے لئے اور کسی بھی کنیت نہیں کرتی تھی۔ بڑے بڑے اباء جیسا کہ فیدی کے طور پر  
رہا۔ پارہہ سے گئے تھے ایک ڈیرہ۔ اس کی پشت کے بعد رہا۔ وہاں تک کہ وہاں بھی اس مشقت  
سے نجات ملی اور سمجھی گاؤں چھوڑ کر سنائی سستی میں آئیے جو اولوالعزم صاحب حرمین نے ربوہ کے نام سے  
بنائی تھی۔

مگر اس سستی میں جو ہم چھپے چھوڑ گئے تھے صرف یہی ایک روشن نہیں نہیں تھے سارا شہر ہی چمکتی پیشانیوں  
واووں سے مبرا ہوا تھا۔ ایک بڑے کو دیکھیں انہوں سے وہ بچی شلوار پہنے اپنی بھینس کو چاروں طرف رہے ہیں۔  
معلوم ہوا ایف سی کالج کے گریجویٹ اور انگریزی کے عالم ہیں اور قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ ان کا  
دور دور تک مشہور ہے اور مستشرقین اس کا حوالہ فقر سے دیتے ہیں۔ مشہور تھا کہ سلام کرنے میں کسی کو  
بیس نہیں کرنے دیتے۔ ہم نے ایک ہار اپنے بچنے کی ترنگ میں اپنے ایک ساتھی سے مل کر یہ منصوبہ بنایا  
کہ ہر چہ ہوا ہوا۔ آج ہم نہیں سلام میں پہل نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ ہم نے دور سے دیکھا کہ وہ  
بزرگ اپنے خیالات میں مگن سر جھکائے پڑے ہیں۔ ہم لوگ ان کے گھر کی گلی میں گونے پر دو بک کر  
کھڑے ہو گئے کہ آج بھائی سلام میں پہل کیسے کریں گے ہم ان کے قدموں کی چاپ سنتے اور اندازہ  
لگاتے رہے کہ اب موڑ موڑے کہڑے، اتنے میں زور سے آواز آئی ”السلام علیکم“۔ ہم نے علیکم  
سلام کہہ کر پوچھ ہی لیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم وہاں ہیں؟ کھڑے ہیں؟ مسکرائے، فرمایا  
”میں گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے احتیاطاً اسلام علیکم کہا کرتا ہوں آپ جواب نہ دیتے تو کوئی فرشتہ جواب  
دے دیتا۔ ایسے لوگوں کو آدمی فرشتہ نہ کہے تو کیا کہے؟“

ایک شعر کو دیکھ کر پریشان ہو چمپے حالوں پڑا پھرتا ہے۔ ایک روز اٹلس و کتاب کا ایک بچہ اٹھائے نظر  
آیا۔ معلوم ہوا اب بہاول پور نے ان کے کسی شعر پر خوش ہو کر خدمت بھیجی ہے اور یہ پریشان ہیں کہ یہ  
ہا، کہاں سے آنازل ہوئی؟ اس کا کیا کروں؟ دوستوں نے کہا پنوا خاترات سے فرمایا ہم ایسے خاک  
نشینوں کو سزاوار نہیں کہ اس تکلف سے اپنے ہن کو لودہ کریں۔ یہ شاعر وہ شخص تھا کہ حفیظ جالندھری ان  
کے سامنے زانوئے دب تہ کر کے بیٹھتا تھا۔ مگر اب غائب ہے کہ حفیظ کو یہ خلعت ملتی تو حفیظ کا رد عمل مختلف  
ہوتا۔ اس شاعر کا یہ حال تھا سر نظر اللہ جب واسکرائے کی کابینہ میں وزیر تھے تو ان کا سامنا ہونے پر اپنی

گازی سے اتر آئے اور پیش کش کی کہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جائیے، سنئے گئے اور روز مجھے ایسی سوارئی تو میسر نہیں آئی کہ میں سے بہتر ہے جس میں یہ اترت میں رہوں۔ وہ یہ کہ میری کوٹھی پر چل کر رہے۔ یہ نہیں معاف دھوکوں فقیہوں کی عاداتیں کا زتہ ہوتا تھا۔ تھی دور دور کر میرے اپنی مشغل میں خلل آجائے گا۔ چھوٹی دہائی میں جب سر ظفر اللہ صاحب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر تھے، پریس وٹوں نے حسب روایت انہیں ڈر پر مدعو کیا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ پریس وٹوں کا صدر بننے آیا اور پوچھا کہ واقعی آپ ہمارے ڈنر میں نہیں آئیں گے، سر ظفر اللہ نے کہا ہاں میں سے کہ اس سے میرے دینی مشغل میں خلل آتا ہے۔ کیا عجیب کہ اس درویش بے پروا کی بات انہیں یاد ہو اور وہ ان سے یہ بات کہلو رہی ہو!

بدیہہ گوئی میں اس شاعر کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ قبل اس شعر سے خط و کتابت رکھتے ہیں اور ان کے شعروں کی برجستگی کی داد دیتے ہیں۔ حلیظ کے ہاں تو ان کے پس خوردہ کے نشانات بہت عیاں ہیں۔ ہم نے اس شاعر کو صرف ایک بار دیکھا اور وہ بھی قیس ملک کے بعد۔ داڑھی کو مہندی سے رنگتے تھے، لمبے بالوں کو کبھی رنگ دیتے کبھی یونی جھوڑ دیتے۔ طبیعت میں خنجا کا استفادہ تھا۔ غربت کے باوجود خود دار تھے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے بلکہ اپنے والے بھی سوچ سمجھ کر اور وقت دیکھ کر کچھ دیتے تھے کہ ان کا دیا ٹھکانہ دیا جائے۔ موت آئی تو مال پر میں آئی دفن کرنے والوں نے مٹی کی مانت مٹی کو سوپنے میں غمت دکھائی۔ اب ان کی ڈھیر کو بھی کوئی پہچانے والا نہیں۔

پھر یک دیہاتی وضع کے بزرگ کو دیکھا کہ تہہ باندھے دیسی جوتی پہنے سر پر بکڑی رکھے ہاتھ میں مونا سر عصا پکڑے تیز قدموں سے چلتے ہوئے جا رہے ہیں مگر تیز قدمی کے باوجود چاروں طرف وقار اور تمکنت ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتے انہیں دیکھا تو سجدہ میں زار و تظار گر یہ کہ رہے ہیں گویا ان کی روح آستانہ ہی پر پھیل کر بہہ رہی ہے۔ ان کی دعا گوئی کا شہرہ صرف شہر میں ہی نہیں چاروں ملک عالم میں تھا۔ وہ دور دور سے نہیں دعا کیلئے آتے اور یہ ان کے لئے دعا کرتے تھے وہ بارگاہ ایزدی میں ان کی دعا میں مقبول ہوتی تھیں۔ ہم نے جب انہیں دیکھا اس وقت ضعیف تھے ان کے گھر کے دروازے ہر کس و ناکس کے لئے کھلے رہتے تھے وہ آتے، بیٹھتے، دعا کرواتے اور چلے جاتے تھے۔

کار یہ مشاہدہ ہے کہ اس کے ساتھ آپ نے ہاتھ ٹھوس کرنا اہل گمراہی میں نہایت تضرع سے کیا کہ اور فرما رہی تھی کہ آئی سے رہا۔ ان سے امید ہے کہ قبول ہو جائے گی۔ شاہد۔ یہ کہ کوئی شہرہ نہیں ہو، و شش جاری تھے۔ وہ دعاؤں میں سستی نہ کیجئے۔ قبولیت دعا کو اپنی رحمت نہیں جہتے تھے۔ کسی نے نہ مانا نہ دیا کسی نے نہ دیا کوئی فرق نہیں بڑھاتا تھا۔ اس فیض کا ایک دریا تھا جو بہتا تھا۔

متوکل تھے کہ مرشد کی جانب سے کسی شہد جانے کا حکم آئے۔ چل کر رہے ہو۔ گھر والے کہتے ہی رہ گئے کہ گھر میں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، بچوں کی سکوں کی فیس ادھونی سے، آپ سفر پر جا رہے ہیں ہم یہ کریں گے۔ ذرا سنبھل گئے اب میں خدا کی راہ میں چل پڑا ہوں اب میں رک نہیں سکتا۔ جس کی راہ میں نکلا ہوا، اسی سب کا متکفل ہوتا ہے۔ بھی گھر سے چار قدم ہی گئے تھے کہ ایک انجینی ووڈ ٹا ہوا آیا اور ان کے ہاتھ میں سو روپے رکھے کہ خدا کا شخص نے اس تاکید کے ساتھ بھیجے ہیں کہ ان کا نام خدا ہر نہ کیا جائے۔ کسی نے دوائے کو ساتھ لیا اور راست میں سے گھر کے لئے خوراک و نوش کا سامان لے کر اسے لایا کہ میرے گھر پہنچو دو باقی رقم گھر میں بھجوا دی کہ تفریق میں کام آئے گی۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے متوکلین کے ساتھ یہاں سے پیار کا سوک رو رکھتا ہے۔ ایک نئی بار ہو۔ اور ان کی خود نوشت سوانح حیات "حیات قدسی" ایسے خوارق سے بھری پڑی ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک بالکل معمولی انسان تھے۔ علم کا دریا تھا بولتے تو سننے دے دے اور بخود ہو کر سنتے۔ ہم نے ان کی محض میں لوگوں کو جاتے تو دیکھا مگر ان کے وعظ سے کسی کو اٹھتے نہیں دیکھا۔ ان کے خاندان کو لوگ سات بیڑے دیوں کا خاندان کہتے تھے۔ رعب داب اتنا کہ بے خوف ہو کر مخالفین کی صفوں میں دراندہ چلے جاتے اور کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکتا نہ دے، مار سکتا۔ انیسویں صدی کے داخلہ کا زمانہ منظروں، مباحثوں، مجاہدوں کا زمانہ تھا ہر جہہ ہر آن مختلف نظریات رکھنے والوں میں مباحثے ہوتے۔ یہ ایسی مجلسوں میں بھی جہاں لپاؤ کی یا سر پھٹول کا احتمال ہوتا دراندہ چلے جاتے اور فریق مخالف کی شورش سے ذرا خوف زدہ نہ ہوتے۔ ان کے پاس وہ خطیبانہ رنگ نہ تھا جو اس دور میں بڑا زور اثر سمجھا جاتا تھا اور لوگ منبر رسول پر کھڑے ہو کر پنے جھوٹ کا ٹانا پانا بھی فصاحت و بلاغت سے بنتے تھے۔ غفلتوں کے طوطے مینا بناتے اور عام عوام سے دواہ و دھوکے کرتے تھے مگر ان کی بات سادہ و پرتاثر ہوتی تھی لفظوں کی جادوگری کی بجائے روحانیت کے خمیر سے اپنی باتوں کو جود دیتے تھے۔ کسی

سے لوگ ان کی محفوض میں جاتے تو جگر میٹھ جاتے تھے نہ سسکتے تھے۔ بڑے بڑے بہاؤوں میں  
تھے اور ایسے تھے تہذیبوں و ذہنوں سے منور نہ تھے۔

انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید بھی بہت حاصل تھی جو بات کہہ دیتے تھے اسے پورا کرتا۔ پورا دھوقہ اپنے  
روحانی تجربات کا ذکر کرتے اور لوگ ان تجربوں کے گواہ ٹھہرتے۔ ہم نے اس بزرگ صوفی کو عام لوگوں  
کی طرح چھتے پھرتے، در زندگی کرتے دیکھا ٹرگتا تھا اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس دنیا کے نہیں ہیں  
کسی اور دنیا کے باشندے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد یوں محسوس ہوا کہ ہمارے سروں سے قبولیت کا  
سایہ ٹھہ گیا در ہم ٹری دھوپ میں ننگے کھڑے رہ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں قبروں پر جا کر مٹیں  
ماننے کا روٹ نہیں درندہ لوگوں سے حید نہ تھا کہ پیر پرست لوگ ان کی ذہیری کے مجاور بن بیٹھے۔

ایک بزرگ کو دیکھی کہ سر پر بڑا سا بگڑا ہاتھ اور بر میں لب سا چنڈ پہنے چلتے ہیں۔ معلوم ہوا فقہ کے  
بڑے عالم ہیں در دینی موم میں تیرے ہوئے ہیں مگر باتوں میں وہ سادگی کہ دیکھنے والے کو ذرا گمان نہ  
گھڑے کہ وہ کسی بڑے عالم اور محدث کے دروہ ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ کہ تم  
میں سے بڑا وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔ ہم نے اپنے ارد گرد ایسے بڑوں کو دیکھا تھا جو دیکھنے میں بڑے  
نہیں لگتے تھے۔ اب تو وہ زمانہ آ لگا ہے کہ چھوٹے بھی بڑے بنتے ہیں۔ جو در حرف پڑھ گیا وہ گویا مولوی  
در محدث اور مولانا ہو گیا حالانکہ ایسا علم جس سے تکبر پیدا ہو اور جس کا حاصل کرنے والا منکر ہو جائے  
اس قابل ہے کہ اس پر تین حرف بھیجے جائیں۔ اور ایسے ہی خود ساختہ علماء کرام ہمیں لے بیٹھے ہیں۔

ایک میاں فقہ کے ذرا فریبی ہنسٹھ کو دیکھا کہ ارد گرد سے بے نیاز، اپنی دھن میں مست چھ آ رہے ہیں  
۔ سر پر پانی وضع کی کرکشی کی سرخ ٹوپی ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے پاؤں میں مٹی سے اٹا ہوا جوتا ہے۔  
انہیں کسی نے روک لیا ہے اور وہ اس کو کوئی مسئلہ سمجھ رہے ہیں۔ بات دھکی لہجہ دھیمہ، مضمون مشکل مگر  
سمجھانے والے کا مکمل ہے کہ اس نے اس مشکل مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ سننے والے مطمئن ہو کر اپنی راہ لیتے  
ہے سمجھانے والا اپنی دھن میں لگن آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ علم ادیان کے ماہر ہیں۔ نماز کے بعد مسجد میں  
درج حدیث دیتے ہیں تو لوگ عیش عیش کرتے ہیں اور در در سے ان کے درس میں شامل ہونے کے لئے  
آتے ہیں۔ ان کا تعلق دلی کے میر درد کے گھرانے سے ہے۔ ایک دینی مدرسہ کے میر مدرسہ ہیں۔ قیاموں

بہ آراءوں کے میں ہیں، اور دستہ آہ آہ کرتے درجہوں کا بیٹھتے ہیں۔ ان ہے آراء  
۲۰ میں سے کسی ایک سے میں کی مسجد میں نہیں ہے۔ اور قادیان میں۔ جو شخص اپنی جگہ میں وہاں  
کا رہ رہا ہے۔ جس کی یہ کام کر رہا ہے؟ وہ اور ہم نے جس معاشرہ میں آگے صوفی تھی اس میں وہ صوفی  
سب سے مقدم سمجھا جاتا تھا۔ اور ہے۔ غیر ممکن کو یہ ممکن میں میں آتی ہے۔

۱۔ وہ ایک دربرگ نظر آئے۔ سادہ کپڑوں میں بیٹھ کر پروردگار پر بندھی ہوئی تھی، وضع قطع سے  
بڑے باوہر تھے ہیں۔ اس کے گورنمنٹ کالج کے پڑھے ہوئے یہ آئے۔ انگلنڈ میں اسلام کی  
اشاعت بھی کر چکے ہیں۔ اس ایک عجیب و غریب ہیئت کی لیے انجن کی گاڑی میں دھول میں اٹے بیٹھے  
ہیں۔ معلوم ہوا انہیں مرشد کا حکم ہے کہ اپنے حلقہ سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انٹیشن کریں۔ بھلا ایسی پھینچ  
گاڑیوں پر انٹیشن کرے جاتے ہیں؟ مرشد کا حکم ہے اللہ نے چاہا تو جیت انہیں کی ہوگی۔ اور ہوگی  
تقسیم ملک کے وقت یہ پنجاب پہلی کے رکن تھے مگر فرقہ وارانہ تو اس قیدیوں کی طرح انہیں سی کلاس  
میں سزا پڑا۔ ہمارے اب بھی ان کے ساتھ قید میں تھے ان کا کہنا ہے کہ یہ ایم ایل اے (یعنی ممبر اسمبلی) نہ  
پہلی (غریب مملوک جس خارش زدہ لیدیوں میں جو بیٹھتا اور انہیں سمجھا تا رہتا، لوگ کہتے خارش  
چھوٹ کی باری ہے آپ کو مل جائے گی جو بے ملتا کیا فرق پڑتا ہے خارش ہی تو ہے کوئی مہلک بیماری تو  
نہیں ایہ معمول قید کا سارا عرصہ جاری رہا۔ رہا اور آئے تو اسمبلی کے اجلاس میں چلے گئے گویا پکک سے  
واپس آئے ہیں۔ ہم نے انہیں اپنے ابا کی دوستی کے واسطے بہت قریب سے دیکھا۔ بڑے آسودہ حال  
زمیندار خاندان سے تھے مگر سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر کے اس  
بستی میں اٹھ آئے تھے۔ اپنی وفات تک کام میں منہمک رہے۔ وقت آیا تو خاموشی سے جان جاں  
آفریں کے سپرد کر دی تقسیم ملک کے بعد کے زمانہ میں اس ہی بستی کے ارد گرد کے حوض کی قربت کا کام  
ان کے سپرد تھا جنہیں لوگوں میں گھل مل کر بیٹھ جاتے۔ ان کی زبان میں ان سے گفتگو کرتے ان کے دکھ  
درد میں شریک ہوتے۔ دیکھتے دیکھتے سنے ماحول کی اجنبیت ختم ہو گئی لوگ انہیں اپنا جاننے اور سمجھنے لگے  
جیسے برسوں کے یار مانے ہوں

ایک برگ روٹی بھر لیا چھ (جسے دلی والے لکھتے ہیں) پہنے چلے آ رہے ہیں۔ اس شریف اسی سے

ریا، سوگا، می سید، زہمی سے مراد سڑک کی گڑبڑ ہے۔ ہاتھ میں حربہ نہ کڑی ہے۔ یہ بڑگ  
مریکہ اور ایران، عرب میں عدم ۶۵ مہینے کر چکے ہیں۔ بضعیف ہوئے ہیں مگر میں منہ میں ۱۰  
بھر ہے۔ نمازیں تو مسجد میں جا کر پڑھتے ہی ہیں صبح کی مٹی ان کا معصوم ہے۔ ان کی آواز میں بڑی  
مدعت ہے۔ جوانی میں، اُس پرے ملک میں ہوتے تو، شہر میں مستشرقین کے استقبال و مشاہدت کا فرض  
نہجہ ایتھے تھے۔ ہم نے یک ہنگامین مستشرق ڈاکٹر جولیسن جرمائش کی کتاب میں ان کا ۱۹۳۰ کا ایک  
فوتو دیکھا جس میں یہ اپنے مرشد کے مزار پر دعا کرتے نظر آ رہے ہیں۔ وہ یہودی تھے و قامت اور سراپا  
ہے۔ اس مستشرق کو اس ہستی کی دہی چیزیں یاد تھیں ان کے مرشد سے ملاقات اور ان کے ساتھ اس کی  
ملاقات۔ ہم نے انہیں بھی مجھ، نکس، رافرتی کا پیکر پایا۔ علم کے پھل سے لہے ہوئے درختوں کی طرح  
جھکے ہوئے

یہ وہ لوگ تھے جنہیں ہم نے اپنے بچپن درڑکپس کے زمانہ میں، لکھا اور سنا اور جن کی یادیں اب بھی آج  
بھی اس کو معطر رکھتی ہیں ان میں سے اکثر کو ہم نے تقسیم ملک کے بعد اپنے لئے، حوال میں بھی چھتے  
پھرتے دیکھ کر اب سڑک کے پار قبرستان کی جانب جانا تو اس شہر نمیشاں کا سنا بولتا اور ماضی کو  
داریں ایتا ہے۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔

## (۲)

شہر ان اور قصبوں میں آمد و رفت کے ذرائع اب تو بہت ہو گئے ہیں ایک زمانہ تھا کہ سوائے تیل گاڑیوں  
یا یکوں تاگوں کے اور کوئی وسیعہ، سفر میسر نہ تھا۔ غائب کے زمانہ تک یہ حال تھا کہ غائب نے نکلتے تک کا  
آئز سڑ تیل گاڑی کے ذریعہ یا گھوڑے پر طے کیا تھا۔ اس زمانہ میں صاحب استطاعت لوگ گھوڑوں پر  
گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے تھے عام لوگوں کی سواری یکہ تھا یا تیل گاڑی۔ گھوڑے جن گاڑیوں کو کھینچ  
سکتے تھے ان میں تنوع نہ تھا چر گیا۔ رتھوں اور پہلیوں کی جگہ یکوں یا اکوں نے لے لی۔ بات دور نکل  
جاتی۔ ہمیں کہنا یہ ہے کہ جس ہستی کے روشن حسیوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اس تک پہنچنے کے لئے ریل تو

بہت بعد میں آئی ماحول میں تب پہنچے کہ نئے یوں اور تاجوں میں بیٹھ کر جاتے تھے قریب ترین  
 ان کا پیش بار دیکھ کر وہ صدمہ برپا تھا۔ مسیت مند مرنڈ کی زیارت کے لئے آتے تو ریل نہیں پارو  
 میل پر تار دیتی وہاں سے آگے کا سفر تانگے یا بے میں ہوتا یا پایادو۔ بارو میل کا سفر نہ کوئی  
 سڑ نہ کوئی پل نہ پٹری تھی، ایک دے اپنے ہاڑے سے سواری کو بچھتے سسٹم اللہ مہر بہا  
 و مہر سہا، کچھ دور تک نہر کی پٹری ساتھ دیتی پھر وہی اونچا چاکیتوں میں سے نڈر تار سہا  
 مرشد کا بھی یہی علم تھا کہ مہمان آتے تو پیچھے جاتے، رخصت ہوتے تو مشرعت کی غرض سے نہر کی پٹری  
 تک ساتھ جاتے اور دعائیں دے کر رخصت کرتے کہ جاؤ اللہ کو سونپا۔

اس بستی کے عاملوں کا ذکر آپ سن چکے وہاں کے یکہ بانوں میں بھی عجیب و غریب پیدا ہوئے۔ ایک  
 صاحب تھے۔ حافظ قرآن، ہاتھ پیر سے مضبوط۔ کوئی اور کام کرنے کی بجائے یکہ چلانے لگے۔ معموں  
 یہ تھا کہ سواری بٹھاتے تو قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے۔ ہم نے اپنے ہوش میں نہیں یکہ بانی کرتے  
 نہیں دیکھا کہ یہ کام وہ ترک کر چکے تھے اور زمیندارہ کا کام کرتے تھے وہاں بھی یہی عام تھا کہ مل جوتے  
 اور تلاوت کرتے رہتے۔ بیویوں کو گایوں کی بجائے دعائیں دیتے رہتے۔ پھر وہ زمانہ بھی ہم نے اپنی  
 آنکھوں دیکھا کہ قریب کے شہر تک جانے کی ضرورت ہوتی تو دوسروں کے یکہ میں نہ بیٹھتے، پیدل چلتے یا  
 گدھے کی سواری اختیار کرتے۔ کہتے تھے میں یوں میں اس لئے سوار نہیں ہوتا کہ یکہ بان اپنی روزی  
 کمانے والے جانور کو کوسے اور گایوں بکتے رہتے ہیں۔

اپنی ہوش میں ہم نے یکہ تانگے والے کو دیکھا کہ گم سم اپنے تانگے پر بیٹھ رہتا ہے۔ سواری خود چل کر  
 آئے تو آئے وہ کسی کو بلا تا نہیں۔ جو سواری مل گئی اس نے جودے دیا سولے یا کبھی زیادہ کے لئے جت  
 نہیں کرتا۔ ہم نے سوچا خوب آدی ہے ایسے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے چنانچہ ہمیں جب بھی تانگہ لینے  
 کی ضرورت ہوتی ہی کورمت دیتے۔ اسے بھی عام تانگے والوں کی طرح باتیں کرنے کا لپکا نہیں تھا  
 خاموشی سے گھوڑے کو ہاتھ رہتا۔ کئی بار اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں کھلا۔ ایک بار  
 ایک صاحب لاہور سے اپنی بیٹی کے حبیہ کا زیور لے کر بس سے اترے۔ یہی تانگہ موجود تھا اس میں بیٹھ  
 گئے گھر میں اترے مگر زیور لا ڈیہ تانگہ میں بھول گئے۔ تانگہ والا جاچکا تو انہیں یاد آیا کہ زیور تانگے کی



میں رو گیا۔ سٹی گم سوئی دیو نہ درہوں کے، ان کی صرف جگہ ہے۔ چھوڑ گئے ہوں گے کہ وہی تانگہ دو  
 بکری کی جگہ اسے لایا آتا تھا۔ یہ انہیں دیکھ کر رونا مارا۔ یہ حضرت آپ جی جی میں یہ بھلائی  
 بھی ہوئی لہذا سوچا ہے کہ اپنا سامان بھی تانگے سے نہ تارے۔ میں اذوپا، پس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ  
 آپ کی سیٹ پر کوئی چیز دھری رکھی ہے۔ وہ تو نہ نے خیر کی کوئی اور سوری اسی تانگہ نہیں بیٹھی س نے  
 میری نگاہ پڑ گئی س نے سنے پیو اس ہو ہوں اپنی مانت اپنے اور اللہ کا شکر تجھے۔ ہوں نے پک کر  
 زیور کا ڈبہ لیا اور بے مہری سے کھول کر دیکھا۔ اس پر تانگہ والے نے کہا اچھی طرح جاچ تجھے کہ آپ کی  
 کوئی چیز ضائع تو نہیں ہوئی میں نے تو کھوں کر بھی نہیں دیکھا کہ س میں کیا ہے۔ ہوں نے اسے چھ  
 انعام دین چاہتا تو س نے نہیں لیا۔ بہت مصر ہوئے تو اس نے کہا اچھا ایسی ہی بات ہے تو مسجد کے چندہ  
 میں دے دیجئے میں اپنے ذاتی ضرورت کے لئے امانت داری کا انعام نہیں لے سکتا۔ ایسے ایمان دار بہت  
 ہوتے ہیں کہ دوسروں کی مانت امانتیں مگر ایسے کہتے ہیں کہ کوئی اپنی خوشی سے بچھوے تو اسے مسجد کے  
 چندہ کے طور پر دے دیں۔ ہوں گے مگر یقیناً "الشاذک لیسعدوم" کے حکم میں ہوں گے۔  
 ہمارے آس پاس ایسے لوگ شاذ نہیں تھے بہت تھے۔

ایک صاحب کو دیکھ کر دیوے میں کسی ادنیٰ حازمت پر ہیں ور، ہور میں تعیناتی ہے، جمعہ کے روز ہور  
 سے نوے میل دور اپنے مرشد کے پیچھے جمعہ کی نماز دا کرنے باقاعدگی سے سفر کرتے ہیں کسی نے کہا کیا  
 اور میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی؟ سب نے ملے ہوئی ہے مگر میرا مرشد تو یہاں رہتا ہے مجھے دیوے کا مفت  
 سفر کرنے کا پاس ملتا ہے، رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھتا ہوں، صبح اپنے مرشد کے شہر میں  
 پہنچ جاتا ہوں نگر خانہ سے تھک کھاتا ہوں جمعہ پڑھ کر واپس گاڑی پر بیٹھتا ہوں اور ڈیوٹی کے وقت  
 واپس ماہور پہنچ جاتا ہوں۔ اب بتائیے میرا کیا حرج ہوتا ہے "مفت کا ثواب لیتا ہوں" یہ صاحب رینار  
 ہونے تو اپنے بیوی بچوں سمیت اپنے مرشد کے شہر میں ڈیرے لگائے۔ ہمارے بھی انہیں دیکھا،  
 طبیعت کے نہایت مسکین، مزاج صوفیانہ، علم کا ذوق رکھنے والے، اپنے بیٹوں کو کالج کی تعلیم دلوائی اس  
 ناظم سے دونوں بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے۔ چھوٹا بیٹا کہ بڑا نغمہ گو شاعر تھا، کالج سے فارغ ہو تو ملک  
 میں ملازم ہوا اور ایک روز اپنی ڈیوٹی پر جاتا ہوا اس کے حادثہ میں شہید ہو گیا۔ ہمارے کے سنے حاضر

آپ کا صبر، سچے کر صبر جس کا مطلب کچھ میں تھا۔ حرج و مرج نہ بھری گاؤں کلہ ابور حباب  
وہ وقت میں تھا۔ اور سب سے سارے، سب سے بڑھاتے اور ہم بڑھتے ہیں۔ سب سے بڑھاتی امانت  
وہی تو ہم۔ حریت کا فہم کچھ جو بڑھ گیا۔ ہمارے باپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ ہم نے ان کی یاد کو یاد  
رکھا۔ آج سے غریب الطبع صلیح کا ذکر بہ اتوان کا نام نامی سامنے آئیں۔ اور وہ لوگ کی خوبیاں ہی تو یاد  
رہ جاتی ہیں!

اپنے سکول کا کچ کے زمانہ میں جھڑ ایسے کارکن دیکھے کہ حیرت ہوتی ہے وہ تھوڑے گز اورے میں گذرا  
کیسے کرتے تھے؟ آمد اتنی کم کہ آج کے دور میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا مگر وضع، اری سی کی مالی  
قرہ بنوں کے وقت سب سے آئے۔ ہمارے ایک استاد تھے عربی فارسی کے مفتی، ادب کے عاشق،  
آمدن وہی جو ایک عام اونٹنی کی ہو سکتی تھی مگر ہر مینے، اپنی خواہ کا چوتھا حصہ خدا کی راہ میں باقاعدگی سے  
دیتے تھے اور وصیت تھی کہ میرے ترکہ کا بھی چوتھا حصہ راہ مول میں صرف ہو۔ ان سے ایک رشتہ اور بھی تھا  
کہ ان کا بیٹا جو (پاکستان کی ڈاٹ سروس کے سب سے اونچے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے) ہمارا کلاس  
فیو تھا۔ اس طرح ان کے گھر میں آنا جاتا تھا۔ ہمیں ان کے ہاں کسی تنگی کا احساس نہ ہوا شاید اس لئے بھی  
خود ہمارے ابا بھی اتنے ہی گذارے پر متوجہ تھے۔ دراصل وہ وقت ہی ایسا تھا کہ لوگ چار دیکھ کر پاؤں  
پھیلے تھے قرہ بنیاں بھی کرتے تھے اس لئے دینے والا ان کے رزق میں برکت ڈال دیتا تھا۔ ان کا  
حس یہ تھا کہ ایک بار ہماری کوئی چیز کسی رسالہ میں چھپی ہوئی دیکھی۔ راستہ میں مل گئے تو باہیں پھیل کر  
ہمیں اپنے سینہ سے لگا لیا اور اپنی جیب سے اپنا ہونہ نکال کر ہمیں دے دیا اور فرمایا میں اتنا خوش ہوں کہ جو  
کچھ میرے پاس ہے وہ تمہیں دیتا ہوں۔ ہمیں اپنے ادب کے استاد کی یہ حوصلہ افزائی بہت خوش آئی اور  
آج تک یاد ہے۔ اس ہونہ میں تو شاید صرف چار چھ آنے کی رقم تھی مگر اس رقم کے ساتھ جو بیار تھا وہ  
انمول تھا۔ ہمیں اللہ نے ایسے استاد دئے تھے۔ قبلہ شیخ منظور الہی صاحب در دکشانیے ایک بار ہمیں لکھا  
معلوم ہوتا ہے بچپن میں آپ کو اچھے استاد پسر آئے کہ آپ بے ٹکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے  
نہیں یہی کہا ”جی الحمد للہ یہ سب استادوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ دو چار حرف لکھنے کا سلیقہ آ گیا ہے۔  
اور استاد بھی ایسے استاد کہ دنیا انہیں دیکھ کر دنگ رہ جائے۔“ ان کی زندگی دست با کار اور دل بابر کا

نہو تھی بارخ وقت میں خوں نہ رہتے در لہجی کرتے رحتے سکس سے بارخ موے تو مسجد نہ  
 دینی کتب عامہ و دینی کتب کتابہ وقت اس کے ہاتھ میں نظر آتی۔ یہ سہ ماہی کے تہ کرت  
 اب قصہ لانیوں کی صحن روپا میں شے کیوں قدریں بدل گئی ہیں۔ دس اتر دس سہ ماہی کا ذریعہ  
 بن گئی ہے اس کے ستاروں کے کہ میں برکت نہیں رہی۔ دوست امداد ہو۔ جن کا فیض اسمعیل کو  
 آداب فرزند کی سکھ تاتھا۔

نبی کی عمر کا ایک شیر فروش بھی یاد ہے۔ یحیٰ۔ رب داب و آدمی۔ ررق ممانے کے سئے شیر فروشی  
 کرتا تھا۔ سامنے بڑے بڑے میں دودھ پڑ ہے اس پر بالائی کی یہ مولیٰ تہ محی مولیٰ ہے۔ جس سے جتنا  
 دودھ میا اس کے حصہ کی بالائی میحدہ سے اس کے دودھ کے اوپر الایا ہے۔ اپنے وطن میں خوش حال  
 آدمی تھا مگر مرشد کے قدموں میں رہنے کی آرزو اس جگہ کھینچ لائی ہے۔ بڑا ہے کے پاس بیٹھے قرآن  
 شریف پڑھ رہے ہیں۔ گاہک آیا۔ سے فارغ کیا پھر تلاوت میں لگس۔ بھلا ایسے نیک دگ دودھ میں  
 حادث کیوں کرنے گئے؟ سادگی کا عالم یہ ہے کہ ہمارے ابا کی روایت کے مطابق ایک صاحب آئے  
 اور ان سے کہا کہ مجھے حکیم نے ایک دوا کھانے کو تجویز کی ہے مگر اس کا بالائی کے ساتھ کھانا ضروری ہے،  
 بالائی دے دیجئے، کہنے لگے بالائی تو نہیں ہے۔ اس نے حجت کی کہ سامنے بڑا رکھا ہے اس پر بالائی  
 کی یہ مولیٰ تہ ہے آپ کہتے ہیں بالائی نہیں ہے۔ کہنے لگے میاں یہ بالائی ان لوگوں کے لئے ہے جو دودھ  
 پینے آتے ہیں کیوں کہ یہ انہی کے حصہ کے دودھ سے تری ہے میں آپ کو دوسرے کے حصہ کی بالائی  
 کیسے دے دوں؟ دیر تک حجت ہوتی رہی۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ آپ کی مجبوری ہے کہ دوا کے لئے  
 آپ کو بالائی چاہئے اس لئے میں بالائی تو دوں گا مگر اس بالائی کے پیسے نہیں نوں گا آپ دو پیسے مسجد کے  
 چندہ میں دے دیں۔ سی بزرگ شیر فروش کو پاکستان میں بھی ہم نے دیکھا مگر اب شیر فروشی چھوڑ دی تھی  
 ان کا کہن تھا اب خالص دودھ کا خریدنا اور بیچنا ممکن ہی نہیں رہا اس لئے کون اپنی عاقبت خراب کرے۔

ایک عمر رسیدہ خاتون سبستی کے گلی کوچوں میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پڑی پھرتی تھیں اور  
 بندہ آوار سے گاتی تھیں۔ و طراعتل ہوں گی؟ نہیں جناب اپنے ہوش و حواس میں ہیں، پوری ہوشمند۔  
 فکیٹ گاتی ہوں گی؟ جی نہیں کان لگا کر سننے نہیں پڑھ رہی ہیں۔ یا بہ آواز بلند ذرا ابھی کر رہی ہیں۔

سستی۔ اس کا سہارا لے لیتے ہیں۔ یہاں سے سید صاحب رحمہ اللہ نے اپنے بانی راہنہ کی شکل  
 دی ہے۔ تھک جائیں تو کھائیں، سہانے اور لیسے ہوئیں۔ کھائیں تو اس کی دینی و دنیاوی  
 پوشیدگی، اور دینی تقویٰ اور میں کی مگر وہی مشابہت یا نہ کی چیز نہیں۔ کھانے کا وقت سو گھنٹہ  
 سیدھی نگرانی کے جائیں اور وہاں سے سیر ہو کر پھر صلی علیٰ سیدنا صلی علیٰ محمد  
 علیہ وسلم تو ان کو ہم نے تقسیم کے بعد دیکھا شروع کیا۔ ان کا مینا ملک کا نام رکھا تھا، بعد اس کا نام تھا اس کا  
 نام آیا ضیاء مدین احمد سہری، جو ریڈا سہری کے نام سے جانا اور پچھنا جاتا تھا۔ ان کی وفات  
 ہوئی تو بھی اس ہستی میں نہ آ سکا کہ ملک سے باہر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے آخری دیدار سے بھی سے  
 محروم رکھا، اس کا چوتھ ضرور آیا اور دادی کو مٹی دی۔ یہ خاتون بڑی مستجاب الدعوات تھیں دوسروں کے  
 حق میں ان کی دعا میں بڑی قبول ہوتی تھیں مگر اپنے بیٹے کے باب میں ان کی ضروریات نہ سنی گئیں۔ یہ  
 معاذ تو سننے والے اور مانگنے والے کا اپنا معاملہ ہے۔

ایک بزرگ اور بھی تھے جسے چاہتے راہ میں روک لیتے اور وہی بات کہتے جو میں اس کے دل میں ہوتی،  
 سننے والا ہکا بکا نہیں دیکھتا۔ فرماتے میں نبوی یار، میں نہیں ہوں اللہ کا ایک فقیر بندہ ہوں بس تم تو بہ استغفار  
 کا دامن پکڑو اور تقویٰ اختیار کرو میرے مقصد محض تنبیہ کرنا ہے۔ بھائی نہیں۔ لوگ ان کی بھی بہت عزت  
 کرتے تھے دعاؤں کی درخواست کرنے کے در پر جاتے تھے ان کا وہیر یہ تھا کہ کوئی اپنی مرضی سے  
 بھی مذرانہ دیتا تو قبول نہ کرتے۔ مشہور تھا کہ یہ بھی مستجاب الدعوات ہیں۔ ہم نے انہیں گلیوں کو چوں  
 باز روں میں دیوانہ وار ڈکرائی کرتے دیکھا۔ پیدل چلتے تھے۔ اپنے گھر سے بہت دور اپنے مرشد کی  
 مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے آتے تھے سردی ہو یا گرمی ان کے معمول میں فرق نہ تھا فرق صرف اس روز  
 آیا جس روز ان کی سناوٹی آئی!

پرانے تذکروں میں بعض اولیاء اللہ کے بارہ میں مذکور ہے کہ رزق کمانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کام  
 کرتے تھے مگر بہ باطن دلی ہوتے تھے۔ ہم نے ایک دوست کئی اویسہ کو اپنے معشرہ میں دیکھا۔ گدھے پر  
 بار برداری کا کام کر رہے ہیں نماز کا وقت آیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسجد میں پہنچے ہوئے ہیں، نماز ختم کی  
 پھر اپنے کام میں مصروف اور ہوں پروردگار ذکر الہی۔ دل میں صلوٰۃ و درود اب پہ صلوٰۃ و درود اچوتے

کاٹھار ہے میں مغربِ اُمری سے در آنکھیں نہایت اسی سے تریں جس ملی محنت مشقت کا کام کر رہے ہیں مگر اپنے دینی مشاغل سے ما لیں نہیں ہیں۔ لوگ باب اور سے احوال کی درخواست کرنے آتے ہیں۔ کریہ نے یا نیاری کی چھوٹی سی دکان ہے نماز کا وقت ہوا تو سیدھے مسجد 'پیسے' کا کاجب ہے یا روپے کا، ب نماز ختم ہونے کا انتظار کرے۔ نماز کے وقت سارے شہر کے بازاروں میں کاروبار کا بند ہو جاتا ہے کسی عجیب ہستی میں دیکھا اور اس میں کسی جبر و اکراہ کا دخل نہیں۔ لوگ اپنے وقت پر نماز کے لئے خود اپنی دکان بڑھا دیتے ہیں۔

تقسیم سے پہلے کا ہمیں یاد ہے کہ بازار میں بند دیکھ بھی تھے مگر وہ اونچے پینار سے نماز کا جادا سنتے تو اپنی دکانوں کے پروے رُادیتے تھے۔ شہر کی ہے لہذا لوگوں کا ذریعہ ہے مگر یہ نہیں کہ صرف ان پڑھ یا کی کہیں یہاں بستے ہیں۔ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے اور پلی ٹیج ڈی تک تعلیم یافتہ لوگ سب اس معاشرہ میں موجود ہیں مگر ان کی پہلی ترجیح دین کو دنیا پر مقدم کرنے کی ہے کہ اس بات کا عہد انہوں نے اپنے مرشد سے باندھا ہوا ہے۔

اب یہاں یورپ اور شمالی امریکہ کے دنیا دار معاشرہ میں ویسی بے نفسی، بے دلی اور نیک طبعی کو ڈھونڈنا ہوس تو آنکھیں ناکام لٹتی ہیں۔ کہاں گیا وہ زمانہ کہاں گئے وہ لوگ؟ اب انہیں ڈھونڈنا چرخیار بن گیا ہے۔

-----

## رشتہ موسووت

مذہب کے چھ نیک بندوں کا ذکر آپ کی چپے ٹیڑی بات میں نہیں ملتا۔ یہ بھی جیسا ہے۔ ان ہستیوں میں جن کا ذکر ہم نے کیا، ان کو گونا گونا گوارے بتاتے ہوئے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لئے کتنا تھا۔ مرشد کا یہ کہہ کر کہ آئے والے کی دلی آکھیں چھتے مہمند کی کرتے۔ ان کا کہہ تھا کہ یہ مہمند میرے باپ سے تو آئے نہیں خدا نے بھیجے ہیں ورنہ میں تو غریب و بیکس و مٹا مٹا ہوں۔ غریبوں کو دیکھ کر یہ کہہ بھیجے ہوئے آتے ہیں کہ میں نے ان کی مہمندی فرمائی جو ان کو کرنا سول۔ اس مہمند کی کہ روایت نے اس مرشد کے ماننے والوں میں مہمندی کی ایک عظیم شان روایت کی بنیاد رکھی جو سب ایک تار درخت بن چکی ہے۔

آئے دلوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ایک بار سے تو پھر پاؤں تو ذکر میں بیٹھ رہے۔ ایک مرید باسنا سے تھے کہ پی حکمت اور طبابت کے بل بوتے پر بادشاہوں کے درباروں تک رسائی رکھتے تھے۔ مرشد نے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا اب تو آپ ہمیں رہیں گے تا اس شخص نے جس نے اپنے وطن میں رہنے کا نام کیا تو اس کی نیواٹھ رکھی تھی، پیچھے بکلا بھیجی کہ یہ تعمیر ملتی کرو، ہمیں مرشد کی جانب سے واپسی کا فائدہ نہیں ملے۔ مکان کی تعمیر ملتی ہوئی، پھر ارشاد ہوا کہ آپ علمی ذوق کے آدمی ہیں اس جگہ آپ کو کتاب کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہوگی اپنا کتب خانہ منگوائیں، چنانچہ کتب خانہ آ گیا۔ پھر دونوں بیویاں آئیں۔ اس بار وہ نے پھر بھول کر بھی اپنے وطن کو نہیں کیا۔ وہی ہستی ان کا وطن بن گئی اور وہیں بوندھا رکھ ہوئے۔ ہم نے ان کا مزار مبارک دیکھا ہے۔ اپنے مرشد کے پہلو پہ پہلو سو رہے ہیں۔

ایک دو سو تھے جو آتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھیں جس نے اس زمانہ کا مرشد ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ لوگ آتے، مہمان خانہ میں ٹھہرتے، اپنے مرشد کی اقتداء میں نمازیں پڑھتے، ان کے موعظات سنتے، ان کے ارد گرد بیٹھنے اٹھنے والوں کو دیکھتے۔ اکثر لوگ ہذا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتے، کہہ ایسے بھی ہوتے کہ عہد بیعت باندھ کر واپس پہنچتے تو وطن میں ایک طوفان ہوا ان کا منتظر ہوتا۔ یہ ہی یہ خوب اطرافین سد بزرگ کاٹل کی سرزمین سے اس چھوٹے سے قصبہ میں وارد ہوئے۔ یہ بات سے

مسترف ہوئے۔ رخصت ہوئے تو مرشد نے تک مشیت کی غرض سے اسے جانے دیا۔ بار مرشد کے حیران مہربان دیکھتے دیکھتے شہید یہ مبارک چہرہ دیکھتے دوبارہ ایک عیب نہ ہو۔ اسی ہوا اپنے وطن واپس پہنچے تو طوق و سدا میں کو منتظر پایا۔ وہ سناں سناں انیس بادشاہ وقت کے پاس لے گئے کہ مرشد ہو گیا ہے، کفر کو گلے لگا کر واپس آیا ہے۔ سدا سدا نے کافر و زندیق قرار دیا۔ بادشاہ وقت نے کہہ کر کے خدا کا معتقد تھا بہت سمجھا کہ تو بہ کر میں اور اپنے عہد بیعت کو توڑ میں۔ اس نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہدایت پانے کے بعد پھر منکرات کی جانب لوٹ آؤں؟ خدا نے فتویٰ دیا کہ ایتہ کافر کی مزی یہ ہے کہ سر باز رنگ رکھا جائے۔ بادشاہ وقت کے حکم کے موافق ان کی ناک چھید کر اس میں ٹیکل ڈال دی گئی اور اسی ٹیکل کے ساتھ کھینچے ہوئے مقنن میں لے گئے۔ لعنت حاکمات کرتا ہو ترشایوں کا جوم ہر دایا۔ کمر تک زمین میں گاڑ دئے گئے۔ بادشاہ نے تخری بار پھر پوچھا کیا اب بھی تو بہ کرتے ہو؟ جواب ملا ہدایت سے تو بہ؟ اس چاروں کی زندگی کی خاطر تم جو کرنا چاہتے ہو کر زرا میں اپنے عہد بیعت سے منحرف ہونے کا نہیں۔ منکر ملہ نے بادشاہ سے کہا پہلا پتھر آپ چلائیں۔ بادشاہ نے کہا فتویٰ دیے والے آپ ہیں آپ ہی۔ ہل بھی کریں اس پر اس معصوم پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ سب رک دینے کے بعد ان کا بغض ٹھنڈا ہوا۔ اس چاروں تک و میں پتھروں میں ٹڑی رہی۔ پانچویں دن ان کے ایک معتقد نے لاش وہاں سے نکالی اور دفن کی۔ شہید کی لاش سے شہادت کی خوشبو آتی رہی۔ مرشد کو اپنے اس بدن مریدی قربانی کی اطلاع ملی تو بہت آزر دو ہوئے مگر اس کے اہل وطن کو اجاب بھی کیا کہ اسے کابل کی سرزمین تو خدا کی نگاہوں سے گر گئی۔ اور یہ بھی کہ شہید کا خون رایگان نہیں جائے گا۔ اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ رایگان نہیں گیا۔ کابل کی سرزمین زبان حال سے مرشد کی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ "کوئی عیب ہے ان پتھروں میں سویا ہوا"۔

یہ توں جا۔ غار اس کا حوالہ تھ جو دیں کے ہو رہے یا اپنی جان کا مذاکرہ دے بیٹھے۔ مگر دراصل ذکر میں نہیانی ہی بہت سی مہمانوں کا تھا۔ ایک بار رات کے وقت ایک مہمان دور کی منزلیں مارتا اس بہت سی میں پہنچا۔ مرشد کو معلوم ہوا کہ کوئی مہمان وارد ہوا ہے۔ کھانے پینے کا اہتمام کر چکے تو معلوم ہوا کہ چار پائیوں اور بچھو۔ تو پہلے سے موجود مہمانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ مرشد نے رائیں جوائی، ایک مزدور کو جگا کر مایا،



اس کی یہ ریالی میں سے حوالے کی کہ وہیں صدی جلدی ہاتھ کے ہاتھ سے بنی ہوئی تھیں ہاتھ میں  
 لئے رکھ کے دوئے کی آوازوں میں شیف دیں، دھڑکن کو چارپائی میں سے وقت سے تو اس نے  
 مہمان خانہ میں بھاگنا کہ اس وقت کا سبب یہ ہے کہ ایک گھنٹہ میں ہاتھ میں سے کھڑے ہے اور  
 کھٹ بننے سے کہہ رہا ہے میاں در تیز ہاتھ چلاؤ مہمان کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ چارپائی بنی گئی مہمان کو  
 دے دی گئی اور یہ سب کچھ یوں ہو گیا، یہ وہی نہیں، جتنی میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ رات  
 مرشد نے ایک نوادہ مہمان کی مہمانداری میں کیا زحمت اٹائی ہے۔ ایک مہمان کے بارہ میں رات گئے  
 معلوم ہوا کہ زمین در طبقہ سے متعلق ہیں اور رات کو سونے سے قبل دودھ پینے کی عادت ہے۔ مرشد اسی  
 وقت اٹھنے کسی خادم کو جگانے کی بجائے خود ایک گلاس دودھ کا بھرا اور مہمان کو چا کر دیا اور معذرت کی کہ  
 آپ کی اس عادت کا علم پہلے نہ تھا اس لئے آپ کی خدمت میں دودھ پیش نہ کیا جاسکا۔ یہ تو اس وقت کی  
 باتیں ہیں جب اس بستی کو اور بستی والے مرشد کو دنیا جانتی نہ تھی، پھر تو وہ رجوع خدائے ہو کہ مہمان بھی  
 بہت ہو گئے خدمت کرنے والے ان سے زیادہ میسر آ گئے۔ اس بستی میں دمبر کے مہینہ میں ایک سالانہ  
 جسے ہوتا تھا اس میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سالانہ جلسے میں  
 حاضر ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ لاکھوں لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست کرنا کوئی  
 آسان کام نہیں مگر ہوتا تھا، مشکلیں ہوتی تھیں مگر آساں ہوتی چلی جاتی تھیں۔ ایک بار کی بات ہمیں یاد  
 ہے۔ جسے پراکھوں مہمان حاضر تھے، ان کا کھانا تیار کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں نانہائی درکار  
 ہوتے ہیں، کسی دشمن نے خدا جانے ان نانہائیوں کے کان میں کیا پھونک دیا کہ ان میں سے آدھے لوگ  
 ہڑتال کر کے بیٹھ گئے کہ ہم روٹیاں نہیں پکائیں گے۔ منتظمین کے ہاتھ پاؤں بھول گئے کہ اب کیا ہوگا؟  
 نانہائی روٹی پکانے سے انکاری ہیں اور صبح کا ذب کا وقت ہوا چاہتا ہے اب تک نصف سے زیادہ چولھے  
 اور توروں روشن نہیں ہوئے صبح ہا ہا کار مچ جائے گی۔ مہمان کیا کریں گے؟ ہزاروں پر نہیں لاکھوں پر نوبت ہے  
 کیا بنے گا؟ ڈرتے ڈرتے مرشد کو خبر کی کہ یہ مسئلہ درپیش ہے۔ لاکھوں مہمانوں کے لئے صبح دم روٹی مہیا  
 کرنا ممکن ہی نہیں۔ مرشد نے پوچھا ایک ایک روٹی مہیا کر سکتے ہو؟ منتظمین نے کہا جی ایک ایک روٹی تو  
 مہیا کی جاسکتی ہے۔ مرشد کی جانب سے اعلان ہوا کہ آج کوئی مہمان یک سے زیادہ روٹی طلب نہ کرے

۔ مہمانوں سے ایک ایک روٹی کھانی اور جلسہ سننے کے لئے چل پڑے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہو، شام کے کھانے کے پہلے پہلے، بزمیوں کا مسلح مسلح ہونا۔ سب کا سب معمول کے مطابق ہوتے۔ یہ بتا دیا کہ اندر سے ہم ایک قیصر کا دربار میں مہمانوں کی مہمان نوازی پر متعجب تھے۔ اس فرد کا نام میں پنجاب کے اس علاقہ کے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے جو دس دس میں میں روٹیاں تو بغیر ذکر کئے کھا جاتے ہیں اس روز میں ہم نے دیکھا کہ ایک مہمان مہمان نوازی پر مستعد بچوں پر ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا کیا ہو؟ فرما نے گئے اہم کا حکم ہے ایک روٹی کھاؤ اور یہ بچہ مجھے دو روٹیاں دے کر میرے ایمان کو آزار دہم ہے! جہاں مہمان نواز رہے تھے، وہاں مہمان بھی ان سے کم نہیں تھے۔

مہمان نوازی کا ذکر مگر تو ایک بزرگ یا آئے جو فیصل آباد کے کسی درویش کے علاقہ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے۔ بوڑھے دی تھے اپنی ہی ہم عمر سائیکل پر آتے تھے، پنجاب میں دہس کے مہینے میں خاص سردی پڑتی ہے، مگر وہ ایک کھل اور ڈھکرا سائیکل پر بیٹھ جاتے اور چل میرے سائیکل، بسم اللہ کہہ کر روانہ ہو جاتے۔ بستی میں وارد ہوتے تو سیدھے وہاں تشریف لاتے جہاں ان کے علاقہ کے لوگ قیام کرتے تھے اتفاق سے کئی برس ہمیں اس علاقہ کے مہمانوں کی مہمان داری کا شرف ملا۔ ہم نے کہا آپ اس سردی میں اتنی دور سے سائیکل پر آتے ہیں، افرام نے گئے دور سے؟ تمہارا کیا مطلب ہے؟ تقسیم ملک سے پہلے مجھے دور جانا پڑتا تھا۔ اب تو اللہ میاں مرکز اور مرشد کے ڈیرہ کو پہنچ کر میرے پاس لے آیا ہے۔ فیصل آباد کون سا دور ہے یہی تین چار دن کا سفر ہے جس دنوں کا سفر تو نہیں ایسے لوگ اپنے مرشد کی باتیں سننے کو آتے تھے۔ سارا وقت جلسہ میں بیٹھے رہتے۔ اس بستی میں لہو و لعب تو ویسے بھی نہیں ہوتا تھا مگر جلسہ کے دنوں میں تو اس بستی میں روحانی رونقیں بہت ہوتی تھیں۔ درس ہے، تہجد ہے، نمازیں ہیں، جدھر نکل جاؤ اللہ رسول کا ذکر اذکار ہے۔ مگر مولویوں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ جب تک اس جلسہ پر پابندی نہیں آتو ان انہیں چین نہیں آیا۔ اب کے برس اس شیع کے بکھرے ہوئے دانے جرمی میں جمع ہوئے۔ بچوں سزاوارک تھے۔ یورپ والوں کے لئے یہ عجیب تھا کہ لوگ دروازے محض اپنے مرشد کو سننے کے لئے کھینچے آ رہے ہیں اور حرمی کے مقامی لوگ عجیب محبت کے ساتھ ان کی خدمت پر مستعد ہیں، مہمانوں کو اپنے گھر دس میں ٹھہرا رہے ہیں ان کے کھانے پینے کے سفر حضر کے ذمہ دار ہیں۔ ان لوگوں کا آپس میں کیا

رہے؟ حرمی میں تو باب بھی اپنے بیٹے کی جگہ میں بعد اس وقت وہ نے فی جرات بتا ہے یہ  
 کہ وہ یہاں حرمی میں رہا تھا۔ ان میں تو ان کی جگہ میں حرمی نے یہ سیدھا  
 دوست ہیں کہیں باور ہی نہیں آتا کہ بچہ جس میں رہا تو اس وقت قیام و حاضری سب سے مہیا کی گئی۔ ہم نے  
 کہا میں ہاتھ ملنے کو آئی کیا ہے؟ جو دور کا کسی مہمان سے پوچھو کہ اس نے اپنے قیام و حاضری کے  
 سے بے میزبان و سیدھا دیکھ کر ہے؟ وہ بھی کہے اور کھرے حرمی ہیں۔ ہم نے چھپ کر ایک اور  
 سے پوچھ بیٹھے جب لوگوں نے ان کو بتایا کہ انھوں نے مہمانوں کی مہمان داری کرنا تو اس کی روایت ہے تب  
 نہیں یقین آیا۔ ورنہ ہماری باتوں کو باور کرنے پر دو تیار نہیں تھے۔

ہمیں اپنے قیام و حاضری کی بات یاد آئی۔ ٹوکیو سے ہمارے جاپان کے امام نے ہمیں بتایا کہ جاپان کی کسی  
 کہانی نے انمارک کی کسی کہانی سے مشینری منگوائی ہے اس مشینری کو لگانے کے لئے ایک ہمارے ہم  
 مسلک مسلمان انجینئر آئے ہوئے ہیں وہ اور کاکی سیر کے لئے آنا چاہتے ہیں کیا آپ انہیں وقت دے  
 سکیں گے؟ ہم نے کہا چشم مارڈن دیا، شاہد اسماء شریف، کہیں۔ قدم نہ و فرود آ کہ خانہ خاندان تست۔  
 وہ یورپ کے رہنے والے ہم جنوبی ایشیاء کے باشندے ایک دوسرے کو دیکھ رہے نہ جانتے ہیں۔ وہ  
 شریف، نے ہم ریلوے سٹیشن پر انہیں سے کون ضرر تھے۔ ایک ”السلام میگزین“ کی آواز بھری اور ساری  
 اجبیت ختم ہوئی۔ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قلم تمام امام ٹوکیو سے ٹوٹ کر ملے جیسے برسوں سے  
 آستانیں۔ گئے روز ہم نے اپنے جاپانی رفقاء کا رکو اپنے مہمان سے ملانے کے لئے اپنے گھر پر مدعو کر رکھا  
 تھا ساتھ میں ہماری یونیورسٹی کے ڈینش زبان کے اساتذہ بھی مدعو تھے۔ سب ٹوٹ اس بات پر حیرت کا  
 اظہار کرتے رہے کہ آپ کس رشتہ و اخوت میں منسلک ہیں؟ ہم نے انہیں سمجھایا کہ یہ رشتہ دنیا کے ہائی  
 رشتوں سے زیادہ پائیدار ہے۔ اسی طرح ایک بار پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام جاپان میں کیوٹو کے مقام پر  
 ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ ہم نے انہیں اپنی یونیورسٹی میں آنے کی دعوت دی وہ  
 تشریف لائے۔ اب پھر ہمارے رفقاء کو حیران سونے کا موقع ملا کہ کہاں فرس کا ایک نابزد درہاں دب  
 کا ایک دنیاستہ دونوں میں کیا قدر مشترک ہے کہ ایک دوسرے کو یوں چاہتے پہچانتے ہیں اور وہ نابزد  
 روزگار شخص جس سے حقائق کا موقع حاصل کرنے کے لئے لوگ سالوں انتظار کھینچتے ہیں اس شخص کی

دعوت پر با تکلف بھیجا چکا ہے۔ وہ موقع ہماری یہ نیورٹی کے لئے واقعی یا کچھ موقع تھا۔ جب پرائیمر سرمونٹل پر زمانہ تو ہمیں مہاراجہ کو پسند نہ چاہتے تھے۔ انہی دس چار سالہ صاحب کا تھا یہ محبت کے رشتے یونہی قائم نہیں ہو جاتے ان کے پس پردہ کسی مرشد کی قوت تدبیر کا فرما سکتی ہے۔ دربار کے رشتے سارے حلقہ میں حلقہ کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مودت کا وہ رشتہ جو مرشد نے اپنے نمونہ سے اپنی جماعت کے اندر قائم کیا تھا اب بھی سی طرح استوار ہے اور مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ اچھی روایتیں یونہی قائم و دائم رہتی ہیں

-----

## خدا کے کچھ متوکل بندے

میں اپنی ہستی کے رشتہ جیسوں کا ذکر کر رہا ہوں تو بارن کے خوارقِ میرے سامنے آتے ہیں یعنی ان کی حیاتِ سرکہ کے ایسے واقعات جو مہزنگی میں اقوالِ یزید سے نہیں آتے۔ ان لوگوں کا اپنے خدا سے ایسا پختہ تعلق تھا کہ ان کا خدا بھی ان کے ساتھ دیا ہی بیار کا سوکھ روا رہتا تھا۔ ہر راعی شروپہ حیثیت قومِ خوارق اور معجزات سے مایوس ہو چکا ہے اور اس مایوسی کی وجہ سے ہم اپنے مالک و خالق کو بھی اپنے جیسے مجبور و مقبور اور گونگا بہر سمجھنے لگے ہیں حالانکہ وہ بولتا بھی ہے سنتا بھی ہے۔ اُجیب ذعوف الذاع اذا دعان! کہ پکارنے والے مجھے پکاریں تو میں جواب دیتا ہوں۔

ان اللہ والوں کے ہاں توکل الی اللہ کی ایک صفت مشترک تھی جسے دیکھا متوکل و مطمئن پایا۔ ایک وجود کی خود نوشتِ سوانحِ حیات پڑھنی تو سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہ نکال پائے کہ اس شخص کو توکل کا جو مرتبہ حاصل تھا وہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ اپنے مطلب میں بیٹھے ہیں، مرشد اپنے مستقر سے باہر دہلی میں ہیں۔ حکم آتا ہے کہ ”فوراً دہلی پہنچیں“۔ وہیں اور اسی وقت اٹھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تک نہیں کہ اندر گھر والوں کو اطلاع دی کر دیں کہ مرشد کی طرف سے طلبی ہوئی ہے اس لئے اہلی جا رہا ہوں۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ جیب میں زوراء بھی ہے یا نہیں؟ لباس کی بستر کی ضرورت ہوگی۔ اتنا سوچنا تو دور کی بات تھی جو تاپہنے کی طرف بھی توجہ نہیں دیتے جاتے ہیں اور پافوس سے اپنا جوتا سیدھا کرتے اور پہنتے جاتے ہیں۔ بارومیل کا سفر طے کر کے ریل کے اسٹیشن تک پہنچے تو ایک شخص کو غصہ پایا اس نے کہا میرے گھر سے بیمار ہیں انہیں دیکھ بیچے۔ فرمایا میں رک نہیں سکتا۔ اس نے کہا ابھی گاڑی کے آنے میں کچھ دیر ہے اتنی دیر میں آپ دیکھ سکتے ہیں میرا گھر قریب ہی ہے۔ گئے۔ مرید کو دیکھا نسخہ لکھ دیا۔ اس نے کچھ رقم پر طور غدارانہ جیب میں ڈال دی۔ کتے لینے لگے تو اتنی ہی رقم تھی جتنی انہیں کتے کے لئے درکار تھی۔ اتنے میں ان کا خادم کا سامان سفر لے کر پہنچ گیا ورنہ یہ تو اسی بے سرو سامانی کے عالم میں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

ان کے توکل کا عجیب ترین واقعہ وہ ہے جو انہیں ایک ریاست میں پیش آیا۔ مہاراجہ کے دربار کی معائنہ تھے۔ داد و بخش اور صدق و خیرات کی مادت کی وجہ سے ایک بننے کے تقریباً ایک ڈیڑھ لاکھ روپے کے

مقروض تھے۔ ایک اور بنیادوں کا مریض بھی تھا جسے ”سجھیا“ کہتے تھے۔ جس کی رو میں خرچ نہ ہوا۔  
 • عجیب بات ہے کہ یہ گھبراہٹ بھی دھماکے سے نہ ہوئی تھی۔ یہ سستی دوسری سے اور ایک بھی آپ نے بہت  
 سے لوگ دس ہیں جاسے یہ لکھائی بھی لی کریں۔ آپ نے اور مسک کر خاموش ہو جاتے۔ آخر وہی ہو۔  
 دشمنوں کا اور چس لیں اور مہاراجہ نے انہیں چاہے ایک روز اور نہ فرمایا۔ آپ حسینان سے حشر آنے اور  
 وہی کے سزائی تیار کر کے لے گا، نگہ جیب میں پھونکی گاڑی تک نہ تھی۔ اور دوسرا خیر خواہ بن کر آیا  
 اور پہلے لگا کسی دن کے سنے میں آپ کو متنبہ کیا کہ تاحا ب آپ تہا قرض سے دس کریں گے اور لکھ ڈیڑھ  
 لکھ روپیہ کا قرضہ اور کئے بغیر آپ کو یہاں سے جانے کون دے گا؟ اسے میں مہاراجہ کا کارندہ کچھ رقم لے  
 کر آیا کہ مہاراجہ نے بھیجی ہے۔ کہ ایہ رقم کا تو اللہ نے انتظام کر دیا۔ بھی دو بنیادیں حاضر تھا کہ اس  
 قرض خواہ نے کارندہ آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت مجھے اپنے مالک کی طرف سے ہدایت ملی ہے  
 کہ آپ کو سفر حضر میں جتنی بھی رقم کی ضرورت ہو وہ حاضر کروں فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ وہ  
 بنیاد خاموش بیٹھا یہ سارے ”تھاٹے“ دیکھا۔ آخر اس سے رہ نہ گیا کہ یہ بھٹوان کے محلے بھی  
 عجیب ہیں انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ہم کسی کے مقروض ہوں تو قرض خواہ جان مذہب میں کر دیتا ہے  
 اور ایک یہ ہیں کہ لکھ ڈیڑھ لکھ روپیہ کے مقروض ہیں اور قرض دینے والا مزید روپیہ پیش کر رہے۔  
 غرض حکیم صاحب بڑی عزت آبرو اور اطمینان کے ساتھ ریاست کو چھوڑ کر اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔ ہم  
 نے حضرت حکیم صاحب کی تصویر دیکھی ہے ان کی آنکھوں میں تو کل کی عجیب کیفیت نظر آتی ہے ان کی خود  
 نوشتہ سوانح حیات ”مرقاۃ الیقین“ ایسے خوارق سے بھری پڑی ہے۔

• ایک بزرگ ہیں جنہیں ہم نے اپنی ہوش میں بڑے قریب سے دیکھا۔ وہی جو توکل علی اللہ، پایادہ مصر  
 کے سر پر نکل پڑے تھے۔ ان کی عام زندگی بھی عجیب متوکلانہ زندگی تھی۔ دست با کار دل پیار اور وقت  
 ذکر ہی میں مصروف رہتے۔ اپنے مرشد کی ایک تصنیف صلیف کا عربی میں ترجمہ کر رہے تھے، نئے بیٹھے  
 چلتے پھرتے یہی دھن سوار رہتی کہ اس کام کو مکمل کریں۔ اپنے مرشد کے طریق کی پیروی میں چلتے  
 ہوئے نکلتے تھے۔ ان کے مرشد کا طریق یہ تھا کہ ایک دو ات کمرہ کے ایک کونہ میں اور دوسری دو ات  
 دوسرے کونہ میں رکھ لیتے اور قلم کو روٹھائی میں تر کر کے تھپتھپتے دوسری جانب روٹھ جاتے، وہاں

بچے تو قندیلہ شانی میں ڈوبتے اس طرح بیت بیت نکلتے تھے۔ بزرگ کو بھی سہم۔ اس طرح نکلتے  
 رہے۔ تاہم تپا نہ رہتا جیسے سوئی پر اسہل۔ مریں رہا تھا جس لئے وہ بات بیت ہوتی تھی۔  
 سہم میں اپنے مرشد کی جھوپڑی میں بٹل کرتے کرتے یہ بات رنج ہوئی۔ پاکستان بننے کے بعد تک  
 ان کا ترجمہ کا کام جاری تھا۔ تاب کے غفلت کو ترجمہ کر کے ہر صفحہ کے ساتھ ایک سادہ کاغذ جوڑ لیتے اور  
 اس پر ترجمہ لکھتے جاتے۔ کائنات چھٹ کر تے ہم نے انہیں نہیں دیکھا۔ پانچ شخصوں کی اس عظیم کتاب ہ  
 ترجمہ کر کے وہ یہ ترجمہ ہو چکا تو یوں لگتا تھا ان ترجمہ کے تقاریر میں جی رہے تھے اور بار بار غ ہوئے، دھڑ  
 بدوا گیا۔ ہم نے ان کی وفات پر شہر بھر کور دتے دیکھا۔ زندگی میں ہم نے انہیں کبھی روپیہ پیسہ کا اکریا  
 حساب کرتے نہیں دیکھا۔ جب گذارو ملتا رومال میں پیٹ کر لیتے اور اسی طرح اپنی ابدی کو دیتے۔  
 مہمان کے ایک رئیس اس سے حدیث کا درس یا کرتے تھے ایک بار وہ انہیں ملنے کو آئے اور جاتے ہوئے  
 پیچھے ہٹ کر ایک غافلہ میں آیا کہ جا کر اپنی چوٹی جی کی خدمت میں پیش کر دوں۔ چوٹی جی نے دو خط  
 کھواتو اس میں مذہب کی کچھ رقم تھی ساتھ میں دعا کی درخواست۔ یعنی انہیں استغفار بھی اتنا تھا کہ کسی سے  
 نذر نہ لینا بھی نہیں کھلتا تھا۔

ایک بزرگ تھے اور میں کسی کے ہاں مقیم ہوئے۔ وہ اسی کا عزم کیا تو میزبان مصر ہوئے۔ کچھ دیر مزید  
 ٹھہریں۔ مگر یہ واپسی کا عزم کر چکے تھے نہ کرے۔ ان کا سامنا میزبان کی تحویل میں تھا اس نے روک لیا۔  
 یہ اپنے ساتھی کے ہمراہ چل پڑے اور پیدل چلتے چلتے مرید کے پہنچ گئے۔ آدھی رات کے وقت پہنچ ایک  
 مسجد میں قیام کیا۔ بھوک سے برا حال تھا۔ اس وقت کو اس کو پوچھا کہ اس پر طرہ یہ کہ ساتھی کو تیز بنی رہنے  
 کیا۔ ایک اور آزمائش کھڑی ہوئی۔ وضو کر کے اللہ کے حضور کھڑے ہو گئے کہ وہی شانی اور کافی در قریب  
 سے نماز ختم کی تو دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھول تو ایک شخص بازہ تیار شدہ کھانے کا تھا لے لے کھڑا تھا  
 کہ بیٹھے اور تناول فرما بیٹے۔ پوچھا برتنوں کا کیا ہوگا کہنے لگا یہیں رکھ دیجئے گا میں بعد میں سے لوں گا،  
 دونوں مسافروں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ ایک مسافر در بھی موجود تھا اس کو بھی کھانا نہیں ملا تھا اس نے  
 بھی سیر ہو کر کھایا۔ ساتھی کی بھوک رفع ہوئی تو بخار بھی اتر گیا۔ فارغ ہو کر برتن ایک طرف رکھ دئے۔ صبح  
 نماز کے لئے اٹھے تو دیکھا کہ مسجد کا دروازہ اندر سے بند ہے اور برتن وہاں موجود نہیں ہیں۔





سے یہ کیا ہوا کہ س نے س کے مرشد کی شان میں جو ستاف کی تھی س کے ہارے سہ اس کے قیود  
 میں اس کے ہیں۔ س کے مرشد کو مدد کی ہے بت اس قہ کی ہے ختم ہوں حالت کے کام میں اس  
 کی حالت میں اس کا اور جو تہجد کی اہانت کے درپے ہوگا میں اس کو اہانت سے دو چار کروں گا۔ ہم نے اس  
 کی حیات قدرتی میں بہت سے واقعات اہانت کی امید کے بارہ میں پڑھے ہیں۔ اور خود ہمارے  
 بچے تجربہ میں بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں جو کوئی بھی، س مرشد کی اہانت کے درپے ہوا، خود  
 اہانت کا شکار ہوا۔ کسی مہینہ میں ارادہ اہانت تک ایسا نہیں ہوگا جس لوگوں نے اپنے خدا کے ایسے  
 خوارق دیکھے ہوں وہ اپنے خدا کی قدر توں بر توکل کیوں نہ کریں؟

-----



تے اس طرح میں وہ فائدہ ہوا کہ جسے میں قہر اور پڑھنے میں اضافہ کیا۔ یہ کہ یہاں کا سیکھ

اس کا پتا میرے پاس تھا کہ جب تک اس غلطی کے ماسیم و مصالک کے بارے میں پورے یقین نہ ہو تا وہ غلطی سے متنبہ نہ  
کرتے۔ لیکن میں بہت حقیقت کرتے تھے فرماتے تھے جو غلطی جس طرح چھپ جاتا ہے وہ آئندہ نسلوں  
سے سند بن جاتا ہے۔ بعد میں وہی اس بات کی تحقیق نہیں کرتا کہ جیسے والے نے کس سبق و سبق  
میں تقریر میں اولفظ استعمال کیا تھا۔ ہمیں اپنی جد کی زندگی میں اس نکتے سے بہت فائدہ دیا۔

یہ بات بھی ہم نے اسی بزرگ سے سیکھی کہ جس غلطی کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہو فوراً سخت دیکھو۔  
جب تک اس کے معنی معافی کے باب میں یقین نہ ہو وہ غلطی سے متنبہ نہ کرو۔ ہر اس بات پر حق و باطل  
کرتے رہے۔ ہمارے طبیب اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ کلاس میں بھی اُس غلطی کے معافی کے  
بارے میں ہمیں شبہ ہوا تو ہم نے اپنے بچوں سے بڑا کہہ دیا کہ ہمیں اس غلطی کے معافی کے بارے میں وثوق  
نہیں لگتی دیکھنے کے بعد وہ بارہ اس غلطی کے بارے میں بتائیں گے۔ یہ احتیاط ہم نے انہیں بزرگ سے  
سیکھی اور یہ ان کی جوتیوں کا مصدقہ ہے کہ قلم بکڑنے کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔

اس کی طبیعت میں احتیاط اور غما و غما چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ یہی دو صفات ہیں جو نس کو  
درویش بناتی ہیں۔ اسی لئے قیام پاکستان کے بعد انہیں درویشوں کے کام کی نگرانی سونپی گئی۔ ان ۳۱۳  
درویشوں کے کام کی نگرانی جو ہماری ہستی میں اپنے مرشد کے در پر دھونی رہا کر بیٹھ گئے تھے۔ ان  
درویشوں کے اہل و عیال و ماں باپ عزیز و اقارب پاکستان میں تھے وہاں وہ لوگ ہمیں دانٹوں میں  
زبان کی طرح بیٹھے تھے۔ مجبور اور محصور۔ ہمارے اس بزرگ کو دیکھا کہ دن رات ان کے غم میں گھل رہے  
ہیں۔ اگر وہ درویش صاحب خوف میں تھے تو یہاں ان کے مفادات کا گنہگار بھی حالت امن میں نہیں تھا۔  
اگر وہ درویشوں کے کسی عزیز کے بارے میں خبر متی کہ اسے فداں تکلیف درپیش ہے تو جب تک اس کے ازالہ  
کے لئے پوری پیش بندی نہ کر لیتے انہیں کسی کل چھین نہ پڑتا۔ ہجرت کے بعد سب لوگ ہی مہاجرت کے  
مصائب کا شکار تھے۔ ہر خاندان مصائب کا مقابلہ کر رہا تھا مگر یہ بزرگ تو تین سو تیرہ خاندانوں کے  
مسائل کا سامن کر رہے تھے۔ جب ہمارے ان کے ساتھ خدمت شروع کی اس وقت ہجرت پر کافی عرصہ

نہ۔ دیکھا تھا مصائب کی شدت نہ ہوئی تھی مگر اس بوجھ نے ساری پتی صحت پر بار ترانہ اتار دیا۔  
نئے بڑھنے کے مسئلے میں فرق نہ تھا مگر اس کے باوجود، ترانہ کہتے رہتے تھے کہ مرنے والوں کو سب  
ساتھ جھانکونی شخص اپنے ہر فرقہ وارانہ کتاب کے ساتھ میں صرف کر سکتا ہے، یہ بڑبڑ کرتے تھے۔  
گر پڑھ نہیں رہے ہوتے تھے تو لکھ رہے ہوتے تھے۔ یہ تو ہماری خوش فہمی تھی کہ آپ نے کچھ مضامین  
میں لکھوائے، ورنہ ان کا کام تو کئی جہدوں پر محیط ہے۔

ان کے گھر میں ہمیشہ دو تین یتیم اور بے سراسر اپنے پرورش پاتے تھے۔ یہ انہیں اپنے بچوں کی طرح پالتے  
پوستے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے۔ غریب یرونی ان کا شیوہ تھا۔ تیر کے بیمار، دار، یتیمی،  
مسکین، ضرورت کے وقت انہیں کی طرف دوڑتے تھے اور مایوس نہیں دیتے تھے۔ اس بات کا تجربہ  
ابھی اس عرصہ میں ہوا جب ہم ان کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ یہ سفید پوش، جو کسی کے سامنے  
ہاتھ نہیں پھیرا سکتے تھے مشکل وقت میں ان کے پاس آتے اور یہ بڑبڑ ان کی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے  
سوئے ان کی دست گیری کرتے۔ ان میں سے کئی لوگوں کی اولادوں کو ہم جانتے ہیں کہ اب ماشاء اللہ  
راکھوں میں بھیستے ہیں۔ اس سبکی کے اخفاء میں انہیں اس قدر غلو تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے پاتی  
تھی۔ ہم تو اسی کام پر مامور تھے کہ قوم کا ریکارڈ رکھیں اس سے ہمیں قریب چل جاتا تھا مگر ہریت یہ تھی کہ  
بھول کر بھی کسی ضرورت مند محتاج کا نام زبان پر نہ آئے پائے۔ حساب میں اتنے محتاط کہ ایک بار پانچ  
روپے کی ایک رقم کا دوبارہ اندراج ہو گیا۔ اس پر باقاعدہ ایک کمیشن بھی کر تحقیقات کر لی کہ ایسا کیوں  
ہوا؟

مومن تربت کے باوجود عالم یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے تو جہاں جلد سنی وین بیٹھ جاتے لوگوں  
کے کاغذوں کے اوپر سے پھلانگ کر جانا انہیں بہت کھلتا تھا۔ مرشد قصبہ میں موجود نہ ہوتے تو انہیں  
ادارت سونپ کر جاتے مگر یہ خطبوں کے لئے نمازوں کی امامت کے لئے دوسرے کام کو نامزد کر دیتے۔  
اپنی جگہ نماز رکعتیں جہاں جلد مل گئی مصلیٰ بچھ لیتے اور بیٹھ جاتے، خیر کو نور سے سنتے، نمازیں توجہ  
سے پڑھتے۔ لوگ ہلکے پلکے کرن سے مصروف کرتے اور یہ سب بے مصافحہ کرتے اور دعا میں  
نہایت جاتے مگر مصافحہ کرنے کے لئے رکعتیں نہیں تھے۔ چلتے چلتے ہاتھ مالتے تھے اور لوگ ان کے ہاتھ

میں نے بہت جانتے تھے۔ ہوا سے بہت گھبراتے تھے۔ جموں کا ان ظالم چھٹی دان سمجھ جاتا تھا مگر یہ  
 حوصلہ نہ رہا۔ ہمارے ہاں سے میٹھے دفت کی ایک دیکھتے، تھیں ہاں کام جاری نہ تو  
 اس میں مصروف ہو جاتے تھے ان کی زبان سے ہوا سے جرات تھی۔ انہیں کے مہم میں جاری، اس کی  
 سستی کے کاسے تھے چاند بھی کی طرح تھے جتنے ان کے گھر کا رخ یہ تھا کہ دھوپ سیدھی ان کے پردہ  
 میں آتی تھی اس پر چھتیں اس لیے مگر اس سے روشنی آ رہی تھی تھی اس سے اپنے  
 کمرہ میں پانی کا ملبہ رکھوا دیتے اس میں برف کا ایک ڈالیر رہتا، دیر لگی کاسٹی پنکھ ملکی رفتار سے  
 چلتا رہتا اس طرح چھ سکون میسر آتا مگر مری کی حدت لایمان والہ فیض اب ہم انہیں کی طرح یہ تو نہیں  
 کہہ سکتے کہ ہمیں جاتا تھا جو گھر تھا، نہ زمین پر مگر پہلے مصرعہ کی برہمنی گواہی دے سکتے ہیں کہ مری  
 سے مضطرب تھا نہ زمین پر نہ اس مضطرب کے باوجود ان کا کام جاری رہتا۔ ایک بار ہم نے مری کا  
 شکوہ کیا تو فرمایا میاں ہمارے مرشد نے اس زمانہ میں اسی (۸۰) تفسیلات مکمل کی تھیں جب بھی تو دور  
 کی بات ہے مری سے ہی ایک دوسرے مرد و جوان بھی میسر نہ تھے اس لئے ہمیں شکوہ

کرنا زیب نہیں دیتا۔ ہمیں تو سختی پہنچا، برف اور چھتیں میسر ہیں۔ ہمارے مرشد تو ہاتھ سے پنکھ جدا  
 کرتے تھے۔ اتنا کہتے کہتے آواز گھوٹے ہوئی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اسی کمرہ میں ان کے بڑے بیٹے نے  
 جو بہت بڑے سرکاری افسر تھے اپنے ابا کی آرائش کے لئے اڑکنڈہ مقرر لگوادیا۔ کام میں انہماک اسی  
 طرح جاری رہا یہ نہیں کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں خیز کے جھونکے آنے لگے ہوں۔ وہ آرائش بھی ان کی  
 زندگی میں نہیں ان کے کام میں سہولت میسر کرنے کا باعث بنی۔ بعد کو اسی بزرگ نے بتایا کہ اللہ کا حکم ہے  
 اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو اور یہ بھی تو اللہ کی نعمت ہی ہے کہ اس نے بیٹے کے دل میں باپ کی  
 خدمت کرنے کی تحریک پیدا کی! کیسے شکر گزار لوگ تھے اور اللہ کی نعمتوں کا کیسے کیسے طریق سے شکر د  
 کرتے تھے اسی لئے تو اللہ کا سلوک بھی ان لوگوں کے ساتھ ایسا تھا۔ وہ جو رشتہ ہے کہ جو اللہ کے  
 بندوں کا شکر گزار نہیں بناتا وہ اللہ کا شکر گزار کیسے ہو سکتا ہے؟ اس روز اس کی معنویت سمجھ میں آئی۔  
 بزرگوں کی صحبت میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان حکمت کی نئی نئی باتیں سیکھتا رہتا ہے۔ ہمارے  
 اس بزرگ کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ سیکھا۔

ایک عجیب بات سمجھنے کے بارے میں تھی۔ ان کے خسران کے ہم عقیدہ نہیں تھے۔ ان کے بارے میں  
 رہتے تو یہ بھی ان سے عقیدہ کے بارے میں شکوکہ کرتے۔ پھر نہیں جی۔ ان کے مرشد کے ہاتھ پر بیت  
 سونے کی توفیق مل گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے جس کربچی بھی ان سے تبدیلیء عقیدہ کا نہیں کہا تھا وہ  
 میرے اور میرے گھروالوں کے عمل کو دیکھتے رہے جب انہیں یقین ہو گیا کہ عقیدہ کے اختلاف کے  
 باوجود ہمیں کا پورا احترام و ارادت رکھتے ہیں تو وہ خود کارے مرشد کی اجازت کے زمرہ میں آ گئے۔ ان کی  
 طبیعت کی سفت کا اندازہ ہمیں اس دور میں بھی ہوا کہ ان کے گورنمنٹ کالج کے زمانہ کے دوست اور  
 ساتھی جو ان کے ہم عقیدہ نہیں تھے نہیں ملنے پڑتے تو اگر مہیض کے طور پر ان کی خوب خدمت کرتے  
 مگر بھول کر بھی عقیدہ کا ذکر درمیان میں نہ لاتے مبادا مہمان یہ سمجھیں کہ اگر مہیض میں کوئی غرض شامل  
 ہے۔

اختلاف عقیدہ کے باوجود وہ عقیدہ کو اس کا حق دینا جانتے تھے، حمید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت کا انتقال ہوا تو  
 ان کی حق گوئی اور بیباکی کے بارے میں ایک ذوردار شذرو اخبار میں لکھ کر شائع کر دیا۔ پروفیسر حمید محمد خاں  
 وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ملنے کو تشریف لائے تو کسی نے تعریف کر دیا کہ یہ مولانا ظفر علی خاں کے  
 چھوٹے بھائی ہیں تو لپک کر ان کا ہاتھ دو بار دے پئے ہاتھ میں لے لیا وہ فرمایا پھر تو آپ سے ہمارا دودھرا  
 رشتہ ہے۔ اور یہ دودھرا رشتہ اس لئے کہ ظفر علی خاں ان کے مسلک کے مخالف تھے۔ یہ بزرگ لوگ اپنی  
 مثال آپ تھے ان کی زندگیوں ہزاروں لوگوں کے لئے مشعل راہ تھیں لوگ ان کا نمونہ دیکھ کر اپنی زندگی کی  
 ذکر میں لیتے تھے۔ یہ اس زمانہ کے صوفیاء تھے جو دنیا میں رو کر بھی دنیا میں ملوث نہیں ہوتے تھے۔ وہ جو  
 کسی نے کہا ہے کہ درمیانِ تعزیر یا تختہ بندم کردہ امی۔ نیز میگوئی کہ دامنِ ترکمن ہشیار باش! کہ ہمیں دریا  
 کی گہرائی کے درمیان تختہ بند کر کے چھوڑ دیا ہے اور اب کہتے ہو کہ ہشیار دامنِ ترکمن ہوئے پائے! یہ انہی  
 ہشیار لوگوں میں سے تھے جن کا دامنِ دنیا میں رہنے کے باوجود دنیا سے آلودہ نہیں ہوا اور ہماری خوش نصیبی  
 کہ ہمیں ان کے ساتھ کچھ دیر کام کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا موقعہ میسر آیا۔

## مددگار کارکن

فصل غلطی کا ماحول کے ساتھ مخصوص ہو کر رہتے ہیں اور اس ماحول سے بہت کم مستحق میں آئیں تو وہ اس بات کے معنی، فلاح نہیں ہوتا۔ نہ کہ وہ ماحول میں رہتی ہو یا پھر یا بیک نہیں ہوتی یہی حال سیاق و سباق کا ہے اور عام معنی میں یہ اصطلاح صحیح روح کو سمجھنے کے لئے سیاق و سباق پر بہت زور دیا ہے یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ فصل غلطی جماعت احمدیہ کے ماحول کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس بات کے سامنے وہ انداز استعمال ہوں تو دوسرے ناطوں کو سمجھنے کے باوجود ان کی معنویت سے آشنا نہیں ہو پاتے۔ یہ اصطلاح میں "وقار عمل" اور "مددگار کارکن" ہمیں یاد ہے کالج کے ایک مہمانہ میں ہمارے دوست منور احمد نے جو قادیان میں تھے وہاں ان کے ساتھیوں کو قادیان کے مددگار کارکن کہہ کر پیٹ لیا تو سارا ہل بے حال ہو گیا مگر بہت آگے ہوئے مقررین ہر تریک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ دو کے ماحول میں مددگار کارکن کا لفظ ایک خاص معنویت کا حامل تھا جس معنویت سے بہرہ ور آئے آشنا نہیں تھے۔ یہی طرح وقار عمل کا فطری ترجمہ ہے عمل کا احترام یا عمل کرنے کا اعزاز۔ مگر جماعت احمدیہ کے ماحول میں یہ ایک اصطلاح ہے جو اجتماعی خدمت خلق کے لئے استعمال ہوتی ہے ہمارے کام کرنا، محنت کا کام کرنے میں ہمارے محسوس نہ کرنا۔ خلق خدا کی خدمت کے لئے ہر سہانی مشقت سے بھی گریز نہ کرنا۔ وہ جو ذوق نے کہا ہے "نام مطلوب ہے مگر فیض کے اسباب بنا۔ ملنا چاہنا" مسجد و تالاب بنا "یہ ساری باتیں جماعت کی اصطلاح میں ایک دو فطری ترکیب میں سمٹ کر آگئی ہیں دو اصطلاح ہے "وقار عمل" اور حقیقت یہ ہے کہ جماعت احمدیہ میں خدمت خلق ایک بنیادی عمل ہے دوسرے سے عمل کرتے ہیں نہ وقار عمل کے معنوں ہی کو سمجھ پاتے ہیں۔ اس مضمون کا اصل نکتہ تو "مددگار کارکن" ہیں۔ ایسے مددگار کارکن جنہوں نے اپنی زندگیاں سلسلہ کے لئے وقف کر رکھیں اور تادم آخر خدمت پر مستعد رہے۔ مددگار کارکن کی اصطلاح حضرت مصلح موعود (خدا آپ سے راضی ہو) کی وضع کردہ ہے کہ اپنی خدمت پر مامور ہونے والے کارکنوں کو احساس کمتری نہ ہو۔ یہاں سوئین میں روکر احساس ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے شاید یہ جذبہ جماعت احمدیہ سے سیکھا ہے۔ یہاں ہر کام کرنے والے برابر ہے کوئی کسی

سے کتہہ کرتا تھا۔ ہم نے بی بی نورجی کے تعجب میں مدافعت کرنے والے کارکن و صدر شعبہ کے ادش بداش ایک کی میرے بیٹھے تھا، کھاتے بیٹھے ہے یا کتہوں میں یا اور سے مدافعت میں آئی۔ بری یا رواداری کہاں؟ ہاں رواداری ہم نے نظروں اور مددگار کارکنوں کو ایک کی صفہ میں بیٹھ کر رکھا تھا تھے دیکھا ہوا ہے۔ ہم نے مضمون میں انجمن کے بعض مددگاروں دوران کے حواس قائم کر دینا چاہتے ہیں۔ بی انجمن کی گھر کی کے دوران بیت اہل کے کارکن سرفراز خاں سے مدافعت دوتی ہوئی۔ سرفراز خاں و نیچے سب قہ کے چھر ہر۔ بدن کے آدمی تھے۔ بی بی بھی وہی پنہاں والی ہوتے تھے۔ سوار کے بھی رسیا تھے۔ ہم نے انہیں ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک ڈک لے جاتے دیکھا ہے۔ ان کی سواران کی مستعدی پر ذرا اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ یہاں سویدن میں سوڈو لوگوں کو جبکہ سوار تھوکتے دیکھتے ہیں تو سرفراز خاں کے غصہ سے یہ داتی ہے کہ سوار تھوکتے کو مٹا کیر دیتے تھے۔ کپے کو رزوں کی بات ہے۔ حافظ علامہ مکی لدین کے چائے خانہ میں چائے پیتے ہوئے سرفراز خاں کو دیکھا حضرت مولوی مصباح مدین جس کی بی بی پر اکڑوں بیٹھے تھے ان سے خوب فاصلے پر سرفراز خاں بیٹھے تھے۔ حافظ صاحب نے کوئی بات کی تو سرفراز خاں کہنے لگے حافظ صاحب "یہ بزرگوں کی دل دساتے بیٹھی ہے بس انہیں کو دیکھنے سننے کے لئے بیٹھا ہوں"۔ سرفراز خاں کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگی بالکل اکل کھراچا ان پڑھ پنہان مگر بزرگوں کی اولاد کا یہ احترام کہ پہروں سامنے بیٹھ کر انہیں دیکھتے رہنا۔ جس زمانہ کی یہ بات ہے سرفراز خاں کی عمر پچاس پچیس برس تو ضرور رہی ہوگی۔ اس کے بعد ہم نے انہیں مدتوں خدمت پر مستعد دیکھا۔ سر پر صاف لپٹتے تھے ایک سفید چادر کی بکل مار لیتے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید بکل انہوں نے مولوی مصباح مدین صاحب کے تنج میں اخیار کی ہو۔ وہ خدا علم۔ ہمیں سرفراز خاں کی اس ایک بات کے علاوہ اور کوئی بات یاد بھی نہیں مگر یہی ایک بات کیا کم ہے؟ پھر ہم نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے مددگار کارکن بشیر کو دیکھا۔ بشیر شاید انجمن کا کارکن نہیں تھا حضرت میں صاحب کا ذاتی خدمت گزار تھا مگر دفتر کی ڈاک گھرے جانے اور گھر سے دفتر کی ڈاک واپس آنے کا کام اس کے سپرد تھا بھاری بھر کم جسم۔ پاؤں میں ہوئی جیل۔ بشیر دفتر آتا تو سب سے ہاتھ ملاتا اور مددوں بعد جب تک وہ جیا جب بھی ہوا آمنت سامنے ہوا بشیر نے پاک کر ہاتھ ملانے میں ہمیشہ پہل کی۔ اس شخص کی باتوں میں حضرت میں صاحب کی



کرت میں رہ کر تھی، مستعد، باہمی تھی۔ کسی شخص نے اسے نہ خدمت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شہر ہمارا  
یہ اور مددگار رہا۔ اس نے انہی شخص میں جس نے بتویر صاحب یعنی روتی میں یہ خدمت حاصل کر کے  
یہ خدمت مذرتی درتویر صاحب اس کے نازل کرتے تھے۔ وہی تویر صاحب کے گھر ہمدرد سلف  
اتنا ذاک اتنا اس کا حق بھرتا غرض ہر طے خدمت کرتا تھا۔ ہم نے لکھنؤ کو جوتی سے ہاں سفید ہو جانے  
تک تویر صاحب کی خدمت پر مستعد دیکھا تویر صاحب ہاں کرتے تھے ارون دھوپ میں ہاں سفید کر  
پینے کے بعد دور کی ملکی تصویر دیکھ چاہے تو ہمارے شہر کو دیکھے۔

کانچ کا مددگار کارکن ہاں شادی تو اپنی ذات میں انجمن تھا۔ زمانہ پہلے خدا یا یہ کسی کا نام آیا۔ اتنا  
مخلص۔ تا مستعد۔ اتنا جس شہر۔ دشمن کا چورا۔ کام کا چا۔ آدمی یہ تھا مولوی سمیل میرٹھی کی پن چکی  
تھی:

نمبر پر پل رہی ہے پن چکی۔ جس کی پوری ہے کام کی چکی

شادی اور کالج لازم و ملزوم تھے۔ دونوں ایک دوسرے میں یوں مدغم تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا  
ممکن ہی نہیں تھا شادی دو چار دن کے لئے بھی کہیں کانچ سے باہر چلا جاتا تو کانچ کی نف سونی سونی گنتی  
تھی۔ وہ شاف اور طلبا میں یکساں مقبول تھا۔ خدا جانے کس ملکی کا بنو اتنا ہم نے کیا کسی نے بھی اسے  
تھمتے نہیں دیکھا۔ دن رات مستعد۔ دن میں کانچ کی مددگار کارکنی رات میں کانچ کی چوکیداری۔ اس کی  
چوکیداری کا یہ لم تھا کہ ہم نے رات کے اوقات میں بھی اسے کبھی سوتے دیکھا یا غافل پایا۔ وہ ساتھ  
در طلب کو ان کی چاس سے پہچان یا کرتا تھا اور اس کی یہ پہچان کبھی غلط نہیں ہوئی۔ ہم دوسرے کانچ کے  
موسل میں بھی رہے۔ رات کو دیر سے ہاٹل واپس آتے تو شادی کو چوکن پاتے۔ وہ بغیر دیکھے اپنے لٹاف  
کے اندر سے ہی ہمیں نام لے کر پکارا اور کہتا کہناں سے رہے ہو طلب میں اس کی متبویت کا یہ لم تھا کہ  
پچھلے برس جرمنی میں کانچ کے ایک پر نے ہمدرد علم کے ہاں شادی کا ذکر آگیا۔ وہ اٹھا اندر گیا اور اپنے  
ایم میں سے شادی کے دونوں نکال لیا کہ یہ دیکھیں شادی کی تصویر۔ کون کہتا ہے مددگار وہ ۱۹۷۲ء  
دلوں میں زندہ ہے۔ ہمارے ساتھ اس کی دوستی کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے  
شادی کے ہاتھوں میں کھیل کر کانچ کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اس کے سامنے ہی کانچ کے شاف پر ہماری

قیصتی ہوئی تھی۔ شادی اس تعلق پر مست خوش تھا۔ ایک دو بار ہمیں انگوٹے پہنائے۔ یہ تم یہ میں نے  
 لئے ہر وقت چاہے احموتے رہتے ہو، تنہا گایہ میری آنکھوں کے سامنے ہی تاج میں پرہ اورانی کاٹ  
 میں پرانیس رہا ہے س نے مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ شادی کی محبت تھی ہم بھی حتی الوسع اس کی دلجوئی کرتے  
 رہتے تھے مگر خد شہد ہے کہ شادی نے ہماری خدمت کے عوض بھی کسی معاوضہ کی توقع نہیں رکھی۔ تاب  
 وٹ اور تاب نفس آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔ مدتوں بعد گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ایک بہشتی ہماری  
 خدمت پر مستعد ہو۔ دو ہمارے لئے بڑے دور سے دھوکہ پینے کا پانی لاتا تھا۔ ایک بار ہم نے اسے  
 انعام کے طور پر کچھ پیسے دینا چاہے تو اس نے نکار کر دیا کہنے لگا "پانی پلانے کے پیسے ہوں؟" ہمیں اس  
 کی یہ داہت بھائی۔ یونہی خیال آیا کہ اس کے طور اظہار احمدیوں والے ہیں۔ یقیناً احمدی ہوگا جو خوفِ فرد  
 خلق سے خاموش ہے اور ہمارا اندر زہر درست نکلا۔ جس روز ملاؤں کی شہ پر کالج کے بعض لوگوں نے  
 (ہمارے طلباء و طالبات نے نہیں) ہمارے خلاف احمدی ہونے کی وجہ سے ہنگامہ برپا کیا وہ چپکا کھڑ  
 دیکھتا رہا جب لی جی ہوئی تو ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "سری حضور کو دعا کے سے کہیں تو مجھے نہ بھویس  
 "خدا معصوم اب وہ کس حال میں ہے؟" رینائر ہو گیا ہوگا۔ بات شادی سے جی تو اس بہشتی کی طرف مڑی  
 کیونکہ اس کا نام بھی شادی تھا۔ شاید شادی نام کے سارے کارکن ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی کا کالج میں  
 رعب و ب بھی بہت تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سب لوگ اس کے خلوص کے گرویدہ تھے ایک بار حضرت ضلیفہ  
 المسیح ثالث خدمت پر فائز ہونے سے کچھ ہی عرصہ قبل کئی دنوں بلکہ مہینوں تک کالج میں تشریف نہ لائے  
 کیونکہ اس کے کندھوں پر انجمن اور جماعت کے دیگر اداروں کا بوجھ تھا۔ ایک روز ذرا سی فرصت ملی تو کالج  
 تشریف لائے۔ گاڑی کا رینڈر میں کھڑی کی اور دفتر میں جانے کے لئے بڑھے۔ شادی نے دیکھا تو تو  
 دور سے ہی آواز دے لگایا "بسم اللہ بسم اللہ" اچ فوجاں کدھر بھل پیاں نہیں؟" یعنی آپ آج بھول کر  
 کدھر نکل آئے ہیں؟ یہ شادی ہی کا جگر تھا۔ حضرت صاحب نے مسکرا کر شادی کی طرف دیکھا اور دفتر  
 میں چلے گئے۔ خلافت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد حضرت صاحب کالج تشریف لائے۔ سارا اسٹاف  
 استقبال کے لئے ایستہ وہ تھا شادی بھی ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ جب سٹاف سے مصافحہ کر چکے تو  
 شادی نے "جے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا "خجہ صاحب جی ایک عرض کروں؟" حضرت صاحب نے

فرمایا: "میں نے اس کی عرض سے کہ وہاں تو نہیں کسی کاغذ کی میں توپ تاپا یا ہوا  
 - چھوڑا۔" اس نے اسے کہیں سے یہ بات کہی کہ وہاں تو نہیں کسی کو نہیں۔ قدرت و بیچارہ  
 منظور تھا۔ کاغذ تو میا گیا۔ شادی نے خدمت جاری رکھی مگر بناؤ منت پچھتی عہد کے بعد اپنے کسی  
 عزیز کو ہونے کے لئے سرگودھا کے قریب کسی گاؤں میں آیا وہاں موت نے آیا۔ کسی نے اس کی خبر بھی کاغذ  
 دلوں کو نہیں دی۔ شادی سب پر دھنسی رہی میں پیوہ ناک ہو گیا نہیں یقین ہے کہ شادی کاغذ میں  
 مرنا تو کاغذ سے باہر نہ دنیا جاتا۔ مگر شادی مر گیا۔ ہے؟ کاغذ کے ساتھ اور طبعوں کے دلوں میں  
 زخم ہے۔

اب ایک اور مددگار کارکن بابا شریف۔ سراج دارشاد کے دفتر میں مددگار کارکن تھے وہاں سے ریٹائر  
 ہوئے تو مسجد مبارک میں خادم مسجد کے طور پر کام سنبھالا۔ جہاں ملتے بڑے پیار سے ملتے تھے۔  
 پرائیویٹ سکڑی کے دفتر کے دو مددگار کارکن یہ دین مکران کے نام یہ نہیں۔ دن رات خدمت پر مستعد  
 مگر خوش۔ ہمارے ابا کے دفتر کے مددگار کارکن یعقوب تھے۔ ہمارے باجی مرحوم گھر میں ہمیشہ ایک  
 دوڑیل بھینس پالتے تھے۔ یعقوب دن میں دفتر کا کام کرتا اور شام کو بھینس کا چارہ کاٹ کر لاتا اس محنت  
 نے اسے لگ سے پیسے دے جاتے۔ عین دار آدمی تھا۔ دن رات کی محنت سے بمشکل بچوں کا پیٹ پاتا تھا۔  
 باجی مرحوم ہمیشہ اس سے سوک کرتے رہتے تھے۔ ہمارے گھر میں اکثر گاؤں کے مہمان آتے رہتے  
 تھے جو کھجور، انجور، بھنگی کے بھنے، گنے لگے رہتے تھے ان تمام تحفوں میں سے یعقوب کا حصہ پہلے اور الگ  
 سے نکلتا تھا۔ ہمیں یاد ہے اباجی کی وفات کے بعد بھی یعقوب ہمارے گھر کا کام کرتا رہا اور ہماری اسی  
 پابندی کے ساتھ اس کا معاوضہ اور اس کے حصے کے تحفے اسے دیتی رہیں۔ ہم سب بہن بھائیوں کو سختی  
 سے تاکید تھی کہ یعقوب کے ساتھ ہمیشہ ادب و احترام سے پیش آیا جائے۔ اس باب میں اباجی مرحوم کسی  
 کا کوئی لفظ نہیں کرتے تھے اب بھی ہم اور ہماری اولاد میں سب یعقوب کا اسی طرح احترام کرتے ہیں۔

دو مددگار کارکن ایسے تھے جن کی اولادوں کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت عطا کی ایک تو ہمارے چوہدری محمد  
 رمضان صاحب تھے جو تبشیر کے دفتر میں مددگار کارکن تھے مکران کی اولاد میں سے، سر محمد اعظم مرحوم نے  
 بہت نیک نامی کائی۔، سر صاحب اپنے علماء میں بہت مقبول تھے ان کا جواں عمری ہی میں انتقال ہو تو



ہیں چائے کا ایک پیو یہ جتنی کیا جا سکتی ہے اسے رخصت کی حیثیت سے کون خورانی پیرے۔ رکن یہ بدیہ  
 ان کی خدمت میں سوتا ہوا تھا۔ میں نے امدادیں نکالنے کے بعد ان کی انگوٹھی پر دیکھی۔ وہ جوتے پہن رہے تھے۔ وہی  
 تھے مگر یہ نہیں کہ کام کو ہاتھ لگتے ہوں۔ مگر نہیں کوئی یہ سہا، مانا پڑتا تو اس پر سے یا قریب کی دکانوں  
 سے نہ ملتا تو غصہ منڈی کی طرف چل پڑتے اور جب تک مصوبہ پنج مل نہ جاتی نہیں جیسے نہ آتا۔ یہ کبھی نہیں  
 دیکھا کہ میں نے ان کے دھندلے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ دیکھا کہ میں نے ان کو دیکھا۔ ان کے ہاتھوں کے ساتھ  
 تھا کہ پورا تھا کیونکہ سب ہی ان کی آنکھوں کے سامنے پلے تھے۔ میں نے امدادیں نہایت ہندوار، ایک اور  
 خدا ترس آدمی تھے۔ ہم نے کم از کم تیس پینتیس سال تو نہیں آتے جاتے ایک۔ سر پر صاف باندھے  
 پاؤں میں لیٹرے، ہنگامے ایک سفید چادر اوڑھے دنیا دہ فیہا سے بے خبر دواں دواں رہتے تھے۔ نقد حق  
 کی مغفرت فرمائے انہوں نے ہماری اور ہمارے بزرگوں کی اور ہمارے بچوں کی بہت بے لوث  
 خدمت کی ہے۔ محنتِ حمدیہ کے یہ بھابھ چھوٹے کارکن تھے مگر درحقیقت بڑے لوگ تھے، ان کا مقام  
 ان کے خصوصیاتِ تقویٰ، محنت اور نیکی کی وجہ سے بہت بڑا مقام ہے اور یہی سب ہیں جو آئندہ نسلوں  
 کے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے فیضان کو جاری رکھے۔ آمین۔

-----

## اگرچہ سر بتر اشد قنندری داند

مشتاق احمد یوسفی نے ہمارے بزرگ دوست شیخ منظور علی صاحب درویش کو "درویش بے ریا و ریش" کہا ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ وہ واقعی "سرچہ سر بتر اشد قنندری داند" کے مصداق ہیں۔ ہم جن بستیوں کا ذکر کر رہے ہیں ان میں بھی ہم نے دواہی ایسی ہی بستیوں کو دیکھا کہ دیکھنے میں دن والوں کے محاورہ کے مطابق "کلاسوف تعلون" کی تصویر ہیں مگر دل کے فنی درویش تھے درویش بھی ایسے کہ ان کے سامنے بڑے بڑے درویش سر تسلیم خم کرنے کو اپنے لئے اعزاز جانیں۔ ہمارے یونیورسٹی ورکسٹائل کالج لہور میں پروفیسر وزیر الحسن عابدی تھے، لوگ نہیں داڑھی منڈاؤں کہا کرتے تھے۔ غرض ہم نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے مگر جن لوگوں کا ذکر ہم کرنے چلے ہیں وہ اپنے اس وصف میں بھی یکتا تھے۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں؟

ایک بزرگ کو دیکھا کہ سر پر روی ٹوپی اوڑھے، سفید برقع شلوار قمیص پر ہاف ٹوٹ پہنے، بڑا وقار سے اپنے دفتر کی سب سے اونچی انفری کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ داڑھی تقریباً منڈی ہوئی ہے۔ زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں کاغذات دیکھتے اور فیصلے صادر کرتے جاتے ہیں۔ رائے میں اصابت ہے فیصلے وہاں تک ہیں جیسے گہرے تدبیر و غور و خوض کے بعد صادر کئے گئے ہوں۔ بعد کو جب ان سے واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ ان کے فیصلوں کے پس پردہ ان کی تیز بصیرت کا فرما بھی معاملہ کی نہ تک پہنچنے میں انہیں زیادہ بحث و تحقیق میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں تیز فہمی کا ہنر دیا تھا مگر وہ فیصلے صادر کرتے وقت زیر سب استغفار پڑھتے رہتے تھے۔ ایک بار ہمارے اپنے انسر اعلیٰ رخصت پر تھے ان کی عدم موجودگی میں جنس ہم معاملات میں ہمیں ان سے فیصلہ کر دینے کی ضرورت پیش آئی۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ وہ فیصلہ کرتے وقت استغفار کا دامن نہیں چھوڑتے۔ خدا یہ کیسا داڑھی منڈاؤں ہے؟ ان کے حالات پڑھئے تو معلوم ہوا کہ اپنے باپ کے تتبع میں سرکاری نوکری کی، انگریزوں کے زمانہ میں عدالت کی کرسی پر بیٹھے وہاں بھی یہی عالم رہا کہ فیصلہ کرنا تو استغفار کا دامن بکڑ لیا کہ اسے خدا تعالیٰ بندوں کی پردہ پوشی



تو میں نے بائیں ٹانگیں مٹا دیں، جو مختلف ہی موضوعات پر لکھے گئے تھے، ریڈیو کے چھاپ  
یوں لکھنے سے کامیاب شاعت میں۔ پانچ نہیں سمجھتا ہوں کہ اس سے کیا فائدہ ہوگا۔  
میں نے سب تک غیر شائع شدہ چیزیں ہیں، ان میں سے کئی اہم کتابیں وینڈرل کا مونیٹرینگ  
کھود کا لے گا۔

نئی ۱۰، ۱۱ میں سے اس کے پاس بیٹے ہمارے ساتھ آ رہے تھے، ہمارے کلر فید تھے۔ اس ناٹھ سے  
نیک ۱۰ باران سے ہاں جاتا تھا، موٹر گھر میں بھی وہ اسی طرح سے دے رہے تھے جیسے دفتر میں یا ہمارے  
تھے تھے۔ ایک بار ہمارے ایک بزرگ انٹیلینڈ سے آئے تو ان کے سے ان کا ایک بیٹے آئے۔  
ہم نہیں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو بے کراہی سے اپنے ٹیکے کے نیچے سر کا دیا۔ اپنے چھوٹے  
بیٹے کا نام سے کفر مانے لگے اس کو یہ چل گیا تو عتاب کر دے گا۔ ہم نے اپنے اس دست کو چھیر کر تم کو  
کہتے تھے باکو میری اس مادے کا علم نہیں آتا تھا۔ ابا نے یہ فرمایا ہے۔ کہنے لگا حد ہوگئی میں تو بچھے  
پانچ برس سے یہی سمجھتا رہا کہ انہیں میری اس حالت پر آگاہی نہیں۔ خود ہمارے ساتھ یہی حال تھا۔ ہم  
اپنی دانست میں اپنے پاس چھپ چھپا کر ٹکرت وٹھی کیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں ایک  
بار وہ ہمارے ہاسٹل میں تشریف لائے، سامنے ایک بہت بڑا چاندی کا سپ پڑا تھا جو ہم نے انہیں انوں  
بیتا تھا۔ اس کے اندر ہمارے سگریٹ کے باقیات جمع رہتے تھے۔ قبلہ بعد نے کپ کو ایکٹھنے کی غرض سے  
ٹھیک اور اس کا ڈھکھ کھوں پر اندر بھٹکا۔ ہمارا تو وہ حال اور کہ "کاٹو تو ہو نہیں بدوں میں"۔ مگر قبلہ بعد کا  
دوسرا تھا کہ اسی خاموشی سے کپ کا ڈھکھ رکھ دیا۔ پرانے بزرگوں کی کیا بات تھی زمانہ سے کچھ ہم سے  
نہیں آیا۔ کوئی اور ہوتا تو بھٹکوں کے دفتر کھول لیتا یا طعنہ تشنیع کے تیرے نہ تھا۔ ہمارے بزرگ  
جو صدمہ مند تھے پردہ پوشی کرنا جو صدمہ مندوں کا کام ہی تو ہے

دفتر میں ان کا مقام سب سے اعلیٰ فہر کا مقام تھا۔ لوگوں میں ان کا اتنا اعتبار تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میرے  
معاملہ ان کے دربار میں ہے تو مجھے کسی ناخانی کا خدشہ نہیں اور حقیقتاً ایسا ہی ہوتا تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا  
کہ دن کارکن سے لے کر علی کارکن تک سب سے پیسے مانتے سے پیش آتے۔ انگوٹوں میں ہم نے  
یہ بھی دیکھا کہ اپنے دفتر کے چیراگی کو اپنے ساتھ بٹھا رکھا ہے اور انوں اکٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔



ایک سے تھک دانت لے لیا تو فرما دے کہ اسے اسات میں چھوٹے بڑے لوگ ایک دن حق سے قہ پیتے ہیں یہ ہم نے سنا ہے۔ میں نے تو بھی راتوں رات میں سو دلی درد کی تین سو سال معاشرے میں دیے بھی نہیں تھی مگر یہ بزرگ اس مسامت کے نمایاں صبر دار تھے۔ آخر اس کے پوتے تھے ان کے دادا کی سنت بھی تو یہی تھی کہ سب مہمانوں کے درمیان بیٹھ کر کھانا کھاتے اور جب سب لوگ اپنا اپنا کھانا نکال چیتے تو وہ اپنا پیوٹا اٹھ کر سب سے غریب اور دور بیٹھے ہوئے مرید کے پاس چلے جاتے کہ آؤ میں اب ہم بھی کھانا کھالیں اور کسی جیادہ میں حق کے ساتھ ان کا خادم بھی شریک ہو جاتا۔

ان کا وصال ہوا تو ان کی جگہ ایک اور دن نے لے لی۔ ہم نے انہیں ان کی جوانی کے زمانہ میں پناہ لیکٹر انکس کا کارخانہ چلاتے دیکھا تھا یہ ان کی بانی بھی تھی اور روزگار بھی۔ تقسیم سے پہلے ان کے کارخانہ کا ہائیڈروالیکٹر ایک کاساماں دور دور تک مشہور تھا بلکہ دسار کو بھی بھیجا جاتا تھا مگر تقسیم ملک کے بعد انہوں نے زمیندارہ کی طرف توجہ کی۔ چاہتے تو اپنے کارخانہ کے عوض یہاں اچھے سے اچھا کارخانہ آلات کر دیتے مگر ہماری ہستی کے یکینوں نے اپنی متروکہ جائیدادوں کا حکیم داخل ہی نہیں کیا۔ غی ہستی کے ماحول میں ابتدا میں بجلی کے پنکھوں کا کارخانہ انہوں نے قائم کیا مگر خدا جانے یہ ہوا کہ اس کی صف لپیٹ دی اور زمیندارہ کرنے لگے اور اس ذوق و شوق سے کرنے لگے جیسے جدی پشتی زمیندارہ کرتے آئے ہوں۔ چن چن کر غیر آباد زمینیں حاصل کرتے اور انہیں آباد کر کے سرسبز و شاداب بنا دیتے۔ ہم نے کئی بار انہیں دیکھا کہ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں، جب محاورہ کے مطابق چیل انڈا چھوڑتی ہے، یہ اپنے زمیندارہ کی طرف رواں دواں ہیں، کبھی گاڑی ہے کبھی گاڑی نہیں ہے، کبھی ٹریکٹر پر ہی ٹنگے ہوئے ہیں، مگر ان کا سفر جاری ہے۔ سر پر کھڑے ہو کر گندم کی فصل اگا رہے اور اٹھاتے ہیں۔ قہریر چل رہا ہے، گرد کے طوفان اٹھ رہے ہیں مگر یہ اپنے کام میں لگن ہیں۔ ہاں اس حالت میں بھی کھے میں پان دبا ہوا ہے۔ پان کے رسیا ہیں، یہ اس کی دادی اماں کی دین ہے جو دی والی ہیں یا ہو سکتا ہے نہاں کی نوابی کا کوئی ٹرسٹ مگر پان منہ میں ہے اور ان کی شخصیت کا جزو۔ تنگ ہے۔

ان کے کھانے کا حور بھی نرا ہے، دل کے مریض ہیں مگر پراگم نہیں چھوڑ سکتے، ان کے لئے تو پکتے ہی



میں میں نے اپنے ہاں کی بات کرتا اور جواب باصواب سے مستمع ہوتا۔ خون نہ ہوتے تو رام سے مجھ کو رہیں  
 رہیں ہاں میں نے کہا۔ اب تو تھکے ہوئے ہیں۔ بہت تھک رہے تھے۔ ان کی باتوں  
 کا میں نے کامیاب و مسخرہ فرماتے میں نے اپنے مطلب کی بات کیوں میرا وقت ضائع کرتے ہو۔ مگر  
 اس زلزلہ میں ملوث ہوتی تھیں یہاں بھی کا ٹھہر رہا ہوتا۔ زلزلہ ہوتا تو دفعتاً سے ہاتھ نکل کر ٹھنڈا شروع کر  
 دیتے۔ ان کا دواغہ از بہت بھلا لگتا تھا منہ میں پانی ہے، ساتھ میں کوئی دوست ہمیشہ ہے جو باتیں کرتا  
 جاتا ہے اور یہ خاموشی سے سنتے اور ہوں ہاں کرتے جاتے ہیں۔ چہرے پر عجیب و غریب مسکراہٹ ہے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ مرشد کو حالت کے ماتحت ملک چھوڑنا پڑا امارت کا بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا  
 اب یہ محض دفتر کے انصر اعلیٰ نہیں ہیں سارے ملک کے قلعین کی دینی رہنمائی بھی ان کے دماغ ہے۔ جس  
 خوبی سے یہ فریضہ انہوں نے انجام دیا کیا کوئی، اے گا دیکھنے میں وہی درویش وجود لوگوں کو رشد و  
 ہدایت بھی دے رہا ہے، حوصلہ بھی دے رہا ہے استقامت کا نمونہ بھی انہیں دکھا رہا ہے غرض ان کا اسوہ  
 سب کے لئے مشعل راویا ہوتا تھا۔ ہم نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں کہ رہنمائی کے اعلیٰ مقام پر نہ  
 ہو جائیں اور اپنی طبیعت کی مسکینی بھی قائم رکھ سکیں۔ یہ دائمی منزل اولیٰ یہ کر سکتا تھا اور اس نے ایسا کر  
 کے دکھایا تھا جسے تو ان کی وفات پر مرشد نے ان کو خراج تحسین ادا کیا تھا اور اب ان کا وہی بیٹا جوان کی  
 امارت کا جانشین ہوا تھا اللہ کے فضل سے خلافت کے مقام پر سرفراز ہے اور کروڑوں کا مرشد ہے۔

ہم نے اپنے معاشرہ میں اپنے ارد گرد ایسے دلی بہت دیکھے تھے اور ایسے دلی بہت موجود ہیں۔ ابھی بچپنے  
 دنوں ایک دربارے ریش دلی کا انتقال ہوا ہے۔ نحیف سے آدمی تھے۔ پچیس برس کی بیماری نے ایک  
 پچیس برس برباد کر دیا تھا محض ایک کے سہارے جی رہے تھے۔ جوانی میں اپنے گھر بار والوں خاندان  
 والوں کے اعلیٰ رُغم مسلک تبدیل کر لیا وہ دلی اے کرنے کے بعد خدمت کے لئے آگئے۔ ہمیں ان کے  
 ساتھ دفتر میں کام کرنے کا موقع ملا۔ فرمایا تھے خادم تھے لہجہ میں اتنی انکساری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔  
 علمی ذوق کے آدمی تھے ہی لئے ہمارے ساتھ شفقت سے پیش آتے در عمروں کے تعداد کو نظر انداز کر  
 دیتے تھے۔ اسیری کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اردو انگریزی دونوں زبانوں کا ذوق رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ لوگوں  
 کو انگریزی کا سبق بھی دیتے رہے، خود اپنی اولاد میں ریٹیاں ہی تھیں ان نواحی عیسائیوں کی۔ ریٹائر ہونے

کے بعد مسجد کے پاس گھر آیا کہ دور نہ جاتا ہے۔ اس کے بھی ذوق کا لمبیہ تھا کہ میں نے کسی قسمی کتاب کی بھٹ پڑتی تو لور، ہیری، ہارنکرسٹے نہ مٹی تو ہن میں، یہ اس تشیخا ہے کا، ہیری میں بھی نہ مٹی تو، ہور میں تلاش کروا دے غرض جب تک وہ کتاب دیکھ پڑا نہ بیٹے نہیں جین فہیب نہ ہوتا۔ ہم نے کئی کتابیں ان کی سفارش پر پڑھیں اور ان کے ذوق تسلیم کی داد دی۔ ان کی زندگی کا محور گھر تھا، ہیری، ہمیں وطن چھوڑے بارہ برس ہونے کو آئے عمران کی یاد پر براتی رہی۔ سوین میں ہم نے اپنی کتابوں کی دکانوں سے کئی ایسی نایاب کتابیں خریدیں جن کو عمران کی سفارش پر پڑا چکے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ وہ کتابیں نہیں بھیج دیں مگر غریب الوطنی میں ساری خورجینیں پوری تو نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ اس دراثہ میں بے ریش کی مغفرت فرمائے۔

ہاں ہمارے سکول کے ہیڈ، سربھی تو اپنی بزرگی اور تقویٰ شعاری کی وجہ سے اسی درویشی کے مرتبہ پر فائز تھے۔ سب سکول کی اسمبلی میں درس حدیث دیتے تو آنکھیں نم ہو جاتیں۔ میں اس وقت تو بچپن کی، کبھی میں ان کی رقت کی وجہ سمجھ میں نہ آتی اب سوچتے ہیں تو ناک گدار سمجھ میں آتا ہے الہی کیسے کیسے ہو گئے تھے۔ یہ صوفی بھی بے ریش صوفی تھے۔ قلب مطمئن کی دولت سے مالا مال اب ایسے لوگ کہاں؟ اب نہیں دھونڈا جا رہا رخ زیبائے کرا!

-----

## خاموش کارکن

یہاں میں نہیں بھی کسی نظم کا، جو، سو، ہیں اس نظم کو چھاننے کے سے کارکنوں کا وجود بھی ضروری ہوتا ہے۔ بدعت احمدیہ کا نظریہ اس لحاظ سے ایسا کا مفروضہ عام ہے کہ اس نظم کو چھاننے سے کارکن کی یہ ویکی مفاد سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ اس نظم میں قوت کا سرچشمہ خطیبہ مسیحی کی بات ہے۔ تمام کارکن خیفہ وقت کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ پھر کارکنوں میں مراتب کا فرق ہے کوئی وقف زندگی کارکن ہے کوئی جزوقتی وقف کے تحت کام کرتا ہے اور کچھ کارکن ایسے ہوتے ہیں جو علماء و فقہین زندگی ہی کی طرح کام کرتے ہیں مگر غلطاً شاید واقف زندگی نہیں ہوتے۔ بدعت کا سارا عام اخلاص اور وقف پر چلتا ہے اور چل رہا ہے۔ اب اس قسم کے کارکنوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے کیونکہ لندن میں حضرت صاحب کے ارد گرد کام کرنے والے اکثر کارکن فقط واقف زندگی نہیں مگر علماء سارے ہی کارکن وقف زندگی ہیں اور بلا معاوضہ و رضا کارانہ طور پر جماعت کا کام کر رہے ہیں۔ اس سال جلسہ سالانہ کے بعد برمنگھم میں عزیز فیضیہ شاہ کے گھر ایک شعری نشست میں پاکستان کے ایک بہت بڑے شاعر ضیا جالندھری تشریف لائے ہوئے تھے جو پاکستان کی ویکی مینیجنگ ڈائریکٹر رہ چکے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ اس نشست کی ریکارڈنگ کے لئے ایم پی اے کی جو نیم لندن سے آئی ہوئی ہے اس کے سارے ہی کارکن رضا کار ہیں ایک بھی ملازم یا تنخواہ دار کارکن نہیں تو ان کا منہ حیرت سے کھلے گا کھار دے گا کیونکہ وہی ویکی اور اس کے تقاضوں کو عملی طور سے جانتے تھے اور اس بات سے آگاہ تھے کہ یہ کام تقویٰ کا کام ہی اور محنت اور دلسوزی کا ہوتا ہے۔ کہنے لگے جس جماعت کو تو وقت اور اتنی محنت دینے والے رضا کار کارکن میسر ہوں اس کی دن رات چوٹی ترقی کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔

ربوہ میں جب ہم نے ہوش سنبھال اور انجمن کے کارکن کی حیثیت سے خدمت شروع کی تو یہ احساس مایہ دل تھا کہ اگر ہمیں جماعت کی خدمت کرنی ہے تو ہمیں ملا بھی وقف زندگی کے نظم سے منسلک ہو جانا چاہیے چنانچہ بی اے کرنے کے بعد وقف زندگی کا درجہ پر کر دیا۔ ارشاد ہوا ایم اے کریں۔ ایم اے

صاحب کتاب تو ناپیشہ تھے مگر بندہ سے سنے زیادہ سے لکھتے تھے گویا وہی مقدس نوشتہ رقم کر رہے ہوں۔  
 اپنے استاد چوہدری غلام محمد غازی سے پتہ تو چلتا ہے تھوڑے مضمون لکھوں۔ چوہدری صاحب سے  
 تعلق کی مانتی سے شروع نہ سوا کاغذ کے رہا نہ سے شروع ہوا۔ چوہدری صاحب حضرت صاحب  
 کے دوستوں میں سے تھے درمدمسا۔ جو بی فتنہ کے کرتا دھرتا تھے۔ حضرت ضیہ المسیح الٹانی کے ساتھ  
 کشمیر کیمپ میں کام کر چکے تھے اس لئے کشمیر سمیٹی کی تاریخ پر سند کبھی جانتے تھے اس سند میں ان کی کتاب  
 بھی چھپ چکی ہے۔ ہمارے پاس بھی ان کی دوستی تھی۔ چوہدری ظہور احمد نے اپنا سفر دفتر کی حیثیت  
 سے شروع کیا اور ناظر کی حیثیت سے رہنا شروع ہوئے۔ وضع دار آدمی تھے صاحب ذوق بھی تھے۔ ہاں کے  
 بارہ میں غصہ کا مظاہرہ کرتے تھے سر پر کلاہ والی سفید چڑی باندھتے تھے باتوں میں موہنی تھی غی علیہ کو  
 نرودیدہ کر لیتے تھے سند کے صحت کا بہت حرام کرتے تھے کہتے تھے عالم نہیں ہوں، علم شمس ہوں اور  
 وقتی ظلم کی پیچون رکھتے تھے رفتہ رفتہ ہمیں ان سے دوستی کا شرف حاصل ہوتا گیا حتیٰ کہ آخری عمر میں بعض  
 اوقات طلب فرماتے اور فرماتے میرے ساتھ باتیں کرو۔ ناظر دیوان کی حیثیت سے رہنا شروع ہوئے  
 کارکنوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اپنا فرض جانتے تھے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اپنے رنگ کے صوفی تھے  
 نمودار کش سے متنفر اور ماری۔ جب ہم انجمن میں کلرک تھے چوہدری صاحب کا رکن درجہ دل تھے پھر  
 نائب آڈیٹر ہوئے پھر ڈپٹی پھر ناظر۔ انجمن کے بہت کم کارکنوں کا ترقی کا گراف ایسا ہے۔ صاحب  
 کتاب کی سوجھ بوجھ خود ان کی اپنی پیدا کردہ تھی کوئی ڈگری وغیرہ ان کے پاس نہیں تھی صد سالہ جو بی کا فتنہ  
 اور اس کا صاحب کتاب بڑا نیکو ہاں سند تھا مگر چوہدری صاحب نے اسے بڑی خوش اسلوبی سے سرائی کر دیا  
 ٹائٹل منٹ کے بعد بھی خدمت کرتے رہے مگر ایک روز اچانک اس سفر پر نکل گئے جہاں سے کوئی واپس  
 نہیں آتا۔ ان کے بیٹوں میں سے منور ہمارے کلکس فیوٹھا چھوئے ہمارے شاگرد ہوئے عزیز بھتیجے محمد نیشنل  
 بینک آف پاکستان کا سینئر عہدیدار ہے اور پاکستان سائیکلنگ میوزی ایشن کا "رشتہ دار" ہے ہمارے  
 دوست ڈاکٹر رشید احمد ان کے داماد تھے ان کی اولاد یہاں سویڈن میں آباد ہے۔ ہم پہلے پبلک سویڈن  
 میں تھے تو عزیز ڈاکٹر انس رشید اور اس کی بیوی عزیزہ مسرت نے اتنی محبت سے ہمارا خیال رکھا کہ  
 میں ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے بچوں سے یا وطن سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں

## ہمارا مکتب عشق

قادیان میں ہمارے گھر کے باغ پاس ایک کھلے میدان کے شمالی کنارے پر ایک عظیم شان عمارت کھڑی تھی۔ مسجد نور میں جانا ہوتا تو اسی طویل میدان کو قطع کر کے جانا ہوتا۔ عمارت کی زیبائی اور خوبصورتی اپنی طرف کھینچتی کہ جانبدار۔ مگر بچوں کو اس عمارت کے آس پاس پھٹکنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ہم وہ بچے سے گھنیر بڑے چھتر درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے مسجد تک جاتے اور راستے پر اس عمارت کی خوب صورتی سے اصف انداز ہوتے ہوئے گھر آ جاتے۔ بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ تاج محل کسی زمانہ میں سکوں کی عمارت تھی اب کالج کا سکون ہے اور صرف وہ طلبہ یہاں تعلیم پا سکتے ہیں جو میٹرک کے امتحان کا مرحلہ کامیابی سے طے کر چکے ہوں۔ بھلا پرائمری سکوں کی تیسری جو تھی جس عمارت کے نرکے کے دہن میں کالج کی صورت بت کا کیا کیا تصور پیدا نہ ہوتا ہوگا۔ چنانچہ اس حیرت میں حسرت بھی شامل ہو گئی۔ جب ہمارے کالج تک پہنچنے کا زمانہ آیا تو ملک تقسیم ہو چکا تھا ہجرت وقوع میں آ چکی تھی۔ اس قدح بشکست و آس رقی نہ ماند۔ تقسیم ملک کے کوئی گیارہ بارہ برس بعد قادیان جانا ہوا تو کالج کی عمارت اسی جگہ تھی مگر اس کی خوبصورتی نہ رہی تھی۔ اس کو دیکھنے سے آنکھوں میں جو طراوت آتی تھی وہ مفقود تھی۔ ہر اک مکان کو ہے ہمیں سے شرف اسد۔ ہماری مسجد مسجد نور کے دروازے تیغہ کئے ہوئے تھے۔ بڑ کا درخت اپنی کہن سالی کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ ساتھ کا سونگ پول خشک اور بے آب تھا۔ بورڈنگ ہاؤس کی دیدہ زیب عمارت بھی "صورت بھل حالت پیرس" کی تصویر تھی۔ درود یوار سے حسرت پڑی نکلتی تھی۔ ہمیں اپنے گھر کو دیکھ کر روانہ آیا تھا ان عمارتوں کی حالت نے دل دیا حال کنہ ان عمارتوں سے ہمارا محض آنکھ دیکھے کا رشتہ تھا۔ کالج میں پڑھے تھے نہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ ربوہ میں یہ دونوں خوش نصیبیاں حصہ میں آئیں۔ مگر دوائے غریب الوطنی کہ اب اس بستی سے آنے والے کہتے ہیں کہ کالج کے سامنے سے بھی گزریں تو آنکھیں بھرا آتی ہیں۔ کہاں گئے وہ زمانے کہاں گئے

ہم نے میٹرک کا تیسرا چھوٹا سا سہارا دیا تو وہ پھر سے وہاں پہنچ گیا۔ اس  
 کہہ رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں مارل نہیں تھا۔ یہ مارل تھا۔ یوں کہ ایک ہی سال میں کسی سکول کے  
 طلبہ نے یونیورسٹی کے میٹرک کے امتحان میں ہمیشہ اتنی نمایاں حیثیتیں حاصل نہ کی تھیں۔ غضب خد  
 کا اول اس سکول کا ڈاکٹر محمد۔ تیسرا اس سکول کا ڈاکٹر سعید محمد خاں۔ ساتواں اس سکول کا لڑکا برکات  
 علی جنجوعہ۔ دسواں اس سکول کا ڈاکٹر عبدالغفور زہد۔ ان کے پیچھے پیچھے بھی بہت سی نمایاں کامیابیوں کا  
 سلسلہ تھا جو ہمیں اس وقت یاد نہیں رہی تھی۔ اس وقت میں ضرور محفوظ ہوگا۔ ہیڈ ماسٹر کی فطرت ان تھے۔ رات بھر رات بھر  
 اپنے سکول کے اس کارنامہ پر جہدات شکر بجا رہے تھے۔ اخبار والے نمایاں کامیابیوں حاصل کرنے  
 والے لڑکوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ساتھ ہی جہد خوش۔ طلبہ اپنی جہد تازاں غرض شہر کا شہر خوش تھا اور  
 تو اس چھوٹے میں بھی جشن کا سا تھا کہ ان طلبہ نے آخر امتحان تو ہمارے ہی شہر سے دیا تھا۔ یہ تو وہ  
 یہ مارل سکول تھا جس میں ہم نے تعلیم پائی۔ درود ادارہ جس کو ہم ”پنا کاغ“ یا ”اپنا مکتب عشق“  
 کہہ رہے ہیں کوئی ہمیشہ نہیں رکھتا تھا۔ ہم نے اس کاغ کی عمارت کو اپنے سامنے تعمیر ہوتے اور اس کی  
 تعمیریں اور تبدیلیاں دیکھیں تو اپنے سامنے مستحکم ہوتے دیکھتے تھے۔ اس کاغ سے ہمارے محض آنکھوں دیکھنے کا  
 رشتہ نہیں دانت کاٹی ہوئی کارشتہ تھا۔ ہم نے اس کاغ سے محض تعلیم ہی حاصل نہیں کی اس کا رزق بھی یہی  
 ہے اس سے حق نمک سے ادا ہونے کی سعی کریں گے۔ ریلوے لائن پر وہ شہر کے تین بچوں سے گزرتی  
 تھی۔ کالے کالے پہاڑ ایک جانب رہ جاتے ہیں۔ شہر کے خوب میں ریوے لائن سے پرے ریوے  
 لائن کے ساتھ ساتھ ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس عمارت نے سر اٹھانا  
 شروع کیا اور دو تین برسوں میں ہی مکمل ہو کر ایک ادارہ کی شکل اختیار کر لی۔ ہم اس عمارت کو ایک عجیب  
 نام درجہ کے عام میں بننے دیکھتے رہے۔ میٹرک کا مرحلہ ہم طے کر چکے تھے۔ ہمارے ساتھی لاہور میں با  
 کر کاغ کی تعلیم کے دوسرے مکمل کر چکے تھے ہم پیچھے رہ جانے والے مسافر کی طرح اس بات کے منتظر تھے  
 کہ کب کاغ کی یہ عمارت بنے کب تعلیم کا سلسلہ جاری ہو اور کب ہم بھی اس کاغ کے طالب علم کہلانے  
 کے قابل ہو سکیں۔ کاغ کے پرنسپل جو آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے کبھی کبھار اپنے ”عمو صاحب“ کو



ملنے کے لئے ہمارے پاس ایک منجمی قدم نچوڑا۔ تھے جس میں ہر طرف سے فرشتے کے حضور آ  
 ہونے والی مسلسل مناسبتیں تھیں۔ ہمیں ایسا بھی جاننے ضرور پڑا کہ اس میں ہمارے  
 منہ میں چھپے کا سدا تروت سا چکا تھا۔ اس سے ایک بار جو صد فزائن کی کتاب سے ہماری جانب راہ  
 اٹھائی۔ ایک بار تو یہاں تک فرما دیا کہ آپ کی یہ جگہ نہیں کاٹی جائے تو فوراً کات میں داخل ہوں۔ اس  
 سے ہم اس عمارت کے بننے اور کھانے کے جاری ہونے کے یا کیا آرزو مند تھے۔ بارے دو وقت مسعود  
 کیا بات جاری ہوا اور حد کا اعلان ہوا۔ محدود کا حارم کے راجا مصر ہوئے۔ پرنسپل صاحب نے کچھ عجیب  
 کے دربار کے نہیں دیا فارم پر پینچوٹن سے ہوا دے جو ہماری فہم سے باہر تھے۔ ہمدرد فارم لے کر کات  
 کے دفتر میں گئے۔ معصومہ پرنسپل صاحب نے ازراہ ذرہ نوازی پوری فیس معاف کر دی ہے بلکہ کالج کی  
 جانب سے مبلغ پانچ روپے مہینہ وار وظیفہ بھی مقرر کر دیا ہے۔ ہم حویہ سوچ سوچ کر بلکان سو رہے تھے کہ  
 نذرہ خدمت کالج میں داخلہ کے لئے تھے رہے ارکار ہوں گے یا ایک ہکا بھکا محسوس کرنے لگے۔ نئے  
 داخل ہونے والے لوگوں کو ایک کوئی سات سو نمبر لے کر آیا تھا کوئی ساڑھے سات سو۔ ایک سے ایک  
 نایب کالج کے کوریڈور میں محو فرما نظر آیا۔ ہمیں ایک اور فکر بے گھیر لی کہ ان علی نمبر یافتہ لوگوں میں ہم  
 کہاں نمبر پائیں گے "ایسا نہ ہو ایک مینی وڈ کوٹھ چلتے کر دے جائیں۔ پھر یہ سوچ کر اس کو تسلی دے دی  
 کہ سکول میں بھی تو ہمارے ساتھ سی تھے "از قسے نایب ہائے روزگار" لوگ تھے وہاں ہم ان سے نہیں  
 اسے تو یہاں ان سے کہاں وہ ب کے رہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی سوچا کہ یونیورسٹی میں کوئی اسی  
 پوزیشن نہیں آئے گی تو وہ پہلے کب آئی تھی؟

ہم ابھی اپنے پانچ روپے مہینہ کے وظیفہ کی لمکا ہی سوچ رہے تھے کہ قبلہ جنید ہاشمی مرحوم نے کہ کالج کے دفتر  
 کے پرنسپل صاحب تھے ہمیں ہاتھ کے اشارہ سے بلایا۔ ہمارا خیال تھا کچھ فرمائیں گے عزم میں پان تھا  
 فرماتے کیسے؟ ایک فائل ہمارے ہاتھ میں تھا وہی اور پان کی بیگ کو منہ میں ادھر ادھر دوڑتے ہوئے ہمیں  
 بتایا کہ یہ کالج کے مجتہد النور کی فائیں ہے اور یہ کہ ہم پہلے دن۔ سے ہی اس مجلس کی مجلس ادارت میں شامل کر  
 دئے گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کا ارشاد ہے کہ پرچہ معیاری ہونا چاہئے اس نے محنت سے مرتب کریں۔  
 مجلس ادارت میں دو کون کون ہے؟ فرمایا معلوم ہو جائے گا پچھلا پرچہ دیکھ لیں۔ ہم ابھری میں گئے کہ

منار کا پچھلے پرچہ انھیں دہاں سوکا ہوا تھا۔ کتابیں بہت اماروں میں بندری تھیں۔ اس لئے سب تھے۔ یہ سبے سبے رہا تھا میں آج یہیں ٹکڑا ہوا۔ اس میں ایک پارہ سب سے بڑا ٹکڑا ٹھیکہ ہوتا ہے۔ ہم نے پہلے کر پڑھا اس قدر اچھا تھا۔ وہی تھی اس سے مار چلے گئے جس تیزی سے ہم اس کی جانب پہنچے تھے سب دھم سے کوئی سواں کر ڈالیں۔

ہماری قسمت بھی تھی کہ ہمارا سکون کا ایک پرانا ہم جو امت "ذوین ظہن" دوست نظر پڑا۔ اب وہ سنہرے تھا اور ہم بہر حال فرسٹ ایرف تھے اس نے کسی ای کی گھبرنے کی بجائے یہ موقع ہو گیا کہ فرسٹ ایرفول ہانے کا ہوتا ہے اس لئے ہمیں وقت کو دھرا، آخر پھر کر ضاع نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم فرسٹ ایرفول ہونے کے باوصف دوسراں کو فول ہانے پر مستعد ہو گئے۔ یہ دھڑکا بہر طور اگلا تھا کہ ہمیں ہم خود تو فول نہیں بن رہے؟ اور یہ جو امانت کا پلندہ ہم اٹھائے پھرتے ہیں کہیں یہ ہمارے فرسٹ ایرفول ہونے کا مقام شوق تو نہیں؟ "نہیں! ایڈیٹر دیکن در فضل دارد۔۔۔"

فول دل تو ہم نے لوگوں کو بہت بنایا مگر اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ جولا کا مادہ "وظیفہ خوار" نکلتا۔ مناسب وظیفہ خور سود و شہ کو دے۔ ہم خود اپنے وظیفہ خور ہونے کو بڑا طرہ، امتیاز سمجھے بیٹھے تھے بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کان ہے یہ وظیفہ خواروں کی۔ انھیں؟ معلوم ہوا کہ اس کان کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ مستحق طلبہ کا وظیفہ دیتا ہے اور اس میں کسی کے رنگ و نسل اعتیاد و بدعتیہ کی نیکی ہدی بدعت غیر بدعت کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مستحق طلب علم سے محروم نہ رہ جائیں۔ پہلے روزی جس انہوہ غیر سے سلسلہ "فول ٹری" مذاقات ہوئے وہ اسی زمرہ، "وظیفاء" میں سے نکلے۔ اکثر لوگ تو عقیدہ ابھی محض "عقیدہ تین" تک یعنی یہ بڑے بڑے تین دوش والے کان کی رونگ ٹیم کے ہیمپس بوٹ کھانے پینے میں اپنی "تن کی دنیا" تھا آتی ہے تو پھر جاتی نہیں" کے قائل۔

ہوش میں یہ لوگوں کی اکثریت پائی جو ہمارے عقیدہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا تھا البتہ ایک "تکلیف" سے تو تھی کہ "آگیا میں پڑھائی میں گر وقت نماز" تو نماز اترام سے پڑھنا پڑتی تھی۔ ہمارے ایک دوست (جو پچھلے پارٹی کے زمانہ میں وزیر ہو گئے تھے) کہہ کرتے تھے کہ قبل نماز تو نماز پڑھتا نہیں تھا (من اپنا پرانا پانی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا) ہمارے لئے ایک



تو آج ہی آیا تھا۔ ہمارے ساتھی سے یہ سب سنا کر مجھے لگے یہ تو بڑا بڑا کام ہے۔ ہم نے  
 اس کی کہ بناب شاعر نے غلامی بنانے کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے کہ "یہ شہادتِ رسالت میں  
 قدم رکھا ہے۔" وہ آسان سمجھتے ہیں مسلمان سوانہ "فرمایا خوب ہے خوب ہے یہ" اشعر ذر مجھے  
 لکھو دیا۔ "آپ نے قلم نکال کر اپنے "ہد بشارت" میں پورے صفحہ پر یہ لکھ کر یہ شعر نوٹ کر یہ وہ نہیں  
 جہزت دی اس کے بعد ہم چار سال تک اس کی کڑس میں حاضر رہے۔ چھینچھوہاں سے چلی جائے سدا  
 معاہدہ۔ نہ وہ اپنی نوک جھونک سے رکے نہ ہم نے اپنی سنت جاریہ سے انحراف کیا۔ تا آنکہ چار سال  
 کے بعد یہ "نگار کا اس" کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے قصور معاف تو نہیں ہوئے البتہ ان کی سزا  
 میں ذمہ صحت تخفیف کر دی گئی یعنی جب کانٹ کے شاف پر جانے کے بعد موقوف ہوئی ازراہ کرم مسکرا کر  
 ملنے اور ایک آدھ فقرہ بھی چست کرتے۔ اب کہاں سے اداؤں کو تم سائیں جسے؟ وہ اپنے اس عقیدہ  
 میں بڑے پختہ تھے کہ حنت کی زبان عربی ہوگی اس لئے ہمیں خشوع و خضوع کے ساتھ یہ زبان سیکھنی  
 چاہئے ورنہ مرنے کے بعد دقت پیش آئے گی مگر ہمارے اس استفادہ کا خوب اس کے پاس بھی نہیں تھا  
 کہ حنت میں عربی بولی جائے گی اور آپ عربی پڑھاتے تو ہیں مگر بولتے ہیں نہ بولنا سکھاتے ہیں آپ کی  
 پڑھائی ہوئی عربی کس کام آئے گی؟ زچ ہو کر فرماتے تھے یونیورسٹی داؤں نے عربی بولنے کو کورس میں  
 شامل ہی نہیں کیا تو سناؤ عربی بولنا کیوں سکھائیں؟ اور ہم اپنی کج بخشی کی رو میں ان سے کہتے تھے کہ اللہ  
 میں کو جنت کے نصاب میں عربی بولنے والی قرآن دینے سے پیشتر یونیورسٹی داؤں سے مشورہ کر لینا  
 پڑے تھا۔ اس پر اور زیادہ زچ ہوتے اور عربی کے مشکل مشکل الفاظ سے ہمیں ڈرتے تھے۔ بعد کو معلوم  
 ہوا کہ پتی "انڈاری" "گنگلو میں" "مقامت حریری" کے فقرے کے فقرے بول جاتے تھے اور سننے والوں  
 کو خاطر خواہ عبرت حاصل ہوتی تھی۔

یہ بزرگ کانٹ کے سینئر ساتھ میں سے تھے۔ اپنے مضمون میں تیرے ہوئے۔ مدقوں بعد ان کے ایک ہم  
 خدمت دوست نے جو پچیس کی ہائی میں لاہور میں ہندوستان کے فضل جنرل تھے ہمیں بتایا کہ آپ  
 نے جوانی میں آئی سی ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی مگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دین کو دنیا پر  
 مقدمہ کرتے ہوئے خدمت کے لئے اس کانٹ میں آ گئے تھے۔ عربی کے سوا کوئی دُرگمذکیرہ ان سے

منسوب نہیں تھا۔ نہایت محض۔ رہا محبت پروردگار موقت آئی تھی کہ حکم عداوت نہ ملے۔

خان کی پڑھائی شروع ہوئی۔ ہم چلے اور کھر۔ بلد (میں کے ساتھ) کھر سے "سسترق" تھے اردو عربی فارسی کے ساتھ مذکورہ ذرا تہہ خراب کرنے کے لئے پہلے ان میں رنگی پھر سنہ کے امتحان سے چند مہینے پہلے تاریخ رکھی اور نفل ہو جانے کے امتحان سے چل گئے۔ ورنہ اس میں تو میں لے جاتی۔ ان میں ایک ایک کیا سب سے بڑا "فائدہ یہ تھا کہ" شوق آوارگی "کی تسکین کے لئے" و فرماتے میسر تھے۔ یہ باتوں میں چلے گئے نہ چاہتے تھے البتہ عربی کی کتاب سے غیر ضروری کے لئے "شرعی" بہانے تراشا پڑتے تھے اور یہ بہانے تراشنے کے لئے ہم نے "باب الحیل" کا بارستہ بابت مت لکھ کر رکھا تھا۔ کانٹ کے دوسرے سینئر استاد فلسفہ کے استاد تھے جن کے باب میں لوگوں نے ہمیں بہت ڈرا رکھا تھا کہ طبیعت کے بہت سخت ہیں۔ "موقعہ یاد راں تو بر شمر کی طرہ رسم۔ رزم" اب دشمن میں "فوائد" دے مومن۔

اردو کے بڑے نغمہ گو شاعر ہیں۔ ہم نے سوچا شاعر میں تو اپنے کام کے چھپنے پر بہت زیادہ خوش ہوں گے۔ ان کی ایک غزل ان سے ایک محفل خاص میں سنی اور اپنے دہن میں محفوظ کر لی۔ گھر آ کر وہ غزل کاغذ پر اتاری اور المنار کے اگلے شمارہ میں بڑے طعرات سے شائع کر دی۔ پرچہ کا چھپ کر نہ تھا کہ گویا بھونچال آ گیا۔ سنا کہ قبلہ اپنے تمام حیرت انگیز سمیت ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کدھر ہے وہ نانا بھور ایڈیٹر جس نے میرا کلام بلاغت عام میری اجازت کے بغیر چھاپ دیا ہے؟ مگر کے خاک نہ کروں تو "داغ" نام نہیں۔ پرنسپل صاحب سے اس دوران مناسب منا ہو گیا مسکرا کر فرمایا کیوں میاں سے ہے آج کل رویہ ہو؟ ہم نے کہا "جی سنا ہے بزرگ میری تلاش میں ہیں" فرمایا تلاش ہی تلاش؟ خیر نہ ڈ۔ بھی ہم اسی مکالمہ میں "بتا" "تھے کہ وہ بزرگ استاد آگئے۔ ہمیں پرنسپل صاحب سے کچھ گفتگو دیکھا تو ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ پرنسپل صاحب سے ان کا افسر ماتحت کا نہیں عشق و محبت کا رشتہ تھا۔ پرنسپل صاحب نے ہمیں ان کے سپرد کیا کہ بچے آپ کا مجرم حاضر ہے۔ اب ان کی کیا بول کہ ہمیں کچھ کہیں۔ ان کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ گئی۔ ہم حیران پریشان اور سراسیمہ۔ کانٹ کا کارڈیڈو طلبا سے اناٹ بھرا ہوا۔ ہم خاموش کھڑے ہیں اور وہ بزرگ دھاموں رو رہے ہیں۔ بارے ان کی طبیعت میں ذرا سا

نصیرؔ بید ہو تو فرمایا آپ نے بہت غم کیا۔ بہت غم کیا۔ خدا نے سے "سدا" یہ علم نہ کیجئے گا اور یہ بہت کر بھر دانے لگے۔ ۱۰۰ دس ہوں تو دس کے پیچھے پیچھے اس کے جھروٹے ساتھ آپ فرمایا جیتے میری جان چھوڑ دیجئے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ سارا سب برس پنا کا موسم نے باجی پوانے کا قائل نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں "ارکھل جائیں گے دو چور قاتلوں میں" درست ہوگا مگر دو چور قاتلوں نے لم ریم دو سال کا وقت لیا۔ دوسرے کے بعد کائنات کے ایک مشاعرے میں "وہی ایک غزل سن کر نیکی اور ہمیں زرہ کرم اپنے حساب کے زمرہ خاصان میں شمار فرمایا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کلاس چھوڑنے کی بجائے ہمیں سا کر پنہت ہو جاتے تھے کہ چھو یہ چیز محفوظ ہوئی۔ سنا ہے بھی کچھ لے دوں (اور یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں) کسی مشاعرے میں فرمایا ہمیں شعر یاد نہیں رہتے سیر کا نام لے کر فرمایا کہ وہ ہوتا تو یہ دکر داتا کہ اس غزل کا فداں شعر کیا ہے۔ اب تو ہمارا پنا یہ حال ہے کہ شعر تو دور کی بات ہے مصرعے تک یاد نہیں رہتے۔ یہ قول شفیقہ ہمارا حاضاب دروغ گورانا سو کر رہ گیا ہے۔ "دروغ گورانا حفظ نہ باشد۔"

سائنس ہم نے پڑھی نہیں مگر گامی چھٹی تو سائنس کے اساتذہ کے ساتھ۔ نصیر خان صاحب۔ علی ٹرہ کے بالے جیسے گر بھوایت' ہاسکٹ بال کے کھلاڑی اور کوچ۔ یونین کے انچارج تھے اس لئے ہمیں ان کے سایہ و ہفت میں آنا پڑا۔ یونین کے مباحثوں میں حصہ لینے کا شوق چرایا۔ کچھ دنوں ہاں سکول کے زمانہ سے کر لیتے تھے کچھ زمانہ ہیکاری میں اپنے دو جوانوں کی تنہیم میں تقریریں کر چکے تھے اس لئے خیال ہوا کہ یونین میں تقریر کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ مباحثہ کا احاطہ ہوا تو ہم نے بھی نام لکھوا دیا۔ مددگار کارکن نے آ کر کہا نصیر خان صاحب یاد کرو ہے ہیں؟ ڈرتے ڈرتے یونین کے دفتر میں گئے۔ ایک نہایت سرخ و سفید وجہہ صاحب تشریف فرما تھے چھوٹے ہی کہنے لگے "آپ کے بارہ میں بڑی بری بری باتیں سنی ہیں یہ وہ سب ٹھیک ہیں؟" ہم نے کہا "جی ہاں بری بری باتیں سنی ہیں تو یقیناً ٹھیک ہوں گی کیونکہ کوئی اچھی بات تو ہمارے ساتھ منسوب نہیں ہو سکتی۔" (زیر اور پیش) دونوں کے ساتھ کھل گئے فرمایا "سپ کے غزل چھاپ دینے کا معرکہ مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ اب کہتے مباحثوں میں آپ کیا کیجئے گا؟" ہم نے کہا "بحث کریں گے اور کیا کریں گے؟" کہنے لگے "اپنی تقریر لکھ کر مجھے دکھا دیجئے" اب

تہ تر توڑے۔ لیجیے سوئی ہے تکیہ پر یہ بھی تو کیا پرچی مگر اس سے مسرت تھا تہ تر یہی۔ پھر اس وارنا کیا  
چرخ برتا۔ اور نوئی قسمت کہ میں مدحہ میں مہم شے۔ یہی حقانی تھی۔ لیجیے میں نے دوست  
لے۔ مگر یہ صاحب جس ہوئے بنے کے جو مسرت مہم شے میں میں اچھا مسرت مہم شے کی صد مہم شے  
مہم شے ہیں۔ میں رما گانے پر اعتدال تھا مگر بعد کو یہ پڑھا کہ چرخ میں بھی مہم شے پہلے مہم شے تھا پھر سے وہ  
گیا تھا۔ اس کی حقانی مہم شے۔ آراء تقریریں میں اور میں نے پڑھا کہ فی البدیہہ کی میں مہم شے کی مہم شے  
کبھی سوئی اور باقاعدہ مہم شے کے رد برادر کھڑے ہو کر مشق کی ہوئی تقریریں ہیں۔ پہلے ہی مہم شے میں یہ  
یہ صاحب مہم شے کے حرب مخف میں تھے جو تہ تر مہم شے اور ہاتھ زیدہ چہم شے تھے۔ ہم نے ان کی  
تقریر کے رد میں اس کی تقریر کو مہم شے کیا آراء تقریر کی بجائے مہم شے بعض تقریر کہا تو مہم شے صاحب نے یہ  
آراء بلند دادی اور یونین کا انچارج و دو۔ و دو۔ و دو کی کیا مجال ہے کہ انداز میں چنا چھ اہ مہم شے ہم  
نے۔ و دو۔ یا۔ پھر ہمیں باہر کے کالجوں میں مہم شوں میں جانے کی اجازت ملنے لگی اور اس طرح مہم شے  
باہر کی دنیا کے دانش وروں سے تعارف ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بخدا ہم ایک سب بہا دوست سے مہم شے مہم شے  
جاتے۔

سائنس کے آدمی تھے مگر سائنس دانوں کی بخشی اور پوست ان میں نہیں تھی۔ یہی پوست کے سنے اور بہت تھے۔ سائنس دانوں میں سے پروفیسر حبیب اللہ خان، میگزین یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں چوبیس سو دو میں کیمسٹری پڑھا بھی چکے تھے یہاں کا لیکچر یہاں بھی اردو میں سونا چاہئے تھا۔ مگر محبوب یونیورسٹی کا دستور نہ تھا ذریعہ تعلیم، اردو کی بجائے انگریزی تھی مگر حبیب اللہ خان صاحب ذرا حوالہ باب میں بیٹے ثابت ہوئے ہوں کلاس میں کیمسٹری انگریزی میں پڑھاتے اور سائنسی مضامین پر کتابیں اردو میں لکھتے اور حکومت سے نعمات حاصل کرتے تھے مانا با کاج کے پہلے استاد تھے جنہیں "خلد کی تحفہ" اور "سمندر کے عجائبات" نامی کتاب تھیں پر انعام ما۔ ہمارے کالج میں ایک سے ایک مابعد استاد تھے انھیں مگر کاج، روہ میں منتقل ہوا تو بیا دوجی میں سرے سے کوئی استاد تھا ہی نہیں۔ یہ بھی ۱۰۰ کے طلباء میں سے ذہین نطین صاحب ہم خود تیار کر تے اور اپنے ساتھیوں کو بیا دوجی پڑھاتے تھے۔ عزیز مہذا کٹر حمید احمد خان اللہ بخشے، تاتیر طر اور جی تھے کہ اپنی کلاس کو پڑھا تا بھی تھا اور اپنی پوزیشن بھی رقرار کرتے

تھا۔ پھر ان کے بعد جنس بی بی کی پاس ساتھ وہابی لائق پڑھانے تھے۔ کیمسٹری کے استاد اور ریاضی  
 استاد تائب نے خاص طور سے بیرونی پڑھ کر ڈاکٹر کیا۔ یہ بیرونی پڑھائی تھی کہ یہ وقت کے مستحق  
 اور وسعت راستہ ڈاکٹر چوہدری نصیر احمد شیر پنجاب یونیورسٹی میں اس کے دور و کالج میں پڑھانے  
 کے لئے آگئے۔ اس طرح پایا جاتی ڈاکٹر منسٹ کی کمی پوری ہوئی۔ پروفیسر نصیر احمد شیر کی وضع داری کی بات  
 آئی تو یہ بتا دوں کہ وہ ربوہ کے آخری شامل مغربی کونسل پر مبنی ہوئی ایک ڈسٹریکٹ میں کیے رہتے  
 تھے۔ صبح صبح اپنا اکیڈمک گاؤں زیب تن فرماتے، ننھے سے روی ٹیر سے کئی رنجہ پہناتے درجہ اس  
 خراماں کالج کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔ گاؤں سے نئے نئے سوٹ کی حفاظت ہو جاتی اور اس کے  
 کی خاطر خواہ مشی کا تنقید بھی ہو جاتا۔ کالج پہنچتے تو بعض اوقات کتا بھی ہوتا۔ سڑکوں کے کنارے کی طرح  
 کلاس میں یا لیبارٹری میں ان کے بیکھر کے لئے گوشہ برقرار رہتا۔ نصیر احمد شیر صاحب جلد ہی پوائنٹ ڈاکٹر  
 کے لئے امریکہ چلے گئے، ان کے بعد سید صیب الرحمن آئے پھر زوادی میں ایک اور نامہ روزگار استاد  
 محمد شریف خان صاحب آئے اور یہ حیاتیات کے شعبہ کی "کمیڈون" کا تدارک بنو۔ کالج میں انگریزی  
 کے مضمون کی تدریس کے لئے استاد کی ایسی کمی تھی کہ ایک استاد جو بہ ظاہر سیاسیات کے پرائیویٹ ایم  
 تھے۔ سٹاف پر آئے مگر وہ ایف اے کے طلباء کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ خود کسی کالج میں نہیں پڑھے  
 تھے۔ اس لئے ان کا تعلق مشہور مذہبی تھا۔ "Charlotte Bronte" کا نام "چارلوٹ برونٹ" کر کے  
 دیتے تھے۔ ہم مزے دینے کے لئے جان بوجھ کر اس سے یہ نام بار بار پوچھا کرتے تھے۔ پھر ایک سے ایک  
 تا بعد انگریزی کے شعبہ میں آ گیا۔ مرزا خورشید احمد تو انگریزی کے ادبی تھے اور ایس صاحب پولیٹیکل  
 سائنس میں ایم اے ہونے کے باوجود ان سے بھی زیادہ انگریزی کے ادبی ثابت ہوئے۔ ایسی مستقیم  
 زبان بولتے اور خوبی اور خوبصورتی سے بولتے کہ ہم لوگ کتاب دیکھنے کی بجائے ان کا راز  
 مہارک دیکھنے رہتے۔ گویا "ہم میں اہل کتاب چہروں کے"۔ کہنے کو تو ہم نے ان سے انگریزی پڑھی ہے  
 مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ہی ہم نے ان سے نہیں پڑھی۔ بس کتب عم دل میں سبق لینے کا مضمون رہا۔  
 وہ جلد ہی بی بی ایس پی کو پیرا رہے ہو گئے۔ ان دنوں اپنی منگیتر ڈاکٹر کے عشق میں "کنیں سادہ دل جلتا ہو  
 گیا ہے" کی تصویر تھی اور سوز و گداز ان کی باتوں کا جو ہر تھا۔ جو بات کہتے سر بھی دل میں قرار دے جاتی



کی۔ ایسے میں خودی ملتا تھا۔ خود کو دیکھ لیتی تھی۔ ان کے کان سے جیسے جیسے کے حد تک سمجھا۔  
 اسے دانی اس کے دل میں تھی۔ کئے میں دیکھتے رہے تھے۔ اس شخص کے سمجھنے پر۔  
 رحمانی وحیل ہمارا۔

اس سید سلطان محمود شاہ اپنی کیمٹری کی تھی۔ ان کتابوں کی وجہ سے مشہور خلائق تھے ان کا سمجھ تو ہم نے  
 نہیں نہ تھا۔ اسے یونیس کے مسئلہ میں تھیں۔ ہاں یا مرنج اسد میں اللہ ان کی عمر میں برکت  
 دے نہت یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تو ہم نے کہا ایک روایت یہ رہی ہے کہ جولگ باہر پی ایچ  
 ڈی کرے جاتے ہیں وہ یہاں قیام ساتھ لاتے ہیں یا گاڑی۔ آپ خوں ہاتھ کاغذ کا ایک پرزہ کر  
 چھ آئے ہیں۔ فرمانے لگے یہ کاغذ کا پرزہ بھی تو تھی۔ سانی سے نہیں ملتا۔ ان کے سب سے کی صداقت  
 اس وقت آتھا کہ اس وقت جب خود اس مرحلہ سے گزر رہے یا بعد میں ڈاکٹر شریف خان صاحب گذرے۔  
 پروفیسر شریف خان صاحب جوانی ہی میں بین الاقوامی سائنس ریسرچ جرنلز میں چھپنے لگے تھے۔ نہایت  
 کھتی آدی ہیں اور ہر وقت اپنے سانیوں کچھوں مینڈکوں میں گھرے اور چھپکھپوں سے نکلیاں کرتے  
 رہتے ہیں۔ امریکہ کے "ریٹینے والے جانوروں کے حلقہ احباب" میں بہت نامور ہیں۔ ان کے  
 سیمیناروں ریسرچ پیپر زان ریسرچ جرنلز میں چھپ چکے ہیں۔ جب ان کا پی ایچ ڈی کا مہرہ یونیورسٹی  
 میں پیش ہوا تو ان کے محققین وہ لوگ تھے جو ان کے ریسرچ پیپر ز کا حوالہ دیتے نہ تھکتے تھے مگر جب نہیں  
 آگئی اسے نا وقت آیا تو نہیں چپ لگ گئی اور کچھ کی طرح دم سادھ دیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ  
 چھ سات برس ان کی ڈگری جاری نہ کی گئی۔ ان کا بیٹا عزیز محمد ظفر اللہ ان سے پہلے پی ایچ ڈی ہو گیا  
 باپ کی ڈگری بیٹے کے ڈاکٹر بن جانے کے بعد جاری ہوئی۔ اللہ کہ یونیورسٹی وائس کوئٹس آگیا ورنہ  
 ان کے پوتے کے پی ایچ ڈی ہو جانے پر جاری کرتے تو ان کا کیا باگاڑا جاسکتا تھا۔ عزیز محمد ظفر اللہ سے ہم  
 نے اس کا امریکہ کا پتہ پوچھا تو کہنے لگا پتہ یہ ہے میرا نام "زی" سے ظفر اللہ کہیں گے۔ ہم نے کہا بیٹے ہم  
 وضعد لوگ ہیں۔ تمہارا نام نہ سے لکھتے آئے ہیں اس سے لکھیں گے زی سے تو ہم لکھنے سے رہے زیادہ  
 سے زیادہ اتنی رعایت کر دیں گے کہ ڈیٹ سے لکھ دیں اس سے زیادہ کی ہم سے توقع نہ رکھو۔

ہمارے دوست نصیر احمد خان نے رولیت زمانہ برقرار رکھی اور ہم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری اور

نئی سے ایک نئی فوس انکس ساتھ اے اور نہ ہمارے مراد 'سیورڈ' کا سب کی طرح انہیں بھی سرن  
کاڑی پر کھڑا کرتا۔ سب کاغ کے شاف پر ہم رہتے ہیں۔ یہی سب کاغ کے ساتھ ہوئے اور یہ 'مستند' ت  
کے تھے۔ کس پاس کے چھوٹے شہروں کے کی کاغ کے سے بڑے ہوتے تھے۔

کاغ کے بزرگ اساتذہ کا بڑا ہی دبدبہ تھا۔ پروفیسر اخوند عبدالحق در انگریزی کے نامی اساتذہ میں سے  
تھے۔ پروفیسر میاں مٹھا، جس کی محی و جاہت کے آگے بڑے بڑے طبایات و فوٹو گرافر سب ہوتا  
تھا۔ پروفیسر بشارت رحمن کی عربی و ہندی اور پروفیسر جوہری محمد علی کی مسند انی کے آگے کوئی دہ نہیں داتا  
تھا۔ کاغ کے اساتذہ حسن نصیر و سرور دریس اور طلبہ میں سے رضاطی کی ایس بی میں چنے گئے اور بڑی  
نیک نامی پائی۔ طلبہ میں سے اکثر سیر سیر سروں میں آئے تھے۔ ان کا دانش و تکیہ شن زید نے پولیس  
سروس اور فائن سروس میں تو ہمارے شامز بھی پہنچے و سیر کے مرتبہ تک ترقی پائی۔ کاغ کے طلبہ میں سے  
کئی عدلیہ میں سیشن جج کے مرتبہ تک پہنچے اور ہمارے ایک کا اس فیلو۔ محمد مسلم بھی تو ہائی کورٹ کا جج ہو کر  
رہے۔ ہمارے ملک میں اقدار و تفریق کا دورہ و رہ نہ سوتا تو کئی ایسے تھے جو ہائی کورٹ کیا سپریم کورٹ  
تک پہنچتے۔ بھی چھپے فوٹو کاغ کے زمانے کے ایک پرانے دوست میر سز بشر طیف یہاں کی نڈا آئے  
موتے تھے اس وقت لاہور ہائی کورٹ میں ان کے شامزوں کی معتد بہ تعداد تھی کے مناصب پر مرفراز  
ہے۔ غرض اس کاغ کا دائرہ و فیضان قومی اور بین الاقوامی حلقوں تک مستند ہے۔ پولیس میں تو ہمارا ایک  
شامز حابر و داف، شاء اللہ آئی جی کے مرتبہ تک پہنچے ہے۔ اے۔ الحمد للہ۔ اور فوج میں ہمارے شامز  
بریلڈیر کے رینک میں ہیں۔ ہم زافرو۔

کاغ کا وہ مرتبہ تھا کہ بڑے بڑے ماساتذہ 'فرانچ' ادیب اور شاعر اس کاغ کی دعوت پر کچھ چھ  
آتے تھے اور یہاں آنا اپنے لئے باعث فخر و درانتے تھے۔ اس کاغ کی یہ روایت رہی کہ کانوٹیشن کے  
نئے پیشہ می اور دینی شخصیتوں کو مدعو کرنا تھا۔ پہلی کانوٹیشن جو ربوہ میں ہوئی اس میں میاں افضل حسین  
'اُس چا ستر' جناب یو سوری شریف آئے۔ ان کے ہاتھ میں انگریزی میں لکھا ہوا خطبہ تھا جب پرنسپل  
صاحب نے کاغ کی روایت کے مطابق اردو میں خطبہ استقبالیہ پڑھا تو میں صاحب نے انگریزی میں  
پہلے ہی خطبہ سامنے رکھ دیا مگر خطاب اردو میں فرمایا۔ سننے والوں کو ذرا احساس نہیں ہوا کہ وہ اس چا ستر کا

دہلی، امریکی شہر۔ جب جدو جہد لوگوں میں امریکی میں تقسیم ہوا تو اس حیرت سے کہنے لگے کہ  
 آئی صدی میں حصہ لگے گی میں نہ اس لیے کہ اس سے یہاں نفس نہیں کی وحدہ کی تھی۔ آخر میں  
 افضل حسین صاحب نے ایک نامور علمی سیاسی اور شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ میں افضل  
 حسین ایک بار پھر فرانس کی پوسٹ سرکوائرٹ میں رہ کر شریف کے لئے جی تشریف لے گئے اور کالج کی  
 قدم بہ قدم ترقی و اپنی آنکھوں سے دیکھ کر فرمایا اور خوشنوا کی کاغذ رسیا۔ سورہی کورٹ کے دو چیف جسٹس  
 کالج میں تھے۔ جسٹس بیانی اور جسٹس منظور قادر۔ ججوں میں سے جسٹس شیخ شیر احمد جسٹس سجاد احمد جان  
 اور جسٹس انوار الحق تشریف لائے۔ اس کے چار سالوں میں تھے۔ میں افضل حسین کے ساتھ وہ  
 پروفیسر حمید احمد خاں ڈائریکٹر استحقاق حسین قریشی، اسٹریڈاے ہاشمی۔ حکام میں سے وزیر اسرار تو آتے ہی  
 رہے ضلعی اور ڈویژن کی سطح کے حکام جو آج کل رہو سے کئی تھرتاتے ہیں ایک دن سے اشارے پر کالج  
 میں آنے کو تیار رہتے تھے اور اس بات کو اپنے لئے فخر قرار دیتے تھے کہ ہم نے عظیم الاسلام کالج میں طلباء  
 کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔ یہ اتنی کی دہائی کی بات ہے کہ ایک اسسٹنٹ کمشنر سے ہم نے کہا کہ  
 ہمارے ہاں آؤ۔ کہنے لگا آؤں تو سر کے بل مگر لوگ الٹا نکادیں گے۔ (ہم نے دل میں سوچا سر کے بل  
 نہ والے کو لوگ اسٹانڈنگ نہیں لے تھے "سیدھا" سو جانے گا)۔ میں نے کہا تمہارا جو کمشنر ہے وہ غریب  
 خاندان پر قدرتی رنج پر مایہ کا ہے اس کا سر تو سلامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ذرا سے حکام رہو نہ آنے سے  
 جھجکتے تھے تو اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ اب رہو اور باہر کی دنیا کے درمیان جو پل کالج کی صورت  
 میں بنا تھا وہ منہدم ہو گیا تھا اور کالج کو قومیاں کا یہی ازیں نتیجہ ہوتا تھا۔ باہر کی دنیا میں کالج اور سکول  
 قومیاں کے لئے تو سہ اور طلباء کے مابین مفاہمت کا جو پل تھا وہ ٹوٹ گیا۔ ایک شخص کی اپنا پرستی نے  
 ساری قوم کو کس طرح فرائض کی دلدل میں ڈھکیل دیا بعض اوقات ایک عاقبت نااندیش حکم کا ایک  
 فیصلہ کس طرح قوموں کو صمدیوں پیچھے لے جاتا ہے۔

عظیم کے میدان میں بھی ہمارے ادارہ کا امتیاز قائم رہا۔ جس سال کالج رہو نہ آیا ہے اسی سال منور سید  
 نے ایف اے کے امتحان میں اوس پوزیشن حاصل کی تھی، اس سال جدو جہد احمد خان نے پھر یہ کام کر دکھایا  
 حالانکہ اسے تو بیالوجی پڑھانے کو کوئی استاد بھی میسر نہیں تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج میں

ہمارے طلبہ کی قہر و عیثیٰ معتد پر ہی۔ ہم نے کانچ کی تہ سہمی اور مٹی کی بات و اجاڑ سوتے ایسے  
 سے۔ فرس کانچ کا ہوا بھی تو سہر و جل ہی تھا۔ بے یث نہیں کیا ہوگا سہر میں تو رہائیں۔ ہمارے کان کے  
 قومیے جے کے بعد ۹۵ء میں سی کان سے جاپان کی واکا یونیورسٹی میں ڈیپوٹیشن پر گئے تھے  
 واپس تو ان لوگوں سے آئے نہیں دیا اور ہمارے وزیر شہر "کی" "سرتوڑ" کوشٹوں کے ہوج نہیں  
 آئے۔ (سرتوڑیوں کے جس وزیر شہر نے ہمارے بارو میں حکم جاری فرمایا تھا کہ نہیں رہو کان میں  
 قیامت کر دیا جائے سے اوپر سے جھڑپڑی۔ مجھ سے کہنے گئے "سراپ آپ اپنی بات پر اصرار نہ کیجئے گا  
 مجھے تو ایسی جھڑپڑی ہے۔" "سرتوڑ" گیا ہے) مگر بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ پروفیسر فیض خان  
 صاحب کہنے گئے کہ ہمیں اس زمانے کے کانچ کے پرنسپل صاحب سے از روفاق عاقت ضرور کرنی  
 چاہئے۔ ہم گئے۔ دیکھا کہ پرنسپل کی کرسی پر (یعنی اس کرسی پر جس پر حضرت مرزا ناصر محمد قاضی محمد اسلم  
 چوہدری محمد علی) جیسے پرنسپل بیٹھ چکے تھے ایک صاحب شریف فرماتیں یوں کہ انگلیں میز پر رکھی ہیں اور  
 اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر فرمایا اچھا تو آپ ہیں پروازی صاحب؟ ہم نے اپنے جرم کا اعتراف  
 کیا تو فرمانے لگے مگر آپ کی تو اس کانچ میں کوئی جگہ نہیں۔ ہم نے کہا ہم اسی کانچ سے گئے تھے اس سے  
 اسلوا اسی کانچ کے پرنسپل سے سلام و دستائی کے لئے آئے ہیں۔ کہنے لگے "وہ کیا ہوتا ہے؟" ہم نے کہا "ہم  
 بس ہوتا ہے"۔ قبلہ پرنسپل صاحب نے یہ تک نہیں فرمایا کہ بیٹھ جائیے۔ ہم اس کرسی کی اتنی رسوائی نہ دیکھ  
 پائے اور سہام کر کے باہر آ گئے باقی جو کچھ آپ نے کہا سنا وہ بے معنی باتیں تھیں اس لئے ہم نے کھنا بھی  
 نہ سب نہیں سمجھیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہم سرگودھا بورڈ کے سکریٹری سے ملنے کے لئے گئے۔ چٹ اندر  
 بھجوائی تو سکریٹری صاحب ایک کر خود دروازہ تک ہمارے استقبال کو آئے بڑی محبت سے اپنے پیچھے سے  
 ہوئے دوست کو اندر لے کر گئے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہی پرنسپل صاحب بیٹھے تھے بہت حیران ہوئے  
 کہ میں نے تو اس شخص کو بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا یہ سکریٹری صاحب اس شخص سے اتنی عاقت سے کیوں پیش  
 آرہے ہیں؟ سکریٹری صاحب نے جب اپنے مددگار کارکن کو ہمارے لئے اہتمام اور سلیقہ سے چائے  
 ائے تو کہا تو نہ رو سکے سکریٹری صاحب سے کہہ دی بیٹھے کہ جناب میں کب سے یہاں بیٹھا ہوں آپ نے  
 مجھے تو پانی تک نہ پوچھا ان کے سنے چائے اور بڑی مفصل چائے لائے کا رڈر آپ نے دیا ہے اس کی

جاوید سے سرکاری صاحب دوسرا پرانے دوست تھے نہیں تو آپ نے کئی کئی بار پرنسپل صاحب سے ملاقات کی۔ یہ ملاقاتیں ان کے مسکن میں ان کے صاحب میرے پرانے دوست کی دوستی میں معمولی رو بہ بھی چلیں تو کبھی کانٹوں کو تو تکلیف نہیں دیتے۔ ان کے صریح جملے میں جہاں ہمیں وقت بے وقت کھانا بھی میسر آ جاتا ہے اور چائے بھی مل جاتی ہے۔ اب وہ چار سال کے بعد میرے پاس مجھے ملنے کو آئے میں تو شریک کی اتنی بھی خاطر داری نہ کروں۔

پرنسپل صاحب نے نہایت چھچھوری بات کی تھی مگر نری صاحب نے منقض ہونے کے باوجود ان کی بات نہ لی۔ مگر پرنسپل صاحب کا اندرونی بغض جہاں چھپتا۔ دراصل دیر کے بعد میرے ہی صاحب ہوئے اور کہا "ڈاکٹر صاحب مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ روم میں میرے خلاف باتیں کرتے پھرتے ہیں۔ ہم نے کہا 'جناب دل میرا کیا مرتبہ ہے کہ میں آپ کے خلاف باتیں کروں؟ میں آپ کا ماتحت نہیں آپ کا رفیق کار نہیں' حتیٰ کہ آپ کو جانتا تک نہیں۔ ایک بار کالج کے دفتر میں آپ سے ملنے کو گیا تھا تو آپ نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا اس لئے میں آپ کے خلاف کیا باتیں کروں گا؟" فرمایا "مجھے مستر لوگوں نے بتایا کہ آپ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ میں نے کالج کا سٹینڈانٹس کر دیا ہے" ہم نے پورے سے منہ سے جواب دیا "مگر حضور والا یہ بات آپ کے خلاف کیسے ہوئی؟" کرو میں جتنے ٹوٹ موجود تھے وہ سب بننے لگے اور پرنسپل صاحب ہنسا منہ لے کر رو گئے۔ تو جناب اگر اداروں کو ایسے ہی نااہل لوگوں کے سپرد کر دیا

جائے تو یہی ہوتا ہے۔ محکمہ تعلیم نے جن جن سر پر ایسے پرنسپل اس کالج میں بھیجے کہ اس کالج کی روایات کو ملیا میٹ کر دیں کہ الامان والحفظ۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے ہمارے مسٹر ٹرڈ کے زمانہ کار رفیق کار اور دوست ایم اے مسعود جو بھری ایم اے کالج کا پرنسپل بن کر آیا تو کالج والوں کو کچھ امان ملی۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ڈاکٹر مظفر جاس بھی آئے۔ اب سنا ہے ہمارے شاگردوں کی نسل کا ایک طالب علم عزیزم مقبول احمد پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہے چھیوٹ کا شریف بچہ ہے اور تعلیم اسلام کالج کے زینہ سے دوڑ گیا ہے مگر اس کے لئے جائے ماند نہ پائے رفیق کا معاملہ ہے کس کو خوش رکھے۔ مولویوں کو؟ مگر یہ تو قحط ہونے سے رہی۔ ایک بار ہم کسی کام سے چھیوٹ کے اسٹنٹ کمشنر سے ملنے کو گئے۔ غالباً جاوید محمود ان کا نام تھا۔ ہم گئے تو اس وقت وہ عدالت کی کرسی پر متمکن تھے ان کی ہدایت میں کم و بیش دس بارہ وکلاء پیش

تھے ہم اہل حق تو سب کے سب ہماری جانب بڑی محبت سے متوجہ ہوئے اسسٹنٹ مسٹر صاحب مددست و محبت کر کے اپنے جیسے میں چلے گئے اور میں باریان کا طرف غنہ کر کے گئے یہ چیونٹ تو آپ کا مخالف تھے مگر یہاں کے الکات آپ کے بڑے مددگار تھے ہیں ہم نے نہیں بتایا کہ جتنے دکا تھے وہ اتفاق سے سب کے سب ہمارے شہر تھے اس لئے انہوں نے سدا کی جانب محبت آمیز گفتات دکھایا تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ کہنے لگے آپ کے شہر میں یعنی ریلوے کالج میں پڑھے ہوئے ہیں؟ ہم نے انہیں بتایا کہ چیونٹ شہر کے شرفا اپنے بچوں کو ریلوے کالج میں پڑھنے کے لئے بھیجتے تھے اب بھی بھیجتے ہیں اگرچہ اب وہ ”مودی مدن کی بات نہیں“۔ چیونٹ میں جو بھی پڑھا لکھا ”دی نگر“ آئے گا وہ ریلوے کالج کا پڑھا ہو گا ہمارا کالج شرفا کا کالج تھا اور چیونٹ شہر میں صرف مودی ہی نہیں رہتے شریف لوگ بھی رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم کی علی الامان پالیسی یہ رہی کہ اس کالج میں کسی احمدی کو نہیں لگایا جائے گا۔ جو رہنما ہو جائیں گے ان کی جگہ غیردوں سے پرک جائے گی جو باہر جائے گا وہ وہاں ہی ایجنسی کے لئے یا ہو پڑھانے کے لئے وہاں پر اسے اس کالج میں تعینات نہیں کیا جائے گا۔ مرزا انیس احمد جب ایم فل کر کے آکسفورڈ سے واپس آئے تو اس کالج میں نہیں آئے۔ نہیں حضرت صاحب نے جامعہ میں لگا دیا۔ جب یہ تعصب باپسی کا حصہ بن جائے تو اداروں کو بگڑتے کیا اہل سنتی ہے؟ پھر ایسے تعصب اساتذہ خاص طور سے دور دور سے تبادہ کر کے اس کالج میں لائے جائیں جو اس کالج کی روایات کو مٹانے کے درپے ہوں۔ طلبہ کی دل آزاری کریں زواتیوں کا مضحکہ اڑائیں۔ آفرین ہے اپنے بچوں پر بھی کہ یہ سب کچھ گلزار کر یا مگر کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ تعلیم اسلام کالج میں ہڑتال ہوئی ہے۔ یہ اس کالج کی روایت تھی کہ سارے کالج ہڑتالیوں نے بند کر دائے ہوتے تھے مگر تعلیم اسلام کالج میں تعلیم و جمعہ کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ ایک بار میاں عطاء الرحمن صاحب کی قائم مقامی کے زمانہ کی بات ہے فوج ازمی کی چیونٹ کالج میں ہڑتال ہو گئی ہے اور لوگ ریلوے کی جانب بسوں میں بڑھ رہے ہیں کہ اس کالج کو بھی بند کر دائیں۔ ہمارا بیڑہ ہمیشہ سے پہلے ہیڈ ہوتا تھا اور کلاس گیا ہوتی تھی ایک انبوڈ منیجر ہوتا تھا کیونکہ ازمی اردو پڑھانے والا ہمارے ملکہ اور کوئی استاد تھا ہی نہیں۔ میاں عطاء الرحمن صاحب نے اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ اب نہ ہو چیونٹ

وہ فحاشی کی جگہیں اور لوگوں کا گوارا صورت پیدا ہو جائے آپ یہاں پہنچ کر رہیں۔ ہم نے اپنا پتلا  
 یہ پتلا رہا دیا ہے میں سینکڑوں سال کی کڑوس سے فاسک سو کر اپنے تئیں بڑے سے پہنچے ہم نے  
 انہیں بھی اندر لایا اور ہاں کچھ بھیج کر یہاں رہنے شادی کے کسی "لذیذ" موضوع پر پہنچ کر دینا شروع کر دیا  
 اس روز کچھ زیادہ ہی زور بیان بندھیاں نے (دیا بچوں کو پتہ تک نہیں چلا کہ ایک دن انہیں تیس یہ پتلا نذر  
 گئے ہیں اور ابھی ہمارے موضوعات تین تین سے، رہنے کی جگہ ہے کہ ہم اس موضوع پر بولتے چلے جائیں  
 جب شادی نے "کر میس جھڑکا کہ" بس کر دئی باقی اسراف روم میں بیٹھے آپ کو کوس رہے ہیں "تو  
 ہم نے کلاس چھوڑی۔ بات رفت زشت ہوئی نہ بچوں کو پتہ چلا کہ ہماری اس "طوں کلامی" کی کم کیا تھی  
 نہ ہڑتالیوں کو کالج میں آ کر ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ ہمارے کالج کی روایتیں تھیں۔  
 ایک سترہویں صدی کا حوصلہ ہوتا تھا کہ دوپانچ سوڑ کوں کو اپنے لہجہ میں رو کر رکھے وہ روتا تھا بچے رکتے تھے  
 اور اب کسی ایک طالب علم کو روک کر تو دیکھئے؟

بات ہم نے کالج میں پہلے دن سے شروع کی تھی مگر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کالج میں کچھ دن تو فوننگ کی  
 وہ بھی رہی اس کے بعد زندگی ایک ڈگر پر چھنے لگی یعنی کلاس میں "مباحثے" مشاعرے "تقریرات" پہلی  
 کانوٹیشن کا ذکر تو ہو چکا یونین کے پہلے مباحثوں کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے انعقاد کے لئے  
 کالج میں باں تو تھا کوئی نہیں اس لئے مجھ سے ہاں مستعد رہا گیا تھا۔ انٹر کالجیٹ مباحثوں کا نام تو بہت سنا  
 تھا دیکھے یا سنے نہ تھے پر وہ والوں کے لئے ویسے بھی یہ نام جو بہ تھا خیر مباحثے ہوئے ہاں کچھ کچھ بھرا ہاں مگر  
 اصل روتق تو شام کے ذکر کی تھی۔ پروفیسر خیر خان صاحب نے کالج کی حیثیت پر ایب الف لیوی انتھارکر  
 رکھا تھا کہ ہایدو شاید روشنی کے لئے یوں تو ان کا رخ زیبای کافی ہوتا مگر فرش پر دسترخوان بچھائے گئے  
 اور تھار رو تھار چراغ رکھے گئے۔ یوں بھی منڈیروں پر چراغاں کا سا تھا۔ ہمیں یہ دے باہر کے کالجوں  
 کے جو مقرر اس میں شریک ہوئے وہ مدتوں اس الف لیوی ڈر کو یاد کرتے رہے۔ پھر پرنسپل صاحب یہ  
 مہربانی فرماتے تھے کہ صبح کا ناشتہ مہمان مقررین کے ساتھ کرتے تھے اور ناشتہ بھی بالیر کوئلہ کا نوابی ناشتہ  
 ہوتا تھا۔ مایر کوئلہ کے نوابی ناشتہ سے یہ دیا کہ ۱۹۶۶ میں پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب  
 یونیورسٹی جوہر آباد سے واپسی پر روہر کے اور حضرت خلیفۃ المسیح اشاعت سے ملاقات کا شرف حاصل یا

حضرت صاحب نے زراعت پروردی مجھے، اور چوبداری محمد علی صاحب کو بھی ان سے سنا تھا اور یہ کہ  
 اُنھ نے یہ مدعو کر دیا۔ وہاں ماہر و مہندہ اور اُن کے حامی شاہی کُڑے بیٹھے، انور پر موجود تھے۔ ہم اُن  
 ہونٹ چائے پئے رو گئے۔ حمید احمد خان صاحب حضرت صاحب کے بے تکلف دوست تھے کہنے لگے "مرزا  
 صاحب سنا تھا مغلوں کے دسترخون پر جنت کی نعمتیں موجود ہوتی تھیں آج دیکھ بھی رہا"۔ حضرت صاحب  
 نے فرمایا لیکن یہ شاہی کُڑے میری بیوی نے مالیر کوئٹہ کے نسخہ سے تیار کروائے ہیں۔ ہاں یہ گاجر کا جوم بہ  
 آپ نے کھا یا ہے یہ مغلی نسخہ ہے اس میں بیٹھا خالص شد کی مٹھاس کا ہے۔ حضرت آپ منصور دہلیگہ کے  
 ہاں کے شاہی کُڑے تو ہم سے پہلے بھی کھائے تھے لیکن اس روز کا مزاجی اچھا اور تھا شاید اس لئے کہ پہلے دو  
 پرنسپل کی بیگم کے طور پر تیار کردہ تھیں اب ان میں خلافت کے مرتبہ کا متحرک بھی شامل تھا۔ یہ لکھتے لکھتے  
 خیاب آ رہا ہے کہ ہمارا کالج بھی کیسا باہر کت ادارہ تھا کہ اس کا ایک پرنسپل منصب خلافت پر فائز ہو کر  
 ایک طب علم منصب خلافت پر سرفراز ہے۔ ایک ادارہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا فخر و شرف و  
 مسابقت کی بات ہو سکتی ہے۔ وذلک فضل اللہ یوقنہ من یشاء۔

ہمارے کالج کا تشخص ایک خاص علمی ادارہ کا تھا۔ اس میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ طلباء کو  
 محض امتحانوں کے لئے تیار نہ کیا جائے بلکہ ان کے ذہنوں میں وسعت پیدا کرنے کے لئے  
 زائد از نصب سرگرمیوں جاری رکھی جائیں چنانچہ اس مقصد کے لئے یونین اور مجلس ارشاد کے علاوہ جو  
 کانٹیریجس تھیں ہر مضمون کے طلباء کی علیحدہ و بزمیں موجود تھیں۔ بزم اردو اگرچہ اردو پڑھنے والوں کی  
 بزم تھی مگر اس کا دائرہ بھی سارے کالج تک ممتد ہو گیا تھا اور اس کے عہدیداروں میں ایسے طلباء بھی شامل  
 ہوتے تھے جو اردو کے طب علم نہیں تھے۔ اردو قومی زبان ہونے کے علاوہ احمدیوں کے لئے مذہبی اہمیت  
 بھی رکھتی تھی ایسے ۱۹۶۳ کی پہلی اردو کانفرنس کے موقع پر پرنسپل صاحب نے اس کانفرنس کو یہ نعرہ دیا تھا  
 کہ "اردو ہماری قومی زبان ہی نہیں مذہبی زبان بھی ہے" اور یہ سوگن اردو کانفرنس کے پین پرور ہر چہ  
 ہوئے پر اثر مہم پر موجود تھا۔ ۱۹۶۷ کی دوسری کانفرنس کے وقت تو اس کانفرنس نے ملک گیر شہرت حاصل  
 کر لی اور اس میں سارے پاکستان سے کوئی دوسو سے زائد مندوین شامل ہوئے۔ پاکستان ریلوے نے  
 مندوین کے لئے کرایہ میں خاص رعایت کا اعلان کیا۔ کراچی سے جی جوقا لڈ یا اس میں کراچی یونیورسٹی



میں نے یہ سب کچھ یاد رکھا کہ میرا وارڈو جیسے پریسنگ اور کھنکھاتی روایات کے مہدیہ رشمال تھے۔  
 میرا سب سے بڑا پیار تھا کہ انہوں نے ان کی تھیں۔ ان سے پانچ سو روپے ان کے پیسے تھے۔  
 میں نے ان کے تیار کردہ دست و حضرت امام جماعت محمدیہ کا پیسہ ہے تو انہیں چپ مکئی کی  
 میں جہد کی قدرت بعد شہاب سے ملاقات ہوئی جو صدر کے سرگرمی تھے۔ ان کے آج کی ایک اپنی  
 "نہیم" کے جہد میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میرا تعارف ہو تو چوٹے کپڑے آپ اردو کی  
 بہت خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے کہا نہیں میں نہیں میرا وارڈو اس ٹیک کام پر مستعد ہے مگر صدر مملکت تو  
 پیغام بھیجنا وارڈو نہیں کرتے۔ کہنے لگے "رہا ہی عقل سے کام لیتے تو پیغام آ جاتا۔"

میں نے کہا وہ کون سی عقل کی بات ہے۔ کہنے لگے آپ سے کس نے کہا تھا کہ امام جماعت محمدیہ کے پیغام  
 کا ضرور ذکر کریں بس اسی بات نے کام فرما کر دیا۔ ہم نے کہا جناب والا اگر یہی بات ہے تو میں  
 تمہاری بات کہ درمیان میں کہتم۔ اور حافظ کا شعر بھی پڑھ دیا: "قتلِ رند نہ دل در بند زلفش چون خوش  
 است۔" ملاحظہ فرمائیے "ہمارے لئے یہی بے عقلی ہے۔ بعد کو جب شہاب  
 صاحب کی شہاب نامہ پڑھی تو معلوم ہو گیا کہ پیغام کی ساری ساری میں شہاب صاحب کی اپنی متعصب  
 ذاتیت کا فرما تھی۔ ہمیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

نصیر صاحب یونین کے انچارج تھے تو وہ اس بات کا اصرار کرتے رہتے تھے کہ مباحثوں میں جج صاحبان  
 میں ہوں جو ہمیں در دلی لحاظ سے نہیں ہوں مثلاً اس وقت میرے سامنے احسان دانش کی خود نوشت  
 جہان دانش کا دوسرا حصہ پڑا ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ رنوہ کاٹ کے مباحث میں وہ اور پروفیسر وقار  
 عظیم جج کے طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے وہاں ان کی ملاقات تیسرے جج ڈاکٹر عابد احمد علی  
 صاحب سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عابد احمد علی گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل تھے وہاں سے پرنسپل صاحب  
 کے آکسفورڈ کے زمانہ کے ہم عصر تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے گورنمنٹ کالج سرگودھا اور تعلیم الاسلام کالج  
 ربوہ میں ایک خاص رشتہ و مودت قائم ہو گیا تھا۔ ہمیں یاد ہے ایک بار اس کالج کی باکی ٹیم ربوہ چھٹی تھیں  
 کے لئے آئی۔ دفتر امور عامہ کے پاس جو گراؤٹ ہے اس میں جج ہوا۔ ہمارے پرنسپل صاحب نے خاص  
 طور سے یہ اہتمام رکھا کہ اس کالج کی ٹیم کے ساتھ نہایت مہربانہ سلوک روا رکھا جائے۔ اس جج میں ڈاکٹر



نے بھی کام نہ کیا تیرہ خیر و خیر نہیں تھے بخش تھیں۔ تھیں کے تھیں تھیں سے وہ تھیں۔ اس کے بعد صاحب حضرت صاحب سے تھیں۔ صاحب آپ بھی دیکھ میں۔ حضرت صاحب نے کہا میں کوئی شرع و اعتدالوں نہیں ہاں تبلیغ کے لئے بھی شعر بہ لیتوں۔ ساک صاحب نے سچ ہی میں بات پڑی۔ اس۔ اس۔ حضور ہم قین غیر احمدی آپ کے پاس حاضر میں ہمیں تبلیغ کریں۔ چنانچہ حضرت صاحب سے پناہ ملا فرمایا۔

اگلے روز ہم سے برآمد میں ملک صاحب سے اردو کے نکاحی اب پڑھ کر دیاں۔ تقریر کے بعد میں نے سوال کر دیا کہ آپ کے نکاحیوں کی بڑی شہرت ہے کوئی نکاحیہ سن میں۔ فرمایا نے لگے نکاحیہ کوئی شعرو ہوتا نہیں کہ یوں سنایا جائے در ہر نکاحیہ کا ایک پس منظر ہوتا ہے دو سانس نہ سو تو نکاحیہ میں معنویت پیدا نہیں ہوتی۔ منس کے طور پر آپ نے کہا کہ ۱۹۴۰ میں لاہور ریزویشن جسے قرارداد پاکستان کہتے ہیں مسم لیک کے اجلاس میں منظور کیا گیا۔ اس موقع پر کانگریس والوں نے راوی کے کنارے ایک اجلاس کر کے اکھنڈ بھارت کی قرارداد منظور کی۔ کہنے لگے اس اکھنڈ بھارت کی قرارداد کی منظوری کے بعد میں نے نکاحیہ لکھا کہ کانگریس والوں نے راوی کے کنارے اکھنڈ بھارت کی قرارداد منظور کی ہے وہ ”دروغ برگردنا راوی“ ہے۔ سب لوگ اس بے ساختگی پر عش عش کراٹھے اور کیمسٹری تھیٹریٹرواد و تحسین کے نعروں سے گونجنے لگا۔

شیر محمد اختر کی ایک بات مجھے نہیں جھوٹی۔ کسی مباحثہ میں پنج کے طور پر آئے ہوئے تھے مجھے سنبھلے۔ پیر مجھے کسی دن میاں طاری سے ملو ڈال۔ میں نے کہا آپ انہیں جانتے ہیں؟ کہنے لگے ہاں ہمارے باپ دادا ان کے دادا سے بیعت تھے اور میری امی میاں طاری کی تو بچپن سے عاشق تھیں بہا کرتی تھیں کہ اس رُکے نے ایک دن خلیفہ بن جانا ہے۔ میں زندہ رہی تو اس کی بیعت کر لوں گی۔ اب وہ تو اس دنیا میں رہیں نہیں جی چاہتا ہے میں اس کی طرف سے انہیں دیکھ لوں۔ چنانچہ میں انہیں میاں صاحب کے پاس لے گیا اور بتایا کہ اپنی امی کی طرف سے آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ اگلی بات کہنے کا محل تھا نہ موقع مگر سرحودہ کی بات کیسی صحیح نکلی۔ شیر محمد اختر کے باپ دادا احمدی تھے مگر انہیں چھ عرصہ تک جماعت لاہور سے تعلق رہا پھر وہ بھی نہ رہا۔ جماعت کے بارہ میں تھیں بھی ان کے اندر نہیں تھا ورنہ جو

جہالت سے دور بھی گئے ہیں وہ بادشاہ سے ریہ دو بار شہ کے دفن رہنے کی نیت سے انجمن کی خدمت بھی بہت اترتے ہیں۔ تروپن باتوں سے اور بھگتے ہیں۔ شٹاپنی شہ محمد اختر تھے اردو نرسر بیدلی کامرن تھے۔ عارف عہد تھیں تھے۔ یہ وہ پنے آباد جہالتی احمدیت کا بڑا اعتراف کرتے تھے مگر احمدیت یا بانی و سلسلہ کے خلاف ان کی زبان شوخی نہیں دکھاتی تھی۔ مگر جو شوخ صبح وہ احمدیت سے بھی گیس کا بوم دہی ہوتا ہے جس کا ذکر میں کرنے لگا ہوں۔ ریڈ اے سٹریٹ جہانے پیچھے نے صوفی تھے مگر ابھی کل ہی ایک دوست نے ان کی خود نوشت "Boys will be Boys" پر اس کی جینی کا تبصرہ ای میل سے بھیجا ہے کہ میرا بپ شراب پیتا تھا۔ سو رکھا تھا مگر اس "جنونی جرنل زووجن" یعنی نیاہ بحق کا بڑا مداح اور سلام کا "شیدائی" تھا۔ یہ گواہی کسی دہر کے فرد کی نہیں اس کی اپنی جینی کی ہے جو ایک عیسائی سے عیسائی ہوئی ہے۔ اس شخص نے احمدیت کی مخالفت میں غیر دس سے بڑھ کر زور قلم رکھا یا اور ہمیشہ منہ کی کھائی۔ دلت درسوئی نے مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ فاعقبروا یا اولی الابصار۔

یادو کی کی ایک مصیبت یہ ہوتی ہے کہ کھتے لکھتے باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں اور ذہن کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ ویس لوٹ کر اپنی طالع علی کی طرف آرہے ہیں۔ ایف اے ایف ایس سی کے امتحان میں ہر سال ساتھ سائنس کے بڑے بڑے ناچنے تھے وہ تو اپنی ایف ایس سی میں اچھے نمبر لے کر انجینئرنگ یا میڈیکل میں چلے گئے ہمارے حریف ناچنے جو آئس کے امتحان میں شریک تھے پیچھے رہ گئے اور ہم ایف اے کے امتحان میں اپنے کانٹ میں اوس رہے اور وحیفہ پایا۔ اب باطل میں رہنے کا موقع ملے۔ کیونکہ نمبر ایک ہمارے کمرہ تھا اس زمانہ میں باطل کی کھڑکیوں کی جالیوں پر بزرنگ کیا گیا تھا کہ دھوپ کی تمازت کم رہے۔ ایک روز ہم لوگ نیاز مرحوم کے کمرہ میں بیٹھے حسب معمول سنڈی کے وقت میں گپ مار رہے تھے (یا شاید باتیں کہیں کر پتے سمیت کر بیٹھے تھے) کہ یوں محسوس ہوا کوئی صاحب دہر سے چلی پر آنکھیں نکائے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم تو دیکھ نہیں سکتے تھے کون صاحب ہیں اور کس مقصد سے جھانکا تا کی کر رہے ہیں۔ نیاز نے اپنی جالیوں کی زبان میں کہا "اے بھی کون ہو نقیس کیوں ہار رہے ہو"۔ باہر سے آواز آئی "مرزا ناصر احمد"۔ اب ہمارا تو وہ حال ہوا کہ کاٹھ تو سب نہیں بدن میں۔ مگر

پریس کے حوصلہ مند پرنسپل تھے۔ مزید یہ تھا کہ سنے خیر، نیس چسے کے۔ اور کانج میں اس کا بندہ پرچہ نہ لے گا کہ انٹیل صاحب نے اس کو وہیں آتے دیکھ کر بھڑکے تھے۔

خدا کے ہر قہر پر میں پہنچے تو یونین کا ایکشن بڑے کا خیال آیا۔ کیونکہ سکریٹری قہر پر میں سے اور نائب صدر فورتھ ایر میں سے چننا تھا۔ صدر پرنسپل صاحب خود ہوتے تھے۔ خدا کا کرنا یہ تھا کہ یونین کے کسی احساں میں ایچ رن یونین نے کہ ہمارے پروفیسر نصیر احمد خان ہوتے تھے کسی بات پر ناراض ہو کر یونین کے کسی عہدیدار کو رطرف کر دیا۔ ہم اس زمانہ میں نوائے وقت اخبار کے نمائندہ ہو کر تھے ہم نے یہ خبر کو بھیج دی جو چھپ گئی۔ اب ہماری شامت آگئی کہ کانج کی خبر باہر کیوں پھیل گئی ہے، ہم نے انتہا کیا کہ یہ کوئی ایسی خبر تھی کہ اس کا چھپنا گناہ ہوتا، مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے کسی صورت میں ہمیں معاف کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

پرنسپل صاحب بڑے مزے سے صاحب یونین اور ”مقرر یونین“ کا تماشا دیکھتے رہے تا آنکہ کسی مقرر نے قہر پر میں پہنچ کر سکریٹری کے طور پر ایکشن بڑے کا ردہ کر دیا۔ خوب زوروں کی کوشش ہوئی۔ خیال تھا کہ شاید ہم جیت ہی جائیں مگر یونین ایکشن سے دو روز قبل ایک نوٹس بورڈ پر آدیزاں پڑ گیا کہ ہم نے کانج کی ایک خبر نوٹس وقت میں پھیل گئی اور یہ ناقابل معافی جرم ہے اس لئے ہمیں ایکشن بڑے کے لئے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔ کانج میں سنسنی پھیل گئی۔ پرنسپل صاحب باہر تھے ان کے واپس آنے میں کئی روز کا وقفہ تھا ایکشن دو روز بعد ہونا تھا ہوا اور ہمارے دوست اور پرانے ساتھی مرزا انس احمد باقاعدہ سکریٹری بن گئے۔ وہ جو خیال تھا کہ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پرنسپل صاحب واپس تشریف لائے تو اس سارے حادثہ کا انہیں علم ہوا آپ نے یونین کے انچارج صاحب کو دیکھا کہ ہری صلح صفائی کروادی۔ بڑا مزہ اس بیار میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ وہ صلح صفائی ایسی دوستی میں ہونے لگی جسے پھر کوئی گزند نہیں پہنچی۔ فوراً تھ امر میں ہمارا مقابلہ پھرانس کے ساتھ ہوا اس ہار میدان میں ایک تیسرا امیدوار بمشتر حمدا ختر بھی تھا میں غلام محمد ختر کا صاحب حمزہ داد۔ اس کے بارہ میں تو کسی کو مان تک نہ تھا کہ وہیں گروہا رہے باشند۔ وہ اچانک امیدوار بن گیا اور اس وقت تک ڈنار با جب تک ایکشن کے تقریری مقابلہ میں ناکام ہو کر ایکشن کے لئے نااہل قرار نہیں دیا گیا۔ اس وقت اس

کے دو ریوس نے جن میں... اسے تقسیم شدہ وہ بھی شامل تھے، ہرے حق میں ست رو رکایا۔ نروقت  
 نہ رہا تھا۔ بیش بہا... اس کے دونوں ہونو سمیڑی روایت کے مطابق ہار گئے۔ یہ یاد دہوں کا  
 فرق تھا۔ وہ تین ہار متقی ہوئی کہ سننے میں کوئی مصلیٰ نہ ہوئی جو تم نہیں تھی آخر اس کے کامیابی کا اعلان ہو گیا  
 اور ہم نہیں مبرا کبہ دینے گئے۔ ہم نے اس سے کہا اب یہ نہ سمجھ بیٹھے گا کہ ہم آپ کے مخالف ہیں ہم  
 آپ کے سب سے بڑے حریف ہیں اور یونین کا سب سے زیادہ کام کرین گے جتنا چہ عمر نے اس شکست  
 کا بدہ یوں یہ کہ اس سال یونین کی سرگرمیوں میں سب سے آگے آئے۔ ہے اور بے شمار مقابلے یونین  
 کے لئے جیتے۔ اس ایجنٹ سے ایک ساں پہلے مقابلہ مٹا، مکریم اور افتخار محمد شہاب کے مابین ہوا تھا۔  
 افتخار شہاب چھیون کا بڑا فوٹس لڑکا تھا لہذا اس کے انگریزی حصہ کا لپا ایڈیٹر بھی تھا۔ مقابلہ بڑا معرکہ کا تھا  
 کیونکہ چھیون اور ربود کے امیدواروں میں ٹینس مٹی تھی۔ (احمدی یا غیر احمدی کا سوال نہ اٹھانا اٹھائے  
 جانے کا سوچا تھا)۔ پرنسپل صاحب پہ نفس نفیس خلاف معمول اس مقابلہ کے وقت ہاں میں موجود تھے۔  
 جب معصوم ہو کہ افتخار کامیاب نہیں ہوا تو پرنسپل صاحب نے اسی وقت ایک نیا عہدہ قیام کیا اور افتخار احمد  
 شہاب کو یونین میں "پرنسپل کا نمائندہ" مقرر کیا۔ پروٹوکول کے لحاظ سے وہ نمائندوں میں سب سے سینئر  
 قرار دئے گئے۔ اب اسی سنت کی پیروی میں پرنسپل صاحب نے ہمیں یونین میں پانما نمندہ مقرر کیا اور ہم  
 ہارنے کے باوجود یونین کی حلقہ کے رکن رہے۔ ان تمام ہزیمتوں کا بدہ ہم نے اپنے اپنے پرانے یا رور  
 حریف سے یوں یہ کہ نہ بی اس کے امتحان میں کانچ میں اول رہے اور ان کے تمام حواری ان کے سمیت  
 امتحان کے میدان کا رزار میں کھیت رہے۔

کانچ میں ہمارا سب عمری کا دور اس لحاظ سے بڑا شاندار رہا کہ ہم تمام عمری وادبی سرگرمیوں میں بڑی تندی  
 سے حصہ دیتے رہے۔ کھینے کو باسکٹ بال بھی کھیلا۔ فٹ بال پر بھی مشق ستم کرتے رہے۔ ہر مرد و عورت  
 عہد بیدار رہے۔ یونین کے مباحثوں میں بھی شریک ہوتے رہے اور اپنے پراکٹروں سے بھی پیپرز چھانڈ  
 جاری رکھی امن رکی ایڈیٹر بھی چار ساں تک نبھائی مگر یہ قول شخصے اپنے پردوں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔  
 نیک نامی و سہانی یا نہیں بدنامی نہیں کائی حتیٰ کہ قبل تک نہیں ہوئے بلکہ دھیفے پاتے رہے پہلے کانچ سے  
 پھر یونیورسٹی سے۔ ٹیکسٹوں میں باقاعدگی سے نہ جانے کے باوجود کبھی ہرے لیکچر تم نہیں ہوئے۔ کیوں



پروین کے معدنی و فنی کرنی پڑی رستی تھی جس پر زیادہ رقیق کرنا یہ تہہ سیدہ مرزا تصور ہوتا ہے جا کر اس  
رہی یہ خاصیت اور اس وقت انوں کے تیر لگا کا کرنا بہت رستہ۔ اس کی س نے جاں جو تھی۔  
یہاں سینڈ میں ایک پرانے کوئی اشارہ نے چو پھی یا کہ یہ بنا میں آپ تیں سوہاڑے تیں سوڑوں  
میں سے مجرم کو کیسے پہچن لیتے تھے کیونکہ آپ کا اندازہ کبھی خط نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ صحیح مجرم (یعنی  
میں) ای پتہ جاتا تھا۔ ہم نے کہا میں اب تم سے کیا پتہ دوں؟ تم تو اندازہ سے س جاں اگلی اٹھا کر ذرا  
رعب سے کہتے تھے آپ۔ ”وردہ“ آپ“ آپ ہی آپ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ”کوئی کھڑا نہ ہوتا تو  
دوبارہ درازیدہ در سے کہتے ”وردہ چلکے سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ کون۔ وہی جو اصل مجرم ہوتا کیونکہ مجرم کے  
دل میں چور ہوتا ہے۔ در اگلی کا اشارہ جو شیخ سے کیا جا رہا ہو سیدھا مجرم کے سینے پر لگتا تھا۔ وہ حضرت کہنے  
لئے ہم خواہ مخواہ آج تک پریشان ہوتے رہے کہ ان کے پاس کون سا جاہل و ناسا کہ سیدھے سبھاؤ ہمیں کو  
پہچانے میں۔ آج حقیقت کا پتہ چل ہے تو اپنی بیوقوفی پر حیراں ہو رہے ہیں کہ کئی مذید نیچر محض اس اشارہ  
عمومی کی بدولت ضائع کر دے۔

کانچ میں جو مہمان شریف آتے رہے ان میں دو ایسے یاد ہیں ایک تو ولی روس سائنس دان تھے جو پاکستان سائنس کونفرس میں شرکت کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے نصیر خان صاحب انہیں اپنے ساتھ لوائے۔ کیمسٹری تھیٹریٹر میں ہی ان کا لیکچر سوان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا مگر آپ نے روسی زبان ہی میں خطاب فرمایا۔ ترجمان ترجمہ کرتا تو سائنس دان صاحب کے چہرے سے صاف ملنا کہ اپنے ترجمان سے بستر نگہ گیری سمجھتے ہیں مگر اپنی حکومت کی جانب سے انہیں روس کے سوا کوئی اور زبان دینے کی اجازت نہیں۔ دوسرے ایک امریکن تھے یہ حضرت مسز فلنٹ کے نام سے موسوم تھے اور اہامور میں امریکی تفہیمیت کے رکن تھے۔ ان کا موضوع تھا جمہوریت۔ جیسے آج کل امریکہ کے پیٹ میں جمہوریت کا مرد ٹھٹھا ہوا ہے اس وقت بھی تھا مگر اس کی شدت اتنی نہیں تھی۔ اس لیکچر کے میزبان پوٹیل کل سائنس سوسائٹی والے تھے۔

مسٹر فنسٹ نے اپنی تقریر ہی ابراہام لنکن کے اس مقولہ سے شروع کی کہ:

"Democracy is a form of Government, of the people, for the



people, by the people اور جواب کا موقع آیا تو صاحب صدر نے صرف یہ فرمایا  
any questions?

درست ہے، کئے سمجھتے ہیں یا کہ جناب! یہ صدر میں سے ہیں متور۔ بے جہت فرماتے  
تھے اعلیٰ صاحب صدر۔ کہنے لگے میں آپ کا سوال سمجھ نہیں۔ ہم نے مساحت کی جناب ہمارا  
نیوں باری مردیدہ کی۔

democracy is a form of government, off the people buy the  
people for the people ہم نے وضاحت کے لئے ایک ایک پیچہ پیچہ کر کے تیار کیا۔ آف  
پیچہ ڈائل پف کے ساتھ۔ فریڈم ڈائل بجائے لف کے ساتھ اور بالی پیچہ دیو کیس تھی۔ سہرہ تھیں  
انسی سے گونجنے لگا۔ ملک صاحب اسم باسکی ثابت ہونے یعنی چنگاریاں چھوڑنے لگے در صاحب صدر  
میں سرزنش فرمانے کی کوشش میں انگریزی کے تمام نہ بھوس گئے اردو میں فرمانے لگے بیٹھ جائیں۔ اور  
ہم بیٹھ گئے۔

کاؤنٹیشن بھی ہمارے کان کے یادگار ہوتے تھے۔ کان والے افسروں کو بانے کی بجائے علم و فضا کو  
بات تھے۔ مولانا صاحب الدین احمد 'جلس کیانی' ڈاکٹر سید محمد حسین 'پروفیسر حمید احمد خان' ڈاکٹر زید  
اسہاٹی 'کون سا ایسا ہر تعلیم تھا جو نہ آیا ہو۔ مولانا صاحب الدین احمد تو بزمِ اردو کی تقریبات میں تشریف  
آتے ہی تھے بزمِ اردو کی تقریبات میں ان تمام بزرگوں کے حاد و ماسو جلس کیانی کے سب ہی  
تشریف آتے رہے پھر سرکاری عہدیداروں کا آنا جانا بھی زیادہ تر بزمِ اردو کے زیر اہتمام ہوتا تھا۔  
ہمارے ڈویژن کا ہر کسٹمر بزمِ اردو کے زیر اہتمام ہی رہا وہ آیا یا بعد کو باسکٹ بال کے ناتے سے۔ ایک کسٹمر  
تھے شیخ محمد حسین کا نام تھا قاضی صاحب یعنی پرنسپل قاضی محمد اسلم صاحب کے گورنمنٹ کان کے  
زمانہ کے شاگرد تھے جب کان کیسپس میں داخل ہوئے تو مونر سے اتر گئے کہنے لگے میں اپنے استاد کے  
سامنے گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جاسکتا۔ شیخ صاحب گمریزی کے آدمی تھے رد و پڑھ دیتے تھے مگر زیادہ سمجھ  
بو جھ نہیں دب کی نہیں تھی۔ اپنے استاد کی زیارت کے شوق میں ہماری دعوت قبول کر دی تھی۔ ہم نے بنا  
خطبہ استغاثہ پہلے سے بھیج دیا تھا کہ جواب نکھو اور لائیں۔ ہم اس زمانہ میں پروفیسر نہیں تھے محض پکچر

تھے کہ اپنے مہر کے لئے، ایسے نام کے ساتھ ”ستادِ ارباب“ کو دیکھتے تھے۔ شیخ صاحب باقاعدہ عمارت پر بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اسی انہی استادِ ارباب اور ان کی نوپوشوں نے۔۔۔ سامعین کے کان کھڑے ہو کر غور و فکر سمجھے ’کہانت‘ (ذرات) کی غلطی سون ہوں جب کاشتر صاحب نے دو تین بار ادبیات ردو کی بجائے ادبیات اردو فرمایا تو لوگ محظوظ ہونے لگے۔ قاضی صاحب نے بڑے پیر سے نہیں سمجھا یا کہ یہ سننے از بیات نہیں ادبیات ہے شیخ صاحب خود ابھی مسکرائے کہنے لگے ردو کی یعنی تو مصیبت ہے کہ یک خطہ کے ابھر دھر ہو جائے سے Shek He بن جاتا ہے۔

کاشفوں میں سے سید قاسم رضوی نہایت ادب و آزار اور ادیب و اراک کشنر تھے۔ سبشت و رفتہ اردو لکھتے اور جوتے تھے کہ یہ کوئی رد و کا پر د فسر بھی لکھتے یہ بولے گا۔ سرگودھا میں یوم غالب کے موقع پر پنا خطبہ صدرات غائب کے اسلوب میں خطائی صورت میں لکھا اور پڑھا اور اہل ذوق مدحوں اس کو یاد کرتے رہے۔ ڈاکٹر انور سدید محمد خالد اختر اور مشفق خواجہ کے غالب کے جدید خطوط اس کے بعد کے ہیں۔ یہی قاسم رضوی بزم ردو میں بھی آئے اور دسویں قومی باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں ڈویژن کا کشنر ہونے کے ناطے سے میر باں کی حیثیت سے بھی آئے۔ میں ان دنوں باسکٹ بال کلب کا صدر تھا کیونکہ چودھری محمد علی صاحب پر بسلی کی کرسی پر سرفراز ہو گئے تھے۔ کشنر صاحب انتظامات کا محاسبہ کرتے پھرتے تھے۔ ہم نے جلسہ سالانہ کی طر پر ہوسٹل کے باہر کچھ عارضی بیوت لٹھا بھی سوار کی تھیں وہاں پہنچے تو کہنے لگے یہ کیا رہا ہے؟ میں نے کہا "بیوت افلا، ہیں دست مبارک سے نفاذ فرمائیں"۔ کشنر صاحب کی ساری کشنر نے تمکنت دھری رہ گئی تہتہ مار کر بیٹے اور بیٹے چھپ گئے۔ مدحوں بعد جب دو ملتان میں کشنر تھے میں نہیں کیا کام سے ملنے گیا اس وقت بھی وہ افتتاح و لاطیف انہیں یاد تھا۔ افسوس کہ مجھ صاحب کی کیہ تو زری کا شکار ہو کر، زمت سے بر حرف کئے گئے اور جدتی فوت بھی ہو گئے اور پاکستان ایک نہایت زیرک، مختلف اور ذہین افسر سے محروم ہو گیا۔ وفات سے ذرا عرصہ قبل لاہور میں سول سروس اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے کہ ایک روز اچانک ان کی برطانی کے حکامات جاری ہوئے۔ دو روز بعد ان کی والدہ کی وفات ہو گئی میں غناق سے لاہور میں تھا میں عزیت کے لئے پہنچا دیکھا کہ ڈائریکٹر کے وسیع و عریض بنگلے میں تن تنہا

مجلس بیٹھے ہیں۔ میں یہ تو میرے سنگٹے بک کر پھوٹ پھوٹ کر رہے۔ کہنے لگے "میں سے اکیلا بیٹھ ہوں  
میرے پیٹے شیش دوس۔" میں گھر میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ خدا جانے کی۔ جس وقت میں بھی ہوں اسے کایا  
نہیں آئے گا۔ میں نے بہت تسلی کی اور سارا دن اس کے ساتھ رہا۔ درلوداروں کرتا رہا شام کو چنارہ انھا تو  
گنتی کے چند لوگ اور سول سروس کیڈی کے عہدیدار چنارہ کے ساتھ تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی  
شاؤنی سنی۔ میں اس وقت نہیں باہر تھا خدا معلوم ان کے چنارہ کے ساتھ کون تھا اور کون نہیں تھا۔ دنیا دار  
ڈالوؤں کے ساتھ نہیں سوتے فیری کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مشاعرے بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے۔ کچھ اس وجہ سے کہ معیار بہت بلند ہوتا تھا کچھ اس وجہ  
سے کہ پرنسپل صاحب کے علاوہ ان کی بیگم صاحبہ شعروں کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں (آخر کس ماں کی بیٹی  
تھیں؟) ایک مشعرہ کالج میں ہوتا ایک پرنسپل صاحب کے گھر میں ہوتا۔ نائب زیروی پرنسپل صاحب  
کے ذوق کو خوب پہچانتے تھے۔ کالج واسے نہیں کہہ دیتے کالج کی گاڑی شعرا کو لینے چلی جاتی اور شعراء  
مر کے مل آتے۔ اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں صوفی قہر بھی آئے۔ اس وقت پرنسپل صاحب حضرت  
صاحب بن چکے تھے جب صوفی صاحب کی تشریف آوری کا علم ہوا تو مجھے خاص طور سے یاد فرمایا اور تاکید  
کی کہ صوفی صاحب میرے استاد ہیں ان کا بہت خیال رکھنا۔ صوفی صاحب نے اردو غزل کے علاوہ  
پنجابی کلام بھی سنایا۔ "سھاڑے حسن دے چنگدے لیکھاں اوئے ڈاھڈے غم دیاں سیاہیاں ڈھل گیتاں  
جیہڑیاں سن ترے چکائیاں سن دو چائیاں راتاں رُل گیتاں۔"

دوسری اردو کانفرنس جو ۱۹۶۷ء میں ہوئی بڑی عظیم الشان کانفرنس تھی سارے پاکستان میں دور و نزدیک  
اس کا چہرہ چا تھا۔ کانفرنس کے وقت ہال کچھا کچھ بھرا رہتا تھا۔ فیصل آباد اور سرگودھا سے تو بے شمار لوگ آتے  
کانفرنس سننے اور واپس چلے جاتے۔ کھانے کا البتہ نگر جیسا انتظام تھا مگر میوے نگر کا نہیں تھا۔ بڑے پر  
تکلف کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ دوسرے روز شام کی دعوت تو حضرت اقدس خلیفہ المسیح ثالث کی  
جانب سے تھی در انجمن کے مغربی مان میں جہاں اب گیسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے تھی۔ اس دعوت میں  
حضرت صاحب مہمانوں سے ذرا پہلے تشریف لائے تھے اور خود مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔ مہمانوں میں  
ان کے پرانے رفقاء کار ماہرین تعلیم اور دوست شامل تھے مجھے یاد ہے ڈاکٹر سید نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ

کاٹا اسوارڈ پکڑ کر حضرت صاحب کے گنگے لگ گئے اور بڑی سیٹک سے جد سے جد۔ صوفی قہسم صاحب سے بھی معاف کیا۔ عابدی عابدیت سے دے رہے۔ یہ دعوت بڑی بے تکلفی کے، حوں میں ہوں مگر کھانا حضرت صاحب کی توقعات کے مطابق تیار نہ کیا یہ تھا جس سے حضرت صاحب نے گھر سے بھی بہت سی ڈشیں منگوائیں۔ دیر تک مہمانوں سے گفتگو فرماتے رہے۔ چلتے وقت ڈاکٹر سید نذیر احمد نے پھر سی جوش دھڑب سے معاف کیا۔ ڈاکٹر صاحب خوب آوی تھے، سینے میں بالکل سادہ مگر علم میں پختہ اور علم میں نہایت مقبول۔

کالج کے مشاعروں میں رات بھی اپنے رنگ کی۔ رات تھی کیونکہ ہمارے مشاعروں میں دور رات ہی ہر بونگ نہیں جیتی تھی۔ لوگ داد ضرور دیتے تھے مگر بے داد سے بختب رہتے تھے اس لئے شعر ایسا آنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور سارا سال منتظر رہتے تھے کہ کب کالج کے مشاعرہ کی دعوت آئے۔ ایک بار حامد حلیف انور تشریف لائے۔ ان کی رہائی نے مشاعرہ لوٹ لیا:

دل سے تو بے شک تارے گا مجھے  
دور تک لیکن پکارے گا مجھے  
مجھ کو ہے اپنے گماہ کا اعتراف  
پہلے پھر کون مارے گا مجھے؟

تذقی یوں ہوا کہ اگلے سال کے مشاعرے سے پہلے وہ دنیا چھوڑ گئے۔ گلزار ہاشمی آئے اور دو غز میں اپنے بے پناہ ترنم میں سنائیں۔ ایک کی ردیف یاد ہے۔ "وقت ناما ساز ہے"۔ کچھ غزلیں درد انگیز تھیں کچھ ان کا ترنم درد انگیز تھا سارا ہال اداس ہو گیا۔ لوگ مشاعرہ کے بعد بھی ان کی غز میں انہی کے ترنم میں غنائات رہے۔ اگلے سال کے مشاعرہ سے پہلے وہ بھی۔ عیال عدم ہو گئے۔ شعرا میں چہ میگوئیں ہونے لگیں کہ جوش عزیز یادہ پسند کیا جاتا ہے وہ مرجاتا ہے۔ کلیم عثمانی کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی میں نے کہا کلیم بھائی آپ نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ آپ نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بش ایسی منہوس بات منہ سے نہ کاو"۔ ابھی میں مرنا نہیں چاہتا۔



کا سکتے ہیں، اصل یہ مسئلہ ہے کہ کان کانٹیلز سے ہمارے کانٹیلز میں یہ ہونے لگی ہیں۔ وہ  
 کھڑی بعد وہ پکسل صاحبہ جیت کھڑی تھیں یہ وہ پہلے سے حسب اس کے کہ وہی بھی وہاں سے  
 بڑھ کر کرتے تھے۔ نازکہ خدیوہ صاحبہ نے ایک ہزار چھ سو تھوڑے عرصے میں تھیں تھیں۔ ہم  
 سوڈن میں تھے تو ہمارے لئے تھیں فرہم کرنے کا یہ اس نے تھیں کہ تھیں ہم کسی کتاب کے بارہ  
 میں کہہ دیتے دو تھیں نیا یہ تھیں کر کے وہ کتاب میرا کر لیتے۔ فاضل قیمت تھیں کوئی شے اس کا رستہ نہ  
 رکھ سکتی۔ پھر ہمارے پر وقت آن پڑا مگر اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ کروڑوں میں کھیت تھیں۔ اب  
 جوگ پڑا کہ کھاکھراک سوئے مگر اس کی جیس پر ٹک نہ آئی۔ برفرتہ رفتہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو رہا  
 ہے۔ پاکستان سے باقی عدلی کے ساتھ فون کر کے ہمارے خیریت دریافت کرتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں  
 ہماری عدالت کی خبریں تو فون پر دہرائیں، وہاں کر دیا۔ ایسے شام کے نصیب ہوتے ہیں؟ یہ اس کی دین  
 ہے جسے پروردگار دے۔ کشمیری رانی کی جیمیں شپ ہمارے کالج کے ہاتھوں میں رہی۔ اب پتہ نہیں کیا  
 حال ہوگا؟ زواں تو ہمارے پارا سمنہ بر کے زمانہ ہی میں شروع ہو گیا تھا جب عربی پڑھانے والے لوگ  
 اس خیاں سے کہ ماضی میں عرب جہازان سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے تو ہم کیوں نہ ہمیں بوننگ  
 کے پیر بن جائیں؟ کشمیری رانی کردانے لگیں تو یہ تو ہونا ہی تھا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے  
 کاموں میں۔ ہاکی رشید فنی کھاتے تھے۔ اللہ نے حسب پڑھائیں گا، تھیں سکھائیں یاہ کی کی چالبازیاں  
 سکھائیں؟ فٹ بال البتہ ماسٹر فضل د صاحب نے ایک عرصہ تک خوب خوب کھلایا مگر بوڑھے آدمی  
 تھے جب ان کی ٹانگیں سمن بن گئیں تو اس حالت سے جان بھڑا کر باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کو پریڈ  
 کروانے لگے۔ باسکٹ بال نے کانج کے نام کو پورا چاند لگا دئے۔ پنجاب کی ٹیم کے نوے فیصد کھلاڑی  
 ہمارے کانج کے ہوتے تھے آرمی پولیس حبیب بینک یہ سب ٹیمیں ہمارے کھلاڑیوں کے بل بوتے پر  
 جاتی تھیں۔ روہ پاکستان میں باسکٹ بال کا سب سے اہم مرکز بن گیا تھا۔ خیر خان صاحب چوہدری محمد  
 علی صاحب کے علاوہ کچھ ہم جیسے "آؤٹ سیدنگ" یعنی باہر کھڑے ہونے والے کھلاڑیوں کو  
 باسکٹ بال کھیلانے کا پڑا۔ فَلْکَ الْاِیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیْنِ النَّاسِ۔

کانج تو میا لیا یہ تو بس یوں سمجھ لیجئے صرف ہمارے کالج کا ہی نہیں پاکستان میں تعلیم اور نظام تعلیم کا

ہا روٹھ گیا۔ مارن قومی مدنی کا تو یہ قلعہ کا یہ ماحول شہر قی پاتس سے بڑا ہے۔

تاریخ میا بیا تیس وقت حضرت صاحب نے رشادہ کیا کہ خود قلعہ زندگی صاحب کا مرکز رہا ہے وہیں  
 ہمارے رب جس کی خدمت میں اسے جبرمت سب کرے۔ ان مہربان صاحب کا یہ چاہیے کہ  
 وائیں زندگی میں بہت سے دلوں کو انھیں صاحب کرنا پڑا۔ موابوں کہ ۲۹ مکی کے اقلہ بڑے کے بعد  
 حکومت۔ چاہیے کی رنگ اقلہ میہ بھڑکی در سن سے کالج کے سارے سٹاف کو ادھر ادھر تبدیل کر دیا ورس  
 باب میں مہار چہ پیلہ جیسی حرکتیں بھی کیں۔ مثلاً ایسی جگہوں پر ایسے سینہ سٹاف کو تبدیل کر دیا جہاں اس  
 مضمون کی کڑیسیں ہی نہیں تھیں۔ سٹاف پروفیسر بشارت الرحمن صاحب جیسے سینئر ترین پروفیسر کو چپ  
 نمبر ۴۱ باب کے انٹرمیڈیٹ کالج میں بھیج دیا جہاں عربی پڑھنے والا حق کوئی نہیں تھا۔ کی طرح کسی کو  
 کہیں کسی کو نہیں بغیر سوچے سمجھے تبدیل کر دیا۔ ہم خدا معلوم کس وجہ سے بچ گئے یعنی سارے سٹاف کا  
 تہہ۔ ہو گیا ورم ٹی آئی کالج سے منسلک رہے۔ چینیٹ کالج میں ہمارے ایک جوئے سے دوست تھے  
 جن کا بیٹا ہمارے کالج میں پڑھتا تھا اور ہمارا شاگرد تھا۔ وہ ٹی آئی کالج کے پرنسپل بنا کر بھیج دے گئے۔  
 ب سٹاف کیا کرتا؟ یا تو چارج چھوڑ دیتا ورنہ جگہوں پر جا کر پناہ رنج سے لیتا یا کالج سے چھٹی سے لیتا  
 چنانچہ سوائے ہمارے سب کالج سے چھٹی لے کر غائب ہو گئے اور ہماری ذمہ داری یہ ٹھہری کہ ہم نے  
 پرنسپل صاحب کو جو پرنسپل کا چارج لینے کے لئے بیتاب ہیں باتوں میں لگا کر بہانے رکھیں اور چارج نہ  
 لینے دیں۔ چنانچہ ہم نے یہی کیا صبح صبح کالج پہنچ جاتے۔ پرنسپل صاحب چھیوٹ سے تشریف لے آتے  
 ہم انہیں سٹاف روم میں بیٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔ کچھ کاغذوں پر ان کے دستخط بھی ہوتے رہتے مگر  
 چارج ہم نے انہیں نہ لینے دیا۔ دو باب انجیل جو ہم نے طالب علم کے دوران کلاسوں سے غائب ہونے  
 کے لئے پڑھا تھا اب بہت کام آیا تا آں کہ حکومت کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور سارے تہہ سے  
 منسوخ ہوئے تب ہری جان میں جان آئی۔ اس کی سزا ہم نے جاپان سے واپس آنے کے بعد پائی۔  
 (ہمارے کالج کے پرنسپل ڈنٹ محمود اسلم صاحب ہری مسی کے گواہ ہوں گے کہ ہم نے ایک حاضر  
 پرنسپل کو کس طرح غیر حاضر بنائے رکھا تھا)۔

کالج تو میا گیا تو سٹاف کی سینیاری نی اسٹ یہ بھی اتفاق سے وہ لٹ ہمارے پرانے کاغذوں میں دستیاب

ہے اس کے درج کرتے ہیں کہ خان سنے کتا چار ماہہ دیکھ تھا۔ میں عطاء الرحمن صاحب اور پروفیسر حبیب ندان صاحب۔ بنا رہے تھے۔

پروفیسر چوہدری محمد علی پرنسپل

پروفیسر بشارت الرحمن پروفیسر عربی

ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہ ایم ایس سی پی ایچ ڈی ندان۔ پروفیسر کیمسٹری

ڈاکٹر نصیر احمد خان ایم ایس سی سیل پی ایچ ڈی اربم۔ پروفیسر فزکس

ڈاکٹر ناصر محمد خان پرازی۔ بی سہ آنرز ایم اے پی ایچ ڈی (پنجاب)۔ پروفیسر اردو

مسعود احمد عطف۔ لیکچرار فزکس

مہارک احمد نصاری۔ لیکچرار کیمسٹری

مرزا مجید محمد۔ لیکچرار تاریخ

چوہدری عطاء اللہ۔ لیکچرار فارسی

چوہدری حمید اللہ۔ لیکچرار حساب

مرزا خورشید احمد لیکچرار انگریزی

عبد اللہ خان۔ لیکچرار تاریخ

عبدالرشید نقی لیکچرار حساب

چوہدری سلطان اسیر لیکچرار عربی

منور شمیم خاں لیکچرار سوسائٹی

سید حبیب الرحمن لیکچرار ریاضی

محمد اسد علی لیکچرار عربی

محمد شریف خان لیکچرار ریاضی

عبدالجلیل صادق لیکچرار انگریزی

محمد عثمان صدیقی لیکچرار اسلامیات



محمد مسلم شاہ (بکال) پیکر ربانی

مرزا نس احمد پیکر افسانہ (علی علیہ السلام کے چھٹی پر)

چاندنی صادق علی پیکر ربانی

سعود محمد خان پیکر ربانی

محمد ظفر اللہ پیکر حساب

مبشر محمد خان پیکر افسانہ

آصف علی پرویز پیکر افسانہ

محمد علی تاجانی پیکر افسانہ

منور محمد پیکر افسانہ

مرزا محمد لقمان پیکر افسانہ

محمد ہمایون پیکر اسلامیات اے بی بی

رفیق محمد تاقب پیکر ریسمٹری (چھٹی پر)

خیر حسین انصاری پیکر ریسمٹری

خادم حسین پیکر افسانہ

سلطان احمد چوہدری پیکر افسانہ

انظہر وحید پیکر ریسمٹری

مبارک احمد طاہر پیکر افسانہ

مبارک احمد عبد پیکر افسانہ

پروفیسر ملک مبارک احمد جزوقتی پیکر ربانی

اب پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ان لوگوں میں سے کوئی ایک آدھی کالج کے سٹاف پر ہوگا 'نصیر احمد خان پروفیسر

بشارت رحمن' مسعود احمد عطف' چوہدری عطاء اللہ' اور جزوقتی استاد پروفیسر ملک مبارک احمد تہ کو

پیارے ہو گئے۔ مرزا امجد احمد صاحب کالج چھوڑ گئے۔ چوہدری حمید اللہ مرزا خود شید احمد' محمد مسلم شاہ مثلاً

سب سے پہلے وہ جماعت کے خدمت کے لیے صاحبِ گریہ و شکس کے انجمنِ سہماہ و سہماہی تیار ہونے کے لیے  
 ہجرت کے غلوں میں رہا کرتے تھے۔ اس کا گریہ کرتے "ہائی لیب ایک ایک کر کے" نام نہانوں کے  
 تو سب سے پہلے سب سے آخری سب سے عزیز کی مبارک آمد کا بھی رونا رہا کرتے تھے۔ ہائی لیب کے  
 دیوارہ ملے تھے، وہ بھی سب سے کھنڈر ہو چکے تھے۔ روج جاتی رہے تو یہی ہوتا ہے۔ از گریہ روج کا حرکت یہ  
 صورت نکلی۔ تنہا رہ گیا انسان کی عمر بڑھا۔

-----

## ہمارے دکاندار!

چھ ماہ پہلے لندن کے 'جنگ' اخبار میں ایک مذکورہ شائع ہوا جس میں فیض ملانے کے نام نے برسرِ منبر یہ نرم گایا تھا کہ ربوہ ورقادیوں میں ہر دکان پر رکھا ہوتا تھا کہ یہاں کسی غیر حمدی کو سودا فروخت نہیں کیا جاتا۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں قادیان میں پیدا ہوا، چلا اور بڑھا پھر ربوہ میں تعلیم پائی اور یہیں کے کالج میں پندرہ برس سے زیادہ چڑھانے کا موقع ملا مجھے تو ربوہ میں کبھی کوئی ایسا بورڈ نظر نہیں آیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ربوہ اور قادیان کے دکانداروں کے ذکر میں کچھ لکھنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ دو طبقہ ہے جو عام طور پر مضمون لکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ ان کی شکایتیں تو لوگ کرتے ہیں ان کی خوبیوں کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔

ابھی پچھ دن سوے مول بازار کے دکاندار فطیل احمد صاحب کے انتقال کی خبر تھی۔ ان کے صاحبزادوں میں سے نصیر و رحیم سے ہمارا تعلق رہا۔ ان سے دودھ دہی اور بعض اوقات کسی خریدنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ نہایت ایماندار آدمی تھے۔ دودھ والوں کے بارہ میں ہم تاثر یہ ہے کہ کوئی بی ایسا رہا ہو گا جو دودھ میں پانی کی ملاوٹ نہ کرے۔ بلکہ ہم نے لوگوں کو دودھ میں پانی کی ملاوٹ کرتے دیکھا ہے۔ فطیل صاحب سے ہمارا نہایت نام نہاد ملتا تھا۔ ان کے ہاں کی دہی کی لمبی اسی لئے دوسروں سے ممتاز ہوتی تھی۔ کہ اس میں جو دہی استعمال ہوتا تھا وہ خالص دودھ سے تیار کیا جاتا تھا۔ ان کا ذکر آیا تو اپنے کچے باز کے دکاندار اور دوست فیض کرمانی صاحب کا ذکر بھی نوکِ قلم پر آگیا۔ فیض خان صاحب کمزور دکاندار تھے۔ دراصل ربوہ کے ابتدائی دنوں میں ارد گرد کے دیہات سے جو خواتین دودھ لے کر ربوہ میں بیچنے آتی تھیں انہیں ملاوٹ کے طور طریقوں کا پتہ نہیں تھا۔ اس لئے نسبتاً آسانی سے خالص دودھ مل جاتا تھا۔ پھر وقت نے انہیں خراٹ بنادیا پھر تو وہ وقت بھی آیا کہ ربوہ میں ہمارے یورپ کی اصلاح کے مطابق ہکا در

ن لٹو اتائی سے میرا دودھ ملنے لگا۔ مگر ہمارے دکانداروں نے اپنی روایتوں کو نہیں چھوڑا۔ حتیٰ الوسع خالص



ان میں سے جن میں سے ہوتی تھی۔ ہر سیرین کی چار چار قسم کے مٹس کے ذریعے گل پڑے جن کی  
 رنگت ہنس، بے، سیاہ، تھوڑے، اور ایک جی کی ہیں۔ انہوں نے ہاتھ بدھوں ایک ہر میو سوڑا  
 ، ٹرٹل کی کیسے کر سکتی ہے؟ ہمارے بچے عبد الرحیم، رچی عبد اللہ کی ہمیں خالص چٹنی سے تیار کی جاتی  
 تھیں۔ گڑ میں چٹنی کے جھڈ کوئی اور چیر سوتی تو ہم نے جتنی مقدار میں ان کا سوڑا دائرہ کار ہے اب  
 نے جان بقیہ تسلیم کر چکے ہوتے۔

قادیان کے دکانداروں میں سے چھابڑی والے بابے "بابے" کے چپے یاد ہیں۔ صاف ستھرے، بٹلے  
 سوئے، پنے، مریچ، مصالحے بھی صاف ستھرے۔ درختوں اور ان پر کھٹائی کا چھینٹا، ہم گوشت کی دھجی  
 چٹنی کے وقت کھاتے تھے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان چٹنوں سے پیٹ میں درد ہوا ہو یا بد ہضمی کی شکایت ہوئی  
 ہو۔ درندہ چٹنوں میں آکر صرف ایک بار کسی چٹنے والے سے چٹنے کھائے تھے اس نے ناکوں پر چپے  
 دیئے۔

چچی عبد اللہ نے فیکٹری کی بریڈر بوہ میں پنی سوڑا دائرہ کی بساط پھر بچائی کر دت بدیہ تھا۔ اس نے نہیں  
 یہ بساط لپیٹنا پڑی۔ ہم نے ایک دو بار چچی سے کہا کہ کوئی اور کاروبار آپ کیوں نہیں کر لیتے؟ کہتے "میں کسی  
 اور چیز کا تجربہ نہیں اور اب ہماری عمر نے تجربے کرنے کی نہیں" ہمیں کسی پرانے شاعر کی رباعی یاد آئی۔

چرخ ب میں جو ہے نہیں لیتے ہم

کونین بھی گو ہے نہیں لیتے ہم

ہم لیتے ہیں جس ڈھب سے نہیں دیتا وہ

جس ڈھب سے کہ وہ دے ہے نہیں لیتے ہم

یہ پر نے بزرگوں کی وضع داریاں تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کا چین بھی ختم ہوا۔

قادیان کے افضل برادرز والے قریشی محمد اکمل صاحب اور قریشی محمد افضل صاحب ربوہ میں آکر بیٹھے۔  
 یونہی سا خیاب آ رہا ہے کہ قادیان میں ان کی دکان کا نام غالباً افضل جرنل شور تھا؟ ایک جرنل شور ذہن  
 میں ہے جسے ہم اپنی دانست میں جرنل شور پڑھا کرتے تھے۔ پاکستان میں آکر تو "جرنل" کا لفظ اتنا عام  
 اور بدنام ہو گیا کہ اس لفظ کے معنی ہی بدل گئے۔ حالانکہ ربوہ میں کئی جرنل شور کھلے اور اب تک کھلے

تھا۔

وہ اسی دعوے کے بعد ہوشوں کی بازی ہوتی ہے۔ ہم کی مضمون میں پہلے ہمارے کے ہمناموں کا ذکر کر چکے ہیں۔ مگر یہ فیض کرمانی صاحب دراصل ۱۹۵۵ء کی بیٹی تھے۔ ان کی چائے سیلونی کے متبادل میں کم چلتی تھی مگر جو لوگ سیلونی کے باں نہیں جاتے تھے۔ وہ ان کی خاموش گفتگو سننے کے لئے ان کے پاس آتے تھے، پھر گوں باز۔ میں خواجہ رستم خان حلا۔ خواجہ صاحب، خواجہ عبدالقدوس صدیقی صاحب کے داماد تھے اور صاف ستھری چیزیں بیچتے تھے۔ پھر ہمارے خان میر صاحب انجمن کے بیٹے بھائی حبیب نے جمال بیکری کے اوپر ایک فردوس رستم خان کھوا۔ یہ خواجہ خلیفہ صاحب داماد رستم خان "لعلیت" بہت بعد کی بات ہے۔ ربوہ کے سارے رستم خانوں کی خصوصیت یہ رہی کہ یہاں دوسرے شہروں کی طرح ٹپ کا کوئی رواج نہیں تھا کیونکہ خدمت کرنے والے ٹپ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ایک دوست یورپ سے گئے ہوئے تھے۔ ایک رستم خان میں ہم دونوں نے چائے پی۔ اٹھنے لگے تو بیرے کی ٹپ کے لئے دو روپ میز پر چھوڑ دیئے۔ وہ بیرا ہمارے پیچھے بھگتا بھگتا آیا کہ صاحب آپ میز پر دو روپے بھوس گئے ہیں۔ انہوں نے کہا بھولے نہیں تمہارا انعام ہے۔ کہنے لگا کس چیز کا انعام؟ میں تنخواہ دار کارکن ہوں۔ اور مجھے اسی چیز کی تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے برعکس ہم ابور میں پڑھنے کے لئے گئے تو ہمارا ٹھکانہ بیٹھنا پاک فی ہاؤس میں تھا کیونکہ یہی ایک ادیبوں شاعروں کا ٹھکانا تھا۔ چائے پیتے تو ٹپ بہر حال دینا پڑتی۔ ایک بار ہم نے ایک بیرے سے کہا کہ یہ آج ہمارے پاس ٹپ کے پیسے نہیں ہیں کہنے لگا کوئی بات نہیں اگلی بار روئے دیجئے گا۔ ادھر اسی پاک فی ہاؤس میں ایک سے دو نہیں بیروں سے بھی ٹپ کا ادھر چماتا تھا۔ فی ہاؤس کا ذکر آج تو تیرتے چلیں کہ ابور کے چھ شعراء سے ہمارا تعارف یہیں ہوا۔ اور یہ جو ہم ربوہ میں اتنے بڑے بڑے شاعروں کو بلا معاوضہ مشاعروں میں بلاتے اور پڑھواتے رہے یہ اسی دوستی کا فیضان تھا۔ اسی فی ہاؤس میں آخری کلام جو ہم نے سنا وہ قبل ساجد کا تھا۔ اب تو وہ عالم گزر گیا مگر کیا غزال اس نے سنائی تھی کہ ہم ہی نہیں ہمارے قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

"پچھلے برس بھی بوئی تھیں لفظوں کی کھیتیاں۔ اب کے برس بھی اس کے سوا کچھ بھی نہیں آیا

عزت جی اپنے پاس سے اور شوک تک بھی۔ جسے کہیں کہیں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔  
 یہ مسنون مسنون کی تحفہ میں کھوتے ہیں۔ اور ایک صاحب میں ہیں جو تاتے کے دوسرے  
 چٹک کی دور کی مات کی طرف مڑتا ہے اور بل اب کہتے ہیں کہ ایک ماتوں کا کوئی نہ کوئی، مٹی رہے  
 ضرور ہوتا ہے اس سے زمین کو جھٹکا نہیں چھپے۔ جو بات آج سے لکھ دینا چاہیے۔ چنانچہ ہم بھی  
 ان طرح کر رہے ہیں تاکہ مسنون کی انجی برقرار رہے۔

رہستہ رانوں سے چھپے تو رہہ کے کریمانے دوسرے تک بات پہنچی۔ کچے باز میں تین بر دران تھے۔ اور  
 بھائی تھے ایک کا نام شاید قدرت اللہ تھا دوسرے کا عصمت بند۔ بڑے بھائی کے بیٹے سچ رہے ساتھ  
 سکول میں تھے۔ اب خدا معلوم وہ لوگ کہاں ہیں مگر ان کی دکان وہ دکان تھی۔ جس سے کرینہ کا  
 سامان دستیاب تھا۔ اس زمانہ میں تو مادیات کا غلط صرف کتاوں میں ملتا تھا پھر تباہوں سے نکل کر لوگوں کی  
 رہن پر کیا وہ ہر شے میں مدوت ہونے لگی۔ مگر رہہ میں چیزیں خاص مٹی تھیں۔ بزرگوار سرور  
 مصباح الدین صاحب اور کئی دوسرے بزرگ جو چینٹ میں رہتے تھے رہہ سے کرینہ کا سامان  
 خریدتے تھے۔ کہ بلا سے ذرا سامان لگتا ہے تو ہو خالص تو ہے۔ ہزنی والے خواجہ محمد تریف صاحب کچے  
 باز میں اکبیری تھے مگر ہزنی صاف تھری ورتا زہ بیچتے تھے۔ گاؤں سے مدوت اور مہربانی سے پیش  
 آتے تھے۔ ان کی دوکان میں مسجد کے سامنے تھی نہ کہ وقت ہوتا تو سب سے پہلے مسجد میں پہنچتے۔ اور  
 اپنے وقت میں کسی کو کچھ خریدنا سوتا تو اسے انتظار کرتا پڑتا۔ ان کے بیٹوں میں سے سید ہمارا کلاس فیلو اور  
 دوست تھا باقی تو بڑے تھے۔ اب ان کے بیٹوں میں سے جمیل، بسوں کے اڑھ پچائے کی دکان کھولے  
 بیٹھا ہے۔ خواجہ حنیف بیر وکھالتے تھے۔ اور کبڈی کے کھڑی تھے۔ وہ دوران سے چھوٹے خواجہ مجید اللہ  
 کو پیر سے ہو گئے۔ خواجہ شریف صاحب نے جوان بیٹے خواجہ حنیف کی وفات کا صدمہ دیکھا۔ مگر ہم نے  
 انہیں صبر شکر اور رضی برضا پایا۔ پھر گول بازار اور نند منڈی کی بنیاد پڑی۔ کرینہ دوسوں میں 'مور  
 ہاوس' بہت مشہور ہوا۔ مگر پھر وہ کرینہ کی بجائے لوہا بیچنے لگے۔ بیس شادت راد از کجاست۔ تاہم کچھ خواجہ  
 عبدالحی ہمارے خواجہ عبد مومن صاحب اور خواجہ باسط درجلس کے والد بھی کرینہ کا کام کرتے رہے۔  
 خواجہ عبد مومن صاحب تو کپڑے کے کاروبار میں رہ کر ماروے آئیٹھے۔ خواجہ عبد الباقی صاحب

دوس کا تنگ دھوپے کی تنگ دودھ میں ہیں۔

ایسا حوں میں بھائی عبد اسد بھی ربوہ میں جانے پہنچے تھے حضرت صاحب کی غیرہ نیاں سب ہی بیٹے رہے۔ ایک بار لندن کے جلسہ میں یہ ملاقات ہوئی۔ بہت خوش تھے کہ حضرت صاحب کی خیال کی کے ناٹے جلسہ سالانہ پر آنے کا موقع مل گیا۔ اسی جلسہ پر بھائی عبدالرزاق فریادہ سے ملے۔ ان کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ لندن کا سفر اختیار کر سکتے مگر اندھنوں نے ایسا جذبہ دیا تھا کہ جلسہ پر آ گئے۔ ملاقات ہوئی تو فریادہ نے گئے زندگی کا کیا یہ سوچ حضرت صاحب کے دیدار سے آنکھوں کو روشن کر دیا۔ تاہم رترواز زندہ تھی۔ کچھ بازار میں فریادہ کی معمولی سی دکان تھی مگر خصوصاً خاص کی دولت سے مال مال تھے۔

منہائی دوس کا ذکر کرتے ہوئے ذکر لگتا ہے کیونکہ ہم شیخ سے تھے۔۔۔ ہو۔ میں کہ منہائی منہائی ہاتوں سے پر ہیز روار کہتے ہیں۔ بھائی عبد اسد بھی صاحب کی برنی اللہ اللہ اس کا ذوق دور دور تک جاتی تھی۔ مگر ان کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ یعنی برنی جھوڑ کر لوہے پر آ گئے۔ ان کے بیٹے ہمارے شرمندہ ہوئے۔ عبد الکریم صاحب نہایت دماغ مو مسکین طبیعت آدمی ہیں۔ ہم نے کبھی نہیں مطلب سے زیادہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ ان کی برنی کا چراغ گل ہوا تو البشری کے چوک میں محمود صاحب کی برنی مشہور ہوئی۔ منہائی کی اور دکانیں بھی ربوہ میں رہیں۔ منڈی میں بھائی اللہ بخش صاحب بہت مشہور تھے۔ ان کے بیٹے ہمارے شاگرد تھے۔ پان اور تمباکو کی دکانیں ربوہ میں تھیں ہی تھیں؟ مٹی چنی تھیں۔ جب تک ہم سگریٹ نوشی کی علت میں مبتلا تھے ایک دو دکانداروں کی دکان ہی ہمارے دم قدم سے چلتی تھی۔ منڈی میں بھائی غلام احمد کے بچوں کی دکان اور گول بازار میں خوب صاحب کی دکان۔ پان منڈی کے بھائی غلام احمد کا بی زیادہ چلا کہ اس محلہ میں پان خوردوں کی اکثریت تھی۔ حکماء بھی ربوہ کی پہچان رہے۔ حکیم خورشید احمد صاحب تو بہت بعد میں حکمت کے میدان میں آئے مگر آگے نکل گئے کیونکہ کاروباری سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ہمارے دوست اعلم فاروقی کی حکمت تو صرف حکمت چھانٹنے تک محدود رہی اب سنا ہے خوب چل رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد احمد سرسوی کا بیٹا احمد سنا ہے حکمت میں بڑا رواں ہے۔ ربوہ میں سب سے پہلے دو خانہ خدمت خلق کھنڈ قبلہ سید بشیر احمد شاہ صاحب اور بھائی عبدالعزیز دوسری دو خانہ خدمت خلق کے کارکن تھے۔ دونوں





احمد اس کی سہیلی میں برت لے لے کر سے نہایت کامیاب مہربانی ہیں۔ یہ صاحبان ہے۔ پھر ایک اور جزیرہ سنوڑا لے لے اور بہت سی بھائی تھے۔ پندی چھ گئے تھے۔ سب سے سید میں جا بے میں مہر ہر سے توں کا آسمان نہیں ہو۔ (بات پرانی مہربانی اب تو وہ صاحب سے آقا ملاقات رتی ہے سند کے کام میں مستعد ہیں)۔ ان کی دکان کی جگہ اب نوید جنرل سٹور ہے۔ نوید صاحب کے بیٹے دیکھتے ہیں جرمی میں سے اور ہمارے خوب خدمت کی بند نہیں خوش رکھے۔ احزاب جنرل سٹور تو عزا کے ہاسٹ ہال کی وجہ سے زیادہ مشہور ہو۔ اب اطار بھی جرمی ہے ہمیں دعوت پر اس نے بدایا جب وہاں پہنچے تو معلوم ہو چار منز میں سیز جیوں کی بڑھتی پڑی کی ہم معذرت کر کے واپس آگئے، کہ سیز جیوں چڑھنا منع ہیں۔ یہ نہ ہو کہ چڑھتے چڑھتے ویسے ہی چوتھے آہاں پر پہنچ جائیں۔ منڈی میں ہمارے شہر آرتب نے فنیسی جنرل سٹور کھولا۔ آرتب بڑا نہیں اور خاموش طبع رکھا ہے۔ اس کی دکان بھی خوب چلی پھر خدا معلوم یہ ہو اور دکان بیچ کوچ کر کہاں گیا۔ اور اخیر جنرل سٹور والے امین صاحب تو منڈی سے اٹھ کر مین ہمارے پڑوس میں اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئے۔ ہاں وہاں سے پیر مبارک اللہ بخشے ان کا موان اسٹ جنرل سٹور بچوں میں بہت مقبول تھا۔

ہم نے وہ آرتن سٹور کا ذکر تو کیا مگر مجید آرتن سٹور کو بھوس گئے۔ حامانکہ مجید صاحب کے بچے وہاں سے بچوں کے ہم عمر ہی نہیں لٹوئے تھے ہیں۔ بلکہ ان کے پوتے تو ہمیں دادا جان کہا کرتے تھے۔ بجلی کی دکان، وں نے اپنی روایت قائم رکھی۔ یعنی جس طرح بجلی بے اعتباری ہے یہ وگ بھی بے اعتباری رہے۔ ہمارے شہر مجید صاحب احمد الیٹریک سٹور کے نام سے اپنی دکان کھول کر بیٹھے تو ہم نے کہا بیٹے اس پیشہ میں مت قائم کرو مگر سے موت نے فرصت نہ دی۔ جوانی ہی میں گزر گیا۔ نصیر بندہ بھی ہاسٹ ہاں کھیتے کھیتے اب اب برق میں بیٹھ ہے بجلی کے ذکر میں ہم نے بے اعتباری کا ذکر کیا ہے تو اپنے نصیر معضری صاحب یاد آگئے۔ نکاشعرو پڑا پر ہر حرف آخر ہے "یا اللہ العالین کوئی خوشی خاص بھی" سے برق پیدا کی ہے تو پھر واپس پیدا نہ کر۔

رہو کے دکانداروں کی جس خصوصیت کا ذکر ہم نے کیا وہ پھر دہرا رہے ہیں کہ ان لوگوں میں دوسرے شہروں کے دکانداروں میں نمایاں فرق یہ تھا۔ کہ ان کے بارہ میں گاہک کو یقین رہتا تھا کہ وہ سے دھوکا

میں دے رہے۔ کالج کے غیر رجسٹریٹ طلباء سے بڑھ کر ان دکانداروں کے مارو میں نول گواہی ہے۔  
 مکتبہ میں مسکراؤں سے ملے۔ صحت نامہ، شہرے جوہر وکے کادھاروں کی تعریف کی کرتے  
 رہے۔ ایسے دس بہت شادیت جنہیں لوگوں سے شکایت رہی ہو۔ ہمارے شماروں میں سے کٹر  
 طلباء جو عمت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ کالج میں ہم لوگ احمدی اور غیر احمدی طلباء میں کوئی تمیز نہ  
 نہیں رکھتے تھے۔ ہم دوبارہ کینیڈا گئے دونوں بار غیر احمدی طلباء کی ایک معتد بہ تعداد ہمیں دور دور سے منے کو  
 کی۔ احمدی طلباء تو جمعیت کے جلسہ پر آئے ہوئے تھے۔ غیر احمدی طلباء نے محض ہماری ملاقات کے  
 سے سفر کی زحمت ٹھہکی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے۔ اب کے چوبدری محمد علی صاحب بھی تشریف لے گئے  
 تو امریکہ سے غیر احمدی طلباء نہیں منے کے سے آئے۔ تعلیم الاسلام کالج محض کالج نہیں تھا ایک مکمل نسلی  
 یونٹ تھا۔ ان میں سے ایک بچے نے کہا کیا ربوہ میں اب بھی نماز کے وقت دکانیں بند ہو جاتی ہیں؟ ہم  
 نے کہا ہوتی تو ہیں مگر دھڑکاؤ کا رہتا ہے، کہ کہیں کسی کے جذبات نہ مجروح ہوتے ہوں۔ وہ بچے اب  
 بھی ربوہ کے ماحول کو یاد کرتے اور دکانداروں کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ بات کیا کم ہے؟ ربوہ کے دو  
 ایسے دکاندار تھے جن کی اجارہ داری تھی۔ جمال بیکری والے میاں خدا بخش اور خوشی محمد اور کہا یوں والے  
 عبد المنان اگر ان کی اجارہ داری ان کی کوٹائی پر بھی اثر انداز نہیں ہوئی۔ ہم نے امریکہ کے دو باشندوں کو  
 جمال بیکری کی روٹی اور منان کے کہ یوں کو یاد کرتے دیکھا اور خوش ہوئے۔ یہ لوگ اپنے رنگ میں ربوہ  
 کا نام روشن رکھے ہوئے ہیں۔ ربوہ کے خیال رہے جاتے ہیں حالانکہ یہی لوگ ہیں کہ ہمارے کپڑے  
 سینے اور ہمارا تنگ ڈھانپتے رہے۔ ابتداء میں ایک چچا مبردین ہوتے تھے ان کا بیٹا ہمارا دوست تھا۔ آج  
 کل انجن کے کسی دفتر میں خدمت پر مستعد ہے۔ جامعہ میں قبلہ حضرت مولانا مجلس صاحب کے ساتھ  
 رہائش اختیار کی تو پڑوس میں عبدالرزاق صاحب جامعہ کے پی ٹی رہتے تھے۔ ان کے بھائی عبدالستار اور  
 اب، بابا جی نام ذہن سے اتر رہا ہے کیونکہ سب انہیں ہمیشہ ہی بابا جی کہتے تھے۔ بابا جی نہایت مشرق خیز  
 تھے۔ اس باب میں بڑی بے فکری رہتی تھی کہ کپڑا وقت پر اور عمدہ سلاہوا گھر بیٹھے بٹھانے مل جاتا تھا۔  
 عبدالرزاق صاحب نے تو پی ٹی کروانے کے ساتھ اپنے بیٹے عزیز می عبدالرؤف کے نام سے بچوں کی  
 لکھنے کی کا پیار بنانے کا کام شروع کر رکھا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت دے رکھی تھی۔ اب تو

دعا کے بعد چھ ماہ تک رہا۔ بھائی عبد الستار کے صاحبزادے عزیز کی مدد و مددگاروں میں خدمت سہیلہ پر مستعد ہیں اور دہلی کی عید گاہ خاندان صاحب ۱۰۰۰ روپے میں رہائش میں۔ ایک بار ان کی ایک نہایت خوب صورت نظم افضل میں چھپی تو میر نے انہیں داد کا خط لکھ کر بڑی محبت کا جواب آیا۔ اس کے بعد ایک چھپائی ہوئی کتاب لکھی۔

جنت سازوں میں سے بھائی بشیر کا ذکر کسی جگہ ہو چکا ہے۔ بابہ مجھے کا ذکر تو حضرت صاحب نے کسی خطبہ میں فرمایا ہے۔ اپنی وضع کے آدمی ہیں یہ تھے۔ پاؤں سے معدور تھے۔ بہریری کے سامنے ٹٹ پاتھ پر بیٹھتے تھے۔ سردی گرمی میں پریشان نہ ہوتی تھی۔ ربوہ میں سب سے پہلے محمد احمد گفٹ صاحب نے فوٹو گرافی شروع کی۔ محمد صاحب کے صاحبزادے اطہر نے یہ کام جاری رکھنے کی کوشش کی مگر رہ نہ بدل گیا۔ اب تصویر سٹوڈیو والے محمد زین تو میر ہمارے حافظ محمد رمضان صاحب کے صاحبزادے ربوہ والوں کی تصویریں کھینچتے ہیں اور وہ وقت بھی تھا۔ کہ کالج کی تقریبات کی تصویریں کھینچوانے کے لئے ربوہ سے فوٹو گرافر منگوائے جاتے تھے۔ جو توں کی دکانیں تھیں ہی کتنی؟ اب تہ رشید بوٹ ہاؤس والے بھائی رشید ہمارے استاد سولہ ماہ نام احمد صاحب بدولت بھائی کے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد نے ان کا کام خانا میں سنبھالا اور نوکریاں کرنے لگے۔ ربوہ کی پہلی پہلی کپڑے کی دکان حبیب کا تھا ہاؤس والی۔ حبیب اللہ خوب وضع دار آدمی تھے۔ ان کے صاحبزادے مودودی بشیر احمد صاحب یہ کوئی حضرت میاں بشیر احمد صاحب کے دفتر کے ہیڈ کلرک اور ہمارے ”افسر“ تھے۔ سپنہ ابائی وہاں پر ابابا کا کاروبار سنبھال کر بیٹھ گئے۔ انہیں باباجی حبیب اللہ کی ایک صاحبزادی امیری کی پر وینس ہوتی تھیں سعیدہ حبیب۔ ہمارے دو کاندھار بلقہ کے گٹ بھی بچوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ربوہ کا کالج کی متعدد برکتوں میں سے یہ ایک برکت ہے کہ مل ربوہ کی برقی سس پر بھی لکھی سس ہوتی ہے۔ ربوہ کو اب بھی پاکستان میں سو فیصد تعلیم کا جزیرہ کہا جاسکتا ہے۔ لڑکیاں ہوسا لڑکے سب ہی زور تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک مدت تک تو ربوہ میں ایم اے پاس لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ رہی۔

بھائی محمد اسحاق صاحب احمدیہ ماڈرن سنور والے ابتدائی جنرل سنور والے تھے۔ پھر گھڑی سازی پر آگئے۔ وینہ پوارٹی وی بھی بیچتے رہے۔ ان کے داماد ڈاکٹر ظفر اللہ اپنے زمانے میں صاحب کے اور پانچ

کہہ دیتے تھے۔ اب مرید کی کیویورنی سے منسلک میں حساب سے جسے سبک کے باوجود ہمارے  
جیسے شہر تھے۔ بہت محبت میں۔ اس پائی۔ لہذا اب غیب اثر میں رکھی ہے۔ اس کے  
جہاں شہر بھی خلق سے جدا ہیں۔ ربوہ کے دکانداروں یا نوکریات اور ترقی یافتہ  
لوگ بھی مشہور کام پر ہوتے ہیں۔ درجہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ مدتوں پہلے ربوہ کی خدمت  
کی عزت و ریاست اور شہریت کے اعلیٰ اخلاقی معیار پر قائم رکھے۔ آمین۔

## جلسہ سالانہ اور آب خورے

ہم نے جس سستی میں کچھ کھوں دو عجیب سستی تھی۔ آباؤی تہوڑی تھی مگر مصنفوں کا آقا جہان مست تھا۔ جہان کے دس کا تہر کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دن میں ایک کروڑ دردت میں پانچ لاکھ سوئی ہے یعنی اس شہر کی دن کی آبادی میں کیونر یعنی عارضی طور پر سفر کر کے آنے والوں میں اور مستقل قیوم کرنے والوں میں ایک اور میں کا تناسب ہوتا ہے وہ تیز رفتار گاڑیوں سے آتے اور اپنا اپنا کام کر کے اپنے اپنے مستقر پر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم جس سستی کا ذکر کر رہے ہیں اس میں لوگوں کا آنا جانا بھی اسی حساب سے ہوتا تھا۔ مصنفوں میں اور مشیوں میں ایک اور میں کا تناسب تھا۔ ابان یہ تھا سب سال بھر قائم رہتا تھا سال کے آخری مہینے میں تو مہمانوں کا وہ اثر دھام ہوتا کہ سکونت کی سہولتیں ہر سال کم بڑھ جاتیں اور کینوں کو وسیع مکانک کا اجتماع کرنا پڑتا۔ وجہ یہ تھی اس سستی میں سال کے سال ایک سالانہ جلسہ ہوتا تھا جس میں وہ دور دور سے شرکت کے لئے آتے تھے۔ دمبر کا مہینہ پنجاب میں خاصی سردیوں کا مہینہ ہوتا ہے اس لئے مہمان آتے تو اپنا اپنا بستر ہمراہ لے کر آتے تھے۔ جلسہ کے منتظمین ان کے سونے لیٹنے کے لئے پرالی کا فرش بچھا دیتے اور وہ لوگ اسی پر سکر سٹ کر آرام پاتے ان کو جلسہ میں شرکت کرتے رات کو چین کی نیند سوتے۔ چھوٹے بڑے فرش زمین پر لگن ہو کر سوتے۔ کھانے کے لئے بھی برتن کہاں سے آتے منتظمین مٹی کے عارضی برتن بنوا رکھتے پائے جن میں سائن ڈال جاتا اور آبخورے جن میں پانی پیا جاتا۔ مدتوں بعد یورپ میں ایک یورپی بزرگ سے ملاقات ہوئی انہوں نے ایک حیرینت سنبال کر رکھی ہوئی تھی۔ کہنے لگے ایک نادر چیز دکھاؤں؟ تہرک ہے۔ دیکھا تو مٹی کا ایک آب خورہ تھا۔ کہنے لگے جب میں پہلی بار جلسہ پر ۱۹۳۷ میں گیا تھا تو نیشانی اور تہرک کے لئے آیا تھا۔ سم نے بھی اس آب خورہ کو دیکھا اس میں وطن کی مٹی کی خوشبو آئی۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں پانی پیتے ہوئے وہ ٹھنڈک اور تازگی محسوس نہ ہوئی جو وہاں جلسہ کے آب خوروں سے مخصوص تھی مگر یہی کہہ سکتے کہ وطن کی مٹی تھی اور جانے اس رض مقدس کے کس "حسن کوڑہ گز" نے اس کو بنایا تھا بعض

یہیں اس طرح کیا گیا کہ جہاں میں نور کی قدر، قیمت، وقت گزرنے کے بعد متعین ہو جاتی ہے۔ آپ نور کو عارضی شہادت کے تحت بناتے جاتے تھے لیکن اس پر مبنی دوست کی عقیدت نے اس عارضی چیز کو ایک دوسرے ایسا چھوٹی چھوٹی چیزیں جس کی چھوٹی میں رہیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہمیں یاد رہے جس قدر ہو جاتا تو سمیٹنے آنوروں کو خدا خدا کر میں پر ہونے اور ان۔ ہمیت پھرتے تھے یہاں تک جانتے تھے کہ اس کا مصرف ختم ہو چکا ہے۔ اگلے برس نئے آپ نور نہیں ملے۔

بہیں بچیں گی سے جلسہ سالانہ کے موقع پر مہمانوں کی خدمت کی توفیق ملتی رہی۔ چھوٹے تھے تو نصف پالی پلانے کی خدمت ملتی اس سے جلسہ سالانہ کے ساتھ ہمارا تعلق آب خوردن کی وجہ سے قائم تھا۔ دراصل یہ بونے تو کھانا پیش کرنے کی خدمت ملنے لگی۔ چیش کرنا کیا ہوتا یہ تھا کہ پالٹی میں سارن اٹھا کر مین پر ٹیٹھے دوئے مہمانوں کی قطار تک پہنچتے اور باری باری ہر ایک کے مٹی کے پیالے میں سارن یا دس جو چھ بھی ہوتا وہ دھندلے سے می ڈالتے جاتے۔ ختم ہو جاتا اور مزید کی ضرورت ہوتی تو مہمان پیار سے آواز دیتے کہ بیٹا سارن چاہئے۔ اس خدمت میں اتنا ظف آتا کہ اب تک اس خدمت کو کرتے ہیں۔ رندیں تندرہوں میں بکتیں اور مہمانوں تک گرما گرم پہنچاتی جاتیں۔ انگر خانہ سے مہمانوں کی فرو دگا ہوں تک انہیں کیسے لیا جاتا تھا ہمیں اس کے بارہ میں تنہا ہی پتہ ہے کہ نوکروں کے نوکرے خدام سروں پر اٹھا کر لاتے اور فرو دگا ہوں کے پاس آکر رکھ دیتے وہاں سے ہم لوگ جو خور و سال تھے روٹیاں اٹھا اٹھا کر اندر دے دیتے تاکہ دیتے در کھانے کے وقت مہمانوں میں تقسیم کرتے۔ کچھ بچے روٹی تقسیم کرتے کچھ سارن۔ جو بہت چھوٹے ہوتے انہیں پانی پلانے کی ڈیول سوئی جاتی۔

طرحہ سالانہ سے بہت پہلے محلوں میں انتظامات شروع ہو جاتے کہ کون کتنے مہمان اپنے گھر میں ٹھہر سکتا ہے، لوگ باگ بڑے اخلاص کے ساتھ مہمانوں کے لئے اپنے گھروں کو پیش کرتے، درمیزی تنظیم دروس کو مطلع کر دیتے کہ ہمارے ہاں اتنے کمرے ہیں اور ہمان کمروں میں سے اتنے کمرے مہمانوں کی خدمت کے لئے پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے گھر کا عالم یہ تھا کہ ایک بڑا کمرہ تھا اور ایک جیونہ سا کوٹھڑی نہ کمرہ۔ ساتھ میں ایک چھپرہ سا تھا جسے باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا بعد میں سڑک کے رخ ایک کمرہ اور بن گیا جسے ہم گوگ بیٹھک کہا کرتے تھے۔ اس ڈھائی کمرہ والے مکان میں اللہ کے

فضل سے ہم سارے کی ابا ہمارے پھوپھو پھوپھی جی بھائی جان محمد احمد سارے دادا دادی سب کی سائی رہتی تھی۔ جسہ کے لئے سب دن ایک بڑے کمرہ میں سمٹ جاتے جینٹک ن مہمانوں کے سے وقف کردی جاتی جو جمعیت کے انتظام کے تحت ہمارے ہاں قیام کے لئے آتے تھے۔ ہمیں یاد ہے مرزا عبد الرحیم سیک صاحب کا خاندان ہمارا مہمان ہوتا تھا۔ پھر بابا برکت علی صاحب برما سے بھی آتے رہے۔ یہ مہمان ن مہمانوں کے علاوہ ہوتے تھے جو جلسہ کے موقع پر چنگاٹکیاں اور راہ پنڈی کے اور علاقوں سے ہمارے ہاں تشریف لاتے۔ بھائی فیض علی خان چنگوی بھائی بہایت اللہ چنگوی یہ سب لوگ اپنے اپنے خاندانوں سمیت آتے اور جلسہ کے دنوں میں خوب رونق دیتی۔ جسہ گاہ ہمارے گھر سے بالکل قریب پڑتی تھی تعلیم الاسلام کالج کے میدان میں۔ بیٹوں سے حاضری سنیدیم سنا دیا جاتا اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دو تین سیزھیوں والے پشتے بنائے جاتے اور ان پر کڑی کے بڑے بڑے شہیر رکھ کر بیٹھنے کی جگہ بنادی جاتی وہ زمانہ تھا کہ آؤ ڈیسکر نئے نئے آئے تھے اس لئے ان کا انتظام بھی ہوتا تھا مگر جسہ گاہ اس طرح بنائی جاتی تھی کہ لاؤ ڈیسکر کے بغیر بھی آؤ اس سب لوگوں تک پہنچ جائے۔ اس زمانہ میں پچاس ساٹھ ہزار آدمیوں تک آؤ پہنچتا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا اب وہ دن آگئے ہیں کہ پانچوں بر اعظموں میں بیک وقت امام کی آؤ نشر ہوتی اور پہنچتی ہے۔

وہ رحمن بابا جی برکت علی بری کا ذکر ہوا یہ برما کے رہنے والے تھے اور ہمارے ابا جب برما میں مسیح تھے تو ان کی تبلیغ سے احمدی ہوئے تھے۔ ابا جی بتایا کرتے تھے کہ میں ان سے بہتر اکبتا کہ امام مہدی کے آنے کے تمام نشان ظاہر ہو چکے مگر ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر نشان کو ظاہر میں پورا ہوتا دیکھنا چاہتے تھے کہ ہاتھ اور کان گز بھر کے ہو جائیں گے جو کچھ انہوں نے اپنے علماء سے سنا ہوا تھا انہیں یہ صورت ظاہر نظر نہیں آتا تھا۔ ابا کہتے ہیں ایک بار وہ رنگوں سے کوئی دو تین سو میل کے فاصلہ پر واقع کسی شہر خاں آباد لے گئے۔ ابا جی کو اللہ تعالیٰ نے تدبیر بھائی۔ آپ نے انہیں فون کیا اور کہا بابا جی میں رنگوں سے بات کر رہا ہوں اور صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے کان اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ آپ تین سو میل سے میری بات سن رہے ہیں۔ اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ بابا جی نے واپس آتے ہیں ابا جی کو بلا بھیجا اور بیعت کر لی۔ یہ بڑا فکھ خاندان تھا پھر تو ان کے بیٹے محمود صاحب ہماری ایک منہ بولی بہن پاعزیزہ سے بیاہے گئے۔



یہ تو میری عمر میں ایک عمدہ حادی خوش آمدت میں (وہابی برکت میں) ہر ایک کا ہر ایک کے لئے  
 ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک عمدہ حادی صاحب کا خاندان ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک  
 مہمانوں کے قبضہ میں صاحب کا یہ عہد خیمہ کا امر گرائی میں چلی۔ رجب کے منام کے تحت  
 ہمارے ہاں قیام کے لئے تشریف لے گئے۔ مہمند رنی کا وہ سید عمر جرنی شائری و روتی میں مل  
 گیا۔ وہ میں میں جرنی میں مراد عبد الرحیم یک شروع شروع میں رہے۔ ان کی قیام فرماتے رہے۔ یہ  
 رتیں جس کے ساتھ تھیں تھیں۔ دوسرے ملک میں ان کا ایک انی سامونوہ نظر آتا ہے مگر وہ  
 راتیں کہاں سے وٹ کر آئیں؟ ہر ملک میں جلسہ ہونے لگتا ہے تو وہاں کے امیر دوستوں سے کہتے ہیں  
 کہ ہمارے آئے واسے مہمانوں کے لئے اپنے اپنے مکانوں میں جد پیش کریں وٹ کرتے ہوں گے  
 اس طرح نئی خاتم اور نئے حقائق جنم لیتے ہوں گے جو پہلے سے موجود احمدیت کے رشتہ میں مزید  
 ستواری کا موجب بنتے ہوں گے۔ اب تو جو عت اللہ کے فضل سے آتی بڑھ گئی ہے کہ ہر ملک میں ایک  
 ایک خاندان کے کئی کئی جاننے والے اس ملک کے مرکز میں موجود ہوتے ہیں مگر وہ چار برس پہلے جرمنی  
 میں جو نظارہ دیکھنے میں آیا وہ بھی عجیب نظارہ تھا کم و بیش پچاس ہزار آدمی جس پر پہنچے سوئے تھے۔  
 فرینکفرٹ ورمین ہائم ورمینڈر برگ کی پنی آبادی تو اس قدر نہیں کہ اتنے مہمانوں کو فرو دگا میں فراہم کر  
 سکتی مگر ہاگ سا گئے ورو کوئی دقت ہوئی ہو تو ہوئی ہو کم از کم رہائش کی کوئی دقت نہیں ہوئی نہ کھانا فراہم  
 کرنے میں کوئی دشواری ہوئی۔ ہم نے ایک جرمن دوست کو بتایا کہ مہمان داری کی روایت ہماری  
 جماعت کی دیرینہ روایت ہے وہ کہنے لگے روایت اپنی جگہ زمینی حقائق اپنی جگہ آخرا تھے لوگوں کی ہائی  
 گھروں میں کہاں سے ہو گئی ہوگی وہ جرمنی گئے تو وہاں آکر بتایا کہ انہوں نے وہاں کئی ایسے دھوکے سے  
 انگٹو کی ہے جن کے گھروں میں جنسی احمدی مہمان ٹھہرائے گئے تھے۔ وہاں خاندانوں نے طبیب  
 خاتراں کی مہمان داری کا فریضہ سر انجام دیا۔ ہماری ہستی تو خیر چھوٹی تھی ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر  
 ان سبوں میں تو ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بڑا مسئلہ ہے جرمنی میں جس جگہ ورمین ہائم کی مارکیٹ میں بنتی ہے جو  
 فرینکفرٹ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے مرکز فرینکفرٹ ہے مگر لوگ دور دراز سے وہاں دقت پر  
 پہنچتے ہیں۔ اگرچہ ہم جیسے کوئی قدم لوگ بعض تقریریں نہ سنا چاہیں تو دیر سے پہنچنے کا بہانہ کر سکتے ہیں۔

کس کی کوتاہ قدمی۔ ہم سے جاں بوجھ کر اپنے عزیز دوست اور شہر صبیحہ مددگاروں کی جہنم آفرین  
وقت رستہ میں نہ روکا تھا اور نہ دیا تھا رستہ میں دیر نہ تھی۔ (جو بد راہ نہ سیر کر) جو وہ جس پر توجہ  
جاتے ہیں وہ پھر سارے وقت وہیں گزارا کرتے ہیں اس سے متعلقین کو اس کی مسروریت کا ہنسا ہنسا  
پڑتا ہے۔ حسد نہ کھانا کھا یا نمازیں پڑھیں دوستوں بزرگوں سے میل ملاقات کی کہیں بھر کے بعد  
دوستوں کے گھر جانے کا موقع بھی کیسے ہار ہی آتا ہے۔ لندن میں بھی یہی عام ہے کہاں مرزا آجہاں  
منقورہ اسلام آباد۔ غائبانہائی فصد ہے۔ ہم نے پہلی بار یہ جگہ دیکھی تو بھیڑوں کا گلدہاں چہرہ تھا  
اب شیخ محمد کی بھیڑیں وہاں تھیں وسیع و عریض جیموں میں سارا انتظام تھا۔ پھیری کی بھی لمبی پیرکوں میں  
مہمان نمبر ہوئے تھے سمسدہر سے ملاقات ہوئی ہم نے بہتر اچھا سے بہتر چھوڑ کر اپنے ساتھ  
ندن سے جائیں گے کہنے کا جلسہ کی پیرکوں میں ٹھہرنے کا جو مزہ ہے وہ گھر کے آرم میں کہاں اس  
سے ہماری خواہش کے باوجود درمیان نہ ہوا۔ جلسہ کے بعد بہت ہم اسے نندن کے کچلے کوچوں میں گئے  
سے پھرے اور ہم تو ضلع بھی اتنی ہی کر سکتے تھے کیونکہ ہم خود سوئیڈن سے مہمان کے حور پر گئے ہوئے  
تھے۔ امریکہ کا جلسہ دیکھا۔ وہی عالم تھا لنگر جاری تھا لوگوں کی رہائش بہت ہونٹوں میں تھی۔ ہم تو خدا  
صاحب کے ہاں متمکن تھے مگر باقی دوستوں سے جس سے پوچھا اس سے یہی کہانیاں سنیں کہ ہاں میں ہوں  
فدا ہونٹوں میں ہوں۔ دراصل واشنگٹن میں مسجد کے آس پاس رہنے والے اتنے احمدی لوگ ہیں ہی نہیں  
جو اپنے مکان پیش کر سکیں اگر دور دوری ٹھہرنا ہے تو کیوں نہ قریب کے مونوں میں ڈیرہ لگایا جائے اور  
اس میں جماعت اپنا حصہ ادا کرتی تھی تاکہ جماعت کی میزبانی کا فرض ادا ہوتا رہے ہمیں دوق سے تو  
علم نہیں غالباً ہونٹوں والے بھی جلسہ کے مہمانوں کے لئے خصوصی رعایت کا ملان کرتے ہیں اپنی جماعت  
کا فطرت دکھائیے وہ آپ کو رعایتی نرخ پر رہائش مہیا کریں گے دور کی رہائشوں سے آنے والے یہی کرتے  
ہیں اور اسی میں آسائش بھی ہے۔ کینیڈا میں بھی ہم نے یہی دیکھا لوگ گھروں میں ٹھہرتے ہیں مگر جو  
لوگ زیادہ دور نہ ٹھہرنا چاہیں وہ ہونٹوں میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ ب کے جلسہ انٹرنیشنل سینٹر میں تھا جو احمدی  
لوگوں کی رہائش گاہوں سے دور ایک جگہ ہے اس کے قریب قریب ٹھہرنے کی جگہ ملنی مشکل تھی۔ ہمارے  
دوست مرزا انس احمد بھی کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پر اپنی بیٹی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے ابھی ڈاکٹر

عنایت اللہ راجہ قریب کے ایک سائل میں تھے مہاراجہ سوجائے اور جلسہ کی تاریخ کا موقع ہاتھ سے نکل جائے۔ صورت خوب تھی جسے وہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ایک اور میر صاحب سے ہمارے اگلے برس بھی یہی جلسہ ریزرو کروائیں۔ رُئی سے آسائش رہتی ہے اور دیگر ضروریات بھی بطریق حسن مہیا ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر ہم سوچتے ہیں یہ لوگ کھانا اُحلانے کے لئے حوکاندے لگھڑیں اور چٹنیں مہیا کرتے ہیں ان میں اور ہمارے آنکھوں اور پیالوں میں کتنا فرق ہے۔ کاندھ میں ٹی کی خوشبو ڈھنسیں پیدا ہو سکتی؟ ہمیں ہمارے آب خوردہ ہی یاد آتے رہے۔ اور جس جلسہ پر جا میں وہاں انہیں کو یاد کرتے ہیں۔ مٹی کی کشش ہے یا جلسہ کی برکت ہے یا کیا ہے؟ آپ جو چاہیں ملن ردوس کرتے رہیں۔ ہم پرانوں کو دی ستمہ پرائیڈا چاہئے۔

-----



## • مالک رام کی احمدیت

ادوار کے جن نامور محققین نے ادوار کی تاریخ و عمر کے متوش مرتب کئے ان میں کا ایک نام جناب مالک رام کا ہے۔ غالب کے بارہ میں ان کی تحقیق و مستند کا درجہ صاف ہے۔ غالب کے احوال و آثار پر ان کی تحقیق کا حوالہ دئے بغیر کوئی محقق ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ ان کی زندگی میں اور ان کے نقاب کے بعد ان کے مذہب کے بارہ میں بہت رد و قدح ہو رہی ہے۔ ان کے دور تانے و بانے کے عقیدہ کے برعکس انہیں مسلمانوں کی طرح تجسیم و تکفین کا مورد کرنے کی بجائے ہندو انا رسو کے مطابق مذرا آتش کرایا۔ خیر اس سے مرنے والے کو کیا فرق پڑا کہ سے تو خاک سونا ہی تھا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے عقیدہ کے بارہ میں آج بھی وہی بے یقینی کی کیفیت جاری ہے اور کوئی شخص جرات کے ساتھ بات کرنے کی جرات نہیں کرتا۔

اس قضیہ کی ابتدا تو اس وقت ہوئی جب جناب مالک رام نے ام جماعت احمدیہ حضرت حلیفہ المسیح الثالثی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنا کوئی اسلامی نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضرت صاحب نے فرمایا اس نام یعنی مالک رام کے نام میں کوئی مشرک کا نہ عنصر موجود نہیں اس لئے اس نام کو برقرار رکھیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ سلسلہ کے ریکارڈ میں (مشترک جدید کے دفتر اول میں) ان کا نام کی طرح درج ہے۔ مالک رام صاحب اسی نام سے جانے جاتے رہے۔ بعد کے زمانہ میں انہوں نے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خفا کو قہر رکھا اور غالباً حضرت صاحب کی اجازت سے قائم رکھا۔ کیونکہ قائم الحروف کے علم کے مطابق ایسی مثال قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک پیروکار کی موجود ہے کہ جس نے اپنے ایمان کو اخفاء میں رکھا اور فرعون کو مشورہ دیا کہ وہ خدا کی پرستش کرنے والے لوگوں کو یذائمیں نہ دے۔ یہ سنا ہے مالک رام صاحب نے یہی سوچ کر اس اخفاء پر استقلال اختیار کیا ہو۔ میرے اپنے علم اور تجربہ کے مطابق انہوں نے اپنے احمدی دوستوں سے کبھی اپنی احمدیت کو چھپایا نہیں لیکن دوسروں میں غیر ضروری طور پر اس کا اعلان بھی نہیں کیا۔



[illegible]

مالک رام کی دینی خدمات کے اعتراف میں دینی دنیا کے دستور کے مطابق ۱۹۷۷ء میں ایک رمضان رمضان مالک کے نام سے شائع کیا گیا۔ دوران کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کی پہلی جلد میں جناب سید علی جو دزدی کا ایک مضمون کے مذہبی علوم سے شغف کے بارہ میں شائع ہوا۔ اس میں دو لکھتے ہیں "مالک رام کی مذہبی قیام کی ہندو برہمنوں کی طرف آغوش داری سے شروع ہوئی۔ پھر چار برس کے س تک گوروواروں میں گوروپانی کا ربانی پیغام سننے لگے۔ ہندو دھرم اور آریہ سماجی اصلاحی تحریک پر کتابیں پڑھیں۔ وزیر آباد کے دوران قیام میں ملک احمد حسن رہنمائی سے یارانہ ہو گیا۔ یہ ہم جماعت بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کا اردو اور فارسی کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ یہ اکثر مالک رام کو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مذہب اسلام کے بارہ میں ایک کتاب مالک رام کے ہاتھ میں دیکھی۔ ملک احمد حسن خود جماعت احمدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے احباب کے پاس اسلامی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ انہوں نے کئی کتابیں مالک رام کو پڑھنے کو دیں۔ مالک رام کا ذوق تحقیق و تجسس بڑھتا ہی گیا۔ ان کا یہ مطالعہ بعد میں "آریہ عزت" کی ادارت کے زمانے میں بھی ان کے کام آیا اور ایسے بھی مذاہب کے تقابلی مطالعے میں مفید ثابت ہوا۔ مالک رام کی اسلامی معلومات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اس سلسلے میں قادیان کے خلیفہ جناب مرزا بشیر احمد محمود احمد (صحیح اسم گرامی مرزا بشیر الدین محمود احمد ہے) سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ قادیان گئے تو وہیں چوہدری محمد ظفر اللہ خاں سے بھی تعارف ہوا اور وہ بھی ان کی ذہانت اور وسعت نظر کے گرویدہ ہو گئے۔ جب بعد کو اخبار بھارت مانا سے علاحدہ ہوئے تو وہ ظفر اللہ خاں کی طبی پر شہد بھی گئے۔ وہ وہاں ان کے مہمان رہے اسی زمانے میں انہوں نے ایک دوست سید وار

شاہ بخاری سے قسطنجید کے ستر دیر سے ترجمے کے ساتھ پڑھے ("ڈاکٹر مالک" مضمون "ارغاب مالک" پہلی جلد نئی دہلی ۱۹۳۲ء ص ۳۲-۳۳)۔

رقم سرفہ نوادے کے نام سے اسے "صورتیں الہی" کے عنوان سے خاص فی جہ کتاب نہیں تھی اس میں پہلا مضمون ہی ملک احمد حسن صاحب داران کے ساتھ خلق کے بارہ میں تھا اور میں نے اسے کی بنیاد پر اغضال، ربوہ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ میر خیال تھا کہ یہ ملک احمد حسن صاحب مشہور شاعر حسن رہتا سی میں لیکن بعد میں قہر موانا محمد احمد صاحب مجلس مدظلہ نے بتایا کہ یہ ملک احمد حسن اور برہم تھے لیکن سب بات کی تصدیق فرمائی تھی کہ احمدیت سے مالک رام کا تعارف انہیں کے ذریعہ ہوا اور انہیں قبول حق کی توفیق ملی۔

محولہ بالا ارغاب میں ایک مضمون ڈاکٹر محمد قمر کا ہے جس کا عنوان ہے "مالک رام میرا دوست اور انسان دوست"۔ ڈاکٹر قمر لکھتے ہیں "اس وقت مالک رام کا ادبی شغف نہ صرف اردو فارسی عربی بلکہ قرآن سے بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ اس نے اسلام اور اس کے مختلف فرقوں پر خاص توجہ کی۔ اس ضمن میں اسے حمد یہ تحریک سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی یہاں تک کہ وہ جب ایک مرتبہ مرحوم حضرت مرزا بشیر الہی میں محمود احمد کی، نور میں آمد پر انہیں ملے گیا تو اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ہم دونوں حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۔۔ مالک رام تقریباً ایک گھنٹہ تک قرآن کے مطالب اور اسلام کے مختلف موضوعات پر حضرت صاحب سے باتیں کرتا رہا اور میں صرف خاموشی سے سنتا رہا۔۔۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہے" ("مالک رام میرا دوست اور انسان دوست" ایضاً صفحہ ۸۶)۔

کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے جو "مالک نامہ" مرتبہ کیا اور دلی سے شائع کیا ہے اس میں ڈاکٹر جگن ناتھ "زاد" مالک رام" کے عنوان سے لکھتے ہیں "اب ۱۹۶۳ء میں میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا 'ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا میں نے ان سے درخواست کی انہوں نے قبول کر لی۔ اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورہ فاتحہ شروع کرنے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں لھنے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا کلام پاک کا احترام تو مجھے ابتدا ہی سے گھر میں سکھایا



تیسرا نشان مالک صاحب کے یہی عقیدہ کی تہا اس حزم سے کہ "سرو قد با صلتہ سے قبل  
 ان کے راجہ مذہب سے آگے نہ بڑھیں اور مالک صاحب کے نام پر چہرہ زین برائے حسین  
 ریدی کی (۱۷۹۶ء ص ۶۹)

حیدر پاشا نے کسی "مالک نامہ" میں لکھا کہ "میں نے مالک صاحب اور انہی آفتاب در سمان" لکھے  
 ہیں۔ (یہ صفحہ ۲۴۲) ناموں کے سلسلہ میں شیخ منظور لکھی صاحب "در دستار" سے بھی سلسلہ دراز  
 و شب میں اپنی ماقوت کا حال لکھا ہے کہ "اتنے میں ایک بچے نے کمرے میں آکر پیسے مالک صاحب کے  
 ساتھ چھپیں کہیں پھر کتابوں سے بے تکلفی کرنے لگا مالک صاحب نے بشری کو آواز دی کہ آگے  
 صاحبزادے کو لے جا۔ بچوں نے دم رکھنے میں ان کی وسیع الشرب کو دخل ہے "قرب سلسلہ مالک  
 اور مالک بشری" (سلسلہ در و شب صفحہ ۱۴۳)۔ مالک صاحب کے صاحبزادوں نے "تذکرہ سیدان چند کے یک  
 خط کے جواب میں ناموں کی توضیح یوں کی "والد صاحب نے کہا تھا کہ ناموں میں ایک تسلسل سے در  
 و شب "تذکار" (در صلی شفق) ہے اور ان سورن کی شعاعوں سے "قرب تک ہم بشری جیسے نام قبول کر سکتے  
 ہیں۔ سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے پر پیدا ہوا تھا سلسلہ کے معنی ہیں امن عبرانی میں شادوم  
 امن ہے۔ اگر اتفاق سے ہمارے نام مسلم نام ہیں تو ان کے یہ معنی نہیں کہ ہم سلسلہ ہیں۔ اوشا کی  
 ترکیبوں کو بشری اور ترکیب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور بشری کی دو ترکیبوں کا نام مہر النساء در میرا ہے۔ اس  
 طرح ہمارے گھر میں دو بشری ہیں" (مکتوب بنام ڈاکٹر گمان چند مورخ نے جون ۱۹۹۳ء)۔

دارالمصنفین عظیم عرژہ کے جناب ضیاء الدین احمد صلاحی کا مراسلہ بعنوان "مالک صاحب کا مذہب" :  
 میرے کانوں میں بھی اس کی جھک پڑی تھی کہ ان کو قادیانی کہا جاتا ہے اسی سے کئی بارچہ ہا کہ ان کے دین  
 و مذہب کے بارہ میں ان سے براہ راست دریافت کروں مگر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ان کی  
 وفات سے دو تین برس پہلے ایک دفعہ کچھ اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں تو میں یہ عرض کر رہی تھیں کہ آپ  
 کے عقیدہ و مذہب کے بارہ میں عجیب عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں۔ فرمایا جی ہاں میں بھی سنتا ہوں چہ  
 لوگ مجھے قادیانی کہتے ہیں اور بھی باتیں میری نسبت کہی جاتی ہیں خیر لوگ جو بھی کہیں مجھے اللہ  
 تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مجھے یہ حسد دیگ۔ اس سے یہ خیال ضرور

ہے کہ وہ قادیانی نہیں تھے (۲۰ مئی ۱۹۸۹ء میں ۹۳)۔ اس بات سے جناب ضیاء مدین محمد نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ان ۱۵ قادیانیوں سے ہے۔ رقم خرافہ۔ جماعت احمدیہ کے معاملہ سے قادیانیت کی باوثوقی سے کہہ سکتا ہے کہ مالک رام کا یہ فترو حق اس کے ہمراہ برہنہ ہے کہ "تہذیب قادیانیت" سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔ "اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کہہ" اور لکھنؤ میں رہا جماعت احمدیہ کے علم کلام کی خصوصیت ہے۔

اسی مضمون میں ڈاکٹر عین چند جین نے غیسویں نمبر پر اپنے ایک مراسلہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے بعض باتوں کا تجزیہ کیا ہے۔ "نہایت میں" مالک رام صاحب سے متعلق میرے مضمون کی شرعت کے بعد مجھے دو خطوط ملے جن میں مالک رام کی احمدیت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اپنے ۲۳ فروری ۱۹۹۳ کے مکتوب میں ترقی اردو بورڈ کے شیخ سلیم احمد نے مجھے لکھا کہ ایک ہارسید برکات احمد مرحوم (عرب مالک میں سابق سفیر ہند) کے ساتھ امیر جماعت قادیان ان کے گھر آئے جب آخر اندر گرجانے لگے تو انہوں نے کہا "مالک رام صاحب کے یہاں جا رہا ہوں" سید برکات احمد قادیانی تھے شیخ سلیم احمد نے برکات احمد سے پوچھا کہ کیا مالک رام بھی قادیانی ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ "دوسرے خط کا حوالہ درج کرنے سے قبل میں سید برکات احمد صاحب کا تعارف کروا دینا چاہتا ہوں۔ سید برکات احمد دہلی کے مشہور خانوادے سید شفیق احمد اور بیگم شفیق کے صاحبزادے تھے ان کی پیشہ ورانہ بیگم نسیم سعید ہمارے ہاں کی مشہور مضمون نگار ہیں اور سسر کے خریج میں ان کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ سید برکات احمد تقسیم ملک کے وقت پاکستان نہیں آئے بلکہ وہیں دفتر خارجہ سے منسلک رہے اور سفیر کبیر کے عہد سے ریٹائر ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود حضرت خلیفۃ المسیح الرابعیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی کتاب مذہب کے نام پر خون کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سید برکات احمد کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جناب ڈاکٹر عین چند نے جس دوسرے خط کا حوالہ دیا ہے وہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ۱۹۷۳ میں یاس کے بعد کے ایس گاہ (سابق تھیٹرال گاہ) مسلمان ہونے کے بعد خالد طیف گاہ (دہلی آئے)۔ رستوگی ان سے ملے تو گاہ نے کہا "سند (کذا) میں لکھا ہوتا ہے میں ہندو تھا اور

موسٹر مالک رام اسی تک قادیان سے رہے۔ ستوں نے جب مجھے مالک رام کے قادیانی ہونے کی بات لکھی  
تھی میں نے بعد میں ان سے انھیں مذہبی قادیان سے رجوع کیا۔ وہ ان سے بھی تصدیق ہوئی۔

ڈسٹرکٹ چند مزید ہتھیے ہیں میں نے ’رمضان مالک‘ میں مالک رام کی سوانح کو بہ نظر غور یہاں ۹۳۶  
سے کچھ پہلے مالک رام قادیان گئے اور احمدیوں کے ضیغہ جناب مرزا بشیر الدین محمود سے ملاقات کی۔  
وہیں چودھری محمد ظفر اللہ خان سے ملاقات ہوئی اور ظفر اللہ خان ان کی دعوت نظر کے رویدہ ہو گئے۔

۱۹۳۶ میں وہ ظفر اللہ خان کی دعوت پر شملہ گئے اور انہیں کے مہمان رہے۔ ۱۹۳۸ میں ظفر اللہ خان  
حکومت ہند کے کامرس اور ریوے کے مسر تھے مالک رام نے انہیں خط لکھ کر کسی مناسب ملازمت کی  
درخواست کی۔ ظفر اللہ خان نے انہیں حکومت ہند کی مصر کی اسامی پر مقرر کر دیا۔ ظفر اللہ خان قادیانی تھے

کیا وہ مالک رام کی اس سے سرپرستی کرتے تھے کہ ان کی رائے میں مالک رام قادیانی تھے؟“ (۷۱  
زبان ۱۲۲ اپریل ۱۹۹۲) یہاں پھر راقم الحروف کو کچھ کہنا ہے۔ چودھری انور احمد کابلوں نے اپنے محسن

سر ظفر اللہ کے بارہ میں ”ظفر اللہ خان میرا مربی“ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ وہ اس وقت چودھری  
صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری کے طور پر ان کے ساتھ یورپ جا رہے تھے۔ لکھتے ہیں کہ ”یورپ جاتے

سوئے وہ اور سر ظفر اللہ سکندریہ میں رہے جہاں حکومت ہند کی تجارتی سفارت تھی۔ وہاں انہیں کمرشل قنصل  
کے علاوہ جناب مالک رام بھی ملے جو احمدی تھے اور چودھری صاحب نے کچھ وقت ان کے ساتھ گزار

مالک رام کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں چودھری صاحب نے مالک رام کو والدہ کا بہت خیال رکھنے کی  
تعلیم کی اور انہیں اسلامی تعلیمات یاد دلانیں۔ ان کی والدہ اگرچہ ایک ہی گھر میں ان کے ساتھ رہتی

تھیں مگر ان کی رسولی عیحدہ تھی کیوں کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہیں کرتی تھیں۔“ (ظفر اللہ  
خان میرے مربی۔ صفحہ ۲۵)۔ میں اس کا حوالہ پہلے الفضل میں اپنے ”مالک رام کا ذکر کرنا“ والے

مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔

ایک سو نمبر پر پرنسپل محمد الدین احمد کے مضمون کا حوالہ ہے۔ عنوان ہے ”مالک رام کچھ ذاتی تاثرات۔“  
لکھتے ہیں ”میں نے ایک بار انہیں لکھا کہ میرے کام وقت پر نہیں ہوتے سیمینار کا مقصد آخری رات لکھتے

ہوں اور ریڈیو کی تقریر کا کچھ حصہ شرین اور کچھ شرجہ پہنچ کر مکمل کرتا ہوں۔ بہت سے کام یا تو ہوئے نہیں یا

تصور۔ روایت میں۔ بولی ترکیب بتائیے۔ جو اب حسب معمول قرار آیا۔ مہوں نے کبھی آپ کے مرض کا علاج نہ دیا۔ وہ نہ نہ کر، آپ کا کام ہے۔ آپ نہ روئیں یا بندگی سے وقت بے یار و مددگار بہتر ہے اگر یا پھر، وقت کی ندرتیں مسجد جا کر باجماعت اذکریں۔ میں حیرن ہوا کہ یہ مشورہ مالک رام دے رہے ہیں یا بہار کے مشہور محقق اور اہل حدیث امام مولانا عبدالحکیم رامی ("آج کل")۔ گوشہ، مالک رام۔ بریل ۹۹۳ ص ۴)۔

ست بیسویں نمبر پر پروفیسر محمد اسلم صاحب کے مضمون "ذکر، مالک رام" کا حوالہ ہے۔ لکھتے ہیں "ایک بار مالک رام کسی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کابل گئے سوئے تھے۔ وہاں دو تین مسلمانوں نے ان سے کہا کہیں وہ پردہ مسلح تو نہیں ہو گئے۔ انہوں نے کہا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟۔۔۔ مالک رام صاحب کے گھر میں آیت انکری اور قرآنی آیات کے قطعات آویزاں تھے جناب خالد شمس الحسن نے ایک ویڈیو کیسٹ تیار کی ہے جس میں ان قطعات کی بھی عکاسی ہے۔ ان کے ڈرائنگ روم کا، حوالہ خالصتنا اسلامی تھا اور اس میں ہندو معشرے کی کوئی معمولی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔۔۔ جو مسلمان انہیں ملنے آتے تھے ان کے لئے جائے نماز بھی رکھی ہوتی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کا معاملہ خدائے عظیم و برتر کے ساتھ ہے۔ قرآن حکیم کی سورہ الفتح کی پچیسویں آیت میں یہ ارشاد ہے کہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں موجود ہیں جنہیں تم نہیں جانتے یعنی ان کے ایمان کا صرف خدا کو علم ہے۔ شاید مالک رام بھی اسی زمرہ میں شامل ہوں" (قوی زبان اپریل ۹۳ ص ۶۰-۶۲)۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ سورہ الفتح کی آیت یہ ہے: وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّحَتَمْنَا لَعْنًا عَلَیْہِمْ وَتُطْفَعُ عَلَیْہِمْ نَارٌ مِّنْ حَرِّہِمْ بَغْضًا عَلَیْہِمْ (الفتح ۲۵)۔ اسی سلسلہ میں انور سدید صاحب نے اپنے مضمون "مالک رام کے نام کام اور ادبی مقام کو وہ حاصل ہے" میں ذکر ریاض مجید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "وہ دہلی سے لوٹنے تو میں نے پوچھا کس کس ادیب سے مل کر آپ کو کبھی خوشی ہوئی؟ ریاض مجید نے بلا تامل جواب دیا چنڈت مالک رام سے۔ ہم کبھی ان کے دولت خانے پر سلام روستائی کے لئے حاضر ہوئے۔۔۔ ریاض مجید نے ان کے گھر میں جس مشرقی تہذیب کا جوہر دیکھا اس کی اساس پر کہنے لگے کہ مجھے تو مالک رام اندر سے مسلمان نظر

تے ہیں (فوقی، ص ۹۳-۹۴)۔

میں "چونکہ اس موضوع کے بارے میں ایک سے زیادہ موقوعہ پر مابکرم سے توجہ دینا۔ اس کا موقع مانتھاس سے میرا چھ مضمون کر دیا تا من سب رس ہوگا۔ مالک رام نے 'مذہبیات' سے متعلق کوئی کتاب شائع کی تھی جس پر عبد مفتی صاحب نے مباحثہ نقد تقریر یا تبصرہ کیا تھا۔ ایک بار مالک رام صاحب سے اس کا ذکر ہوا جو چھ انہوں نے بہادری کے تصور مذہب کے بارے میں بھی سمجھتے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ دین ایک عمل اور تدبیر سچائی ہے جو مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں کے ذریعہ نہ نوس کی ہدایت کے لئے بھیجی جاتی رہی قرآن مجید میں واضح طور پر مختلف ملکوں اور زبانوں میں مختلف پیغمبر بھیجے جانے کا ذکر ہے "ان من امة الا حلالا فیہا الذیر"۔ اور اس کی بھی صراحت ہے کہ "وہ بھی دوسرے ممالک و معاشرہ میں ایسے پیغمبر بھیجے گئے جن کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ مالک رام صاحب ہندوستان کے ادواروں کو بھی شامل سمجھتے تھے اس عقیدے کے مطابق معمولات مظہری میں مرزا مظہر جانجاناں نے ہندو ادواروں کو پیغمبر اور ہندوؤں کو ان پیغمبروں کا مقلد کہا ہے۔ ہمارے آپ کے زمانے میں مولانا حسرت موہانی کرشن جی کو خدا کا دھاریہ پیغمبر مانتے تھے۔ مثلاً میں دیکھتا ہوں کہ رام کے نزدیک اسلام الگ مذہب نہیں ہے اور کبھی بھی اس کا دعویٰ انہیں رہا بلکہ وہ اس دین فطرت کا تسلسل ہے اور اسی ابدی دین کا تسلسل ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور جس کی مختلف شکلیں یہودی اور عیسائی مذہب میں ملتی ہیں۔ ان سب مذاہب کو بھی الگ سمجھنے کے بجائے مالک رام صاحب اسلام حق کے پیش رو دائرے میں شامل جانتے تھے اور یہ باتیں میں ان سے گفتگو کی بنیاد پر عرض کر رہا ہوں میری رائے یا تبصرہ اس میں نہیں ہے۔"

"وہ یہ کہتے تھے کہ قرآن مجید اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہم نے ہر دور ہر معاشرے میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں اس نص قطعی کی روشنی میں بھی ہندوستان میں رام کرشن اور بدھ کا پیغمبر ہونا ثابت ہے۔ (اور ثابت نہ بھی ہو تو کم سے کم قرآن میں قیاس ضرور ہے) اس اعتبار سے ہندو وہ بھی کوئی شخص اسلام یعنی آخری معبود مذہب کے راستے پر چل سکتا ہے۔"

”یہ تو بدوِ سام کے مذہب کے بارے میں نکارا ہے۔ اسلام کے بعد کے دور میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے قائل تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پیغمبرِ اقدس کے موتے میں یہ وہ جو ٹک شریعت تک پہنچا دے۔“  
 الگ غلام ہدایت ساتھ داتے ہیں۔ دوسرے وہ جو یہ سب ساتھ نہیں لےتے بلکہ اپنے سے پہلے پیغمبروں کی شریعت بھیجنے اور غلام ہدایت کی ہی توفیق کرتے ہیں۔ مرزا احمد قادیانی کو وہ دوسری قسم کے پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں اور وہ باتوں کو سند کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ایک تو مرزا غلام احمد کی آنکھیں نیلی تھیں اور اس میں غیر معمولی کشش تھی اور اس قسم کی آنکھیں ان کے نزدیک کسی پیغمبر بنی کی ہوتی تھیں۔ دوسرے، انہوں نے اپنی کسی کتاب میں وہی کو مختلف امراض کے لئے اکسیر بتایا ہے اور اسی بنا پر مالک رام صاحب نے کسی مرض کے سلسلہ میں دہی کا استعمال کیا اور فائدہ ہوا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف واقعات مرزا صاحب اور ان کے صاحبزادے کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر اختر اور یونیورسٹی کا بیان ہے کہ انہوں نے مالک رام کے ساتھ احمدیوں کی کسی مسجد میں دریا گنج میں نماز ادا کی تھی۔“

”اب نہیں دونوں تصورات کو مایہ تو تصویر یہ بنے گی کہ جس طرح قبل اسلام دور میں اسلام کے علاوہ مختلف مذاہب مثلاً یہودی اور عیسائی مذاہب بھی ابھاری تھیں اور دراصل اسلام ہی کا حصہ تھے اسی طرح ہندوستان میں بدھ، رام چندر جی اور کرشن جی کے لئے ہوئے مذاہب بھی اسلام ہی کا حصہ بلکہ اس کے پیش رو مذاہب ہیں اور ہدایت کے مشترک سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ اور یہی نہیں یہ سلسلہ اسلام کے بعد بھی جاری رہا اور اس کے بعد بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی شکل میں پیغمبر یا ہادی آتے رہے جو گو اپنے ساتھ کتاب ہیں۔“  
 اے تھے مگر اسی مشترک مذاہب کی اشاعت اور تبلیغ کر رہے تھے جو ازل سے آج تک مبعوث ہوتا آیا ہے۔ اس طرح مالک رام صاحب کا عقیدہ ہندو اور مسلمانوں کے معتقدات کا مجموعہ ہی نہیں تھا بلکہ مختلف مذاہب کی نظری تفریق میں ایک اندرونی مشترک بنیاد پر مبنی تھا۔“ (”ہماری زبان“ ۸ اگست ۱۹۹۴ء)۔

جناب ڈاکٹر محمد حسن کا یہ طویل مراسلہ اپنے موضوع پر بڑا واضح مراسلہ ہے۔ جہاں تک جماعت احمدیہ کے عقائد کا تعلق ہے جماعت احمدیہ حضرت بدھ علیہ السلام، حضرت کرشن جی علیہ السلام اور حضرت رام چندر جی کو اللہ کے برگزیدہ اور سمجھتی ہے بلکہ حضرت مرزا صاحب کے دعوے کے مطابق وہ اس زمانہ

میں مثیل مرثیہ ہیں۔ اس سے ڈاکٹر صاحب نے یہ بات بھی ٹھیک سمجھی ہے کہ حضرت مراد صاحب کا دعویٰ کسی شریعت کی نوبت کا نہیں، اپنے آپ کو بغیر سدا کا غل اور برہنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی نوبت کا دعویٰ اسلام سے پیچھا کوئی شے نہیں۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کی تصدیق جماعت کے عقائد سے بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر اختر دینی صدر شعبہ ارا و پند یو یو کی نہایت شخص احمدی خاندان کے فرد تھے، اس کے ان کے بیان پر یقین کرے میں کوئی مرمان نہیں کہ انہوں نے مالک رام کے ساتھ احمدیوں کی مسجد میں نماز داکر تھی۔

اس مضمون میں تیسویں نمبر پر جناب بشیر صاحب کا ایک مراسلہ درج ہے "۱۹۳۲" میں راقم دہلی میں تھا وہاں ایک صاحب فضل محمد خان جاندھری سے ملے گا ہے۔ بات ہو جاتی تھی۔ فضل محمد خان نے بڑے وثوق سے کہا کہ مالک رام مسلمان ہو چکے ہیں لیکن اپنی خاندانی مصحتوں کے پیش نظر اپنے اسلام کو پرہیز خانہ میں رکھے ہوئے تھے کیونکہ ان کے والدین اور دوسرے رشتہ دار ہندو تھے۔ بعض آثار و قرآن بھی فضل محمد خان جاندھری کے مالک رام کے اسلام کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔۔۔ ممکن ہے ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کی آزادی ہندو غلبہ اور مسلمانوں کے خائف عدوت اور تشدد و تعصب کی وجہ سے مالک رام نے آخری دم تک اسلام کو چھپانے میں مصکوت سمجھی ہو۔ آخری بات فضل محمد خان جاندھری کے بارہ میں بھی کہہ دوں کہ یہ صاحب سزا قادیانی تھے اور دہلی کی قادیانی جماعت کے پروپیگنڈا سکرٹری اور مسخ تھے۔" (ماہنامہ سید روہا راجستانت خاص سالانہ فروری ۱۹۹۳ء ص ۳۶۳-۳۶۵)۔

(فضل محمد خان صاحب ہمارے حسن محمد خان خانان کے اصرار پر تھے۔ چند سالہ عرصہ میں منہ سے اس نے صحت میں نقصان شعلی کے نام سے جانے جاتے تھے)۔

جناب ڈاکٹر گیان چند جین نے چوبیسویں نمبر پر افضل ربوہ میں چھپنے والے ایک مضمون کا حوالہ بھی دیا ہے جو عزیز بی بی یوسف سہیل شوق مرحوم نے لکھا تھا اور جو یہ رہا بور کے کسی پرچہ میں مکرر چھپ کر کسی مراسلہ کی صورت میں ڈاکٹر صاحب تک پہنچا تھا۔ اس مضمون میں سہیل شوق مرحوم نے پہلی بات تو میرے حوالہ سے لکھی تھی کہ میں کسی کانفرنس کے سلسلہ میں ہندوستان گیا اور جناب مالک رام مجھے اپنے ساتھ لوالے گئے۔ اس ملاقات کا حال جناب مالک رام کے ارشاد کے مطابق انشاء میں رہا لیکن میں نے

اس کا ذکر اپنے بعض شگروں سے یہ جن میں یوسف سہیل شوق بھی تھے۔ مالک رام صاحب کے اہلچوں کے ساتھ باجماعت ملازمت پڑھنے کا تو میں گواہ ہوں۔ یوسف سہیل شوق سے دوسری دوسری جناب سید ظہور احمد شاہ مرحوم رکن ادارہ غنفل کی درج کی ہے جنہوں نے قلم میں جناب مالک رام کے باب محمد کی نثر پڑھی تھی۔ چونکہ یہ مضمون غنفل ریزو (۳۔ اکتوبر ۱۹۹۳) میں چھپا تھا اس سے رسالہ سیارہ، ہورواہس نے فروری ۱۹۹۴ کے پرچہ میں اس مضمون کو درج کیا۔ اور اس کا عنوان لگایا۔ "مالک رام قادیانی تھے غنفل کا انکشاف" میں اس طویل مضمون کو درج نہیں کرتا کیونکہ یہ سلسلہ کے سڑچر میں پہلے موجود ہے۔

ڈاکٹر یگان چند صاحب نے پیپسویں نمبر پر جیس الدین خان کے ایک خطبے کا حوالہ درج کیا ہے۔ "یہ ہمیشہ ایک معمر رہا ہے کہ مالک رام صاحب کو اسلام سے اتنا شغف کیوں تھا؟ اس کی زندگی میں شبہ یہ کیا جاتا تھا کہ دل سے مسلمان ہیں بھارتی حالت کے سبب کھل کر ظاہر نہیں کرتے۔ ایک افواہ یہ بھی کہ قادیانی ہیں اس لئے ظاہر نہیں کرتے حالانکہ قادیانی چند برس سے پاکستان میں تو احمیہ کر سکتے ہیں بھارت میں کریں بھی تو کیوں کریں؟" (جنگ کراچی ۲۸ مئی ۱۹۹۳۔ یہ جولائی قومی زبان کراچی مالک رام نمبر پر ۱۹۹۳ ص ۱۳)۔

اس تمام مواد کو جمع کر دینے کے بعد قید ڈاکٹر یگان چند صاحب نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہے۔ مگر مضمون کے آخر میں جو محاکمہ درج کیا ہے وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے "مالک رام کے مذہب کے موضوع پر میں نے ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اہل الرائے حضرات کی رائیں درج کر دی ہیں۔ ان میں رسالہ سیرہ، ہور میں بشیر سجاد اور سہیل شوق کے مراسلے، مالک رام کے فرزند آفتاب بیچہ کے میرے نام پر خطوط، ہارنی زبان ۱۸ اگست ۱۹۹۳ میں ڈاکٹر محمد حسن کامر اسد اور سید علی جواد زیدی کا مکتوب، غلام شہیق انجم بہ طور خاص معلومات افروز ہیں۔ تنہا ڈاکٹر محمد حسن کامر اسد اس موضوع پر جتنی روشنی ڈالتا ہے اتنی کوئی اور تحریر نہیں ڈالتی۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین جلد نگارشات کو پڑھ کر اپنے طور پر کوئی رائے قائم کر سکیں گے۔" (تجدید کلکتہ پہلا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵)۔

مالک مرحوم کے بارہ میں یہ معلومات جمع کر دینے کا بڑا جراتمند نہ کام جناب ڈاکٹر یگان چند یگان نے



نجم و اللہ تعالیٰ میں جوتی رکھے۔ اس حشرہ چھٹی کر کے ہاٹک درمیان، خیر کرنے میرا مقصد یہ ہے  
 کہ اس کا نام لے کر پڑھ کرے۔ یہ تو ان کے لئے ہے کہ اس میں مغفرت فرماتا ہے اور انہیں  
 دست برداروں میں آتی ہیں۔ میں شکر و حمد۔ آمین۔

-----

## پاکستان میں اردو ادب اور جماعت احمدیہ

۱۹۴۷ء میں برصغیر ہندو آکر دیہی تو دولت مند و جاہل تھا۔ یہاں سے آئے۔ یہاں سے پاکستان آمدیوں کے ہندوؤں کے ساتھ مشترک ہونے کے باوجود پناہ دہندہ تھے۔ اردو، برصغیر کی مفاہمتی زبان تھی اور ہندوؤں، مسلمانوں میں خیریت سے گزر رہی تھی۔ وہی جاتی اور کبھی جاتی تھی۔ اس زمانہ کا ادبی سرمایہ بھی مشترک تھا۔ میر و سودا، ذوق و غائب، میر حسن و دیانت گیسو، سب ہی شاعری کے میدان کے شہسوار تھے۔ برصغیر میں چھتھی کی چھتھی تھی۔ یہاں تک نصاب میں اسی طرح شامل تھیں جیسے اقبال و حالی کی نظمیں۔ حوالے سے ساتھ ساتھ رچوتی سہاے فراق گورکھپوری کے کلام کو بھی پس منظر پر مقلوبت حاصل تھی۔ فیض کے نام کے ساتھ ہی رت میں رہ جانے والے شعر و سحر لہجہ نوری و ملی سرور و غفران کا نام بھی یاد کیا جاتا تھا۔ غرض وہ مختلف ثقافتیں رکھنے والی قومیں ایک ساتھ پرکھ رہی تھیں اور وہ مختلف ادب تھا!

تقسیم کے بعد ہر شخص اپنا رہا تو وہاں یہ رسم بھی چلی کہ دب و کبھی سرحد کے پار کا اور سرحد کے اندر کا ادب بہا جانے لگا۔ حالانکہ ادب تو سرحدوں کو توڑتا ہے، دلوں کو جوڑتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تقریباً بیس برس تک دونوں ملکوں میں ادبی کتابوں کا تبادلہ بھی بند رہا۔ جو مہاجر ادیب اور شاعر پاکستان آ گئے وہ پاکستانی ادیب و شاعر بن گئے۔ ابتدا میں چند برس تو بھارت میں رہ جانے والے شعر و سحر سے گھر گھر آہا کی دھڑکتے رہے اور ادھر کے شعراء میں سے بعض اثر جاتے رہے پھر یہ شعراء کا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔ گویا سیاست نے ناواقف عبور دیوار تعمیر کر دی۔ جس طرح ادب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے ادب کے نعرے تفرقہ پیدا کرنے کا موجب ہوئے تھے وہاں پاکستانی اور ہندوستانی ادب کے نعرے بھی تفرقہ لگے۔ بایں ہمدرد ادب، برصغیر میں بنیاد اگرچہ پاکستان میں ہندی اظہار میں اردو



قدور ہدیٰ کی پرستش اور ان کا کلام محض ترک نہیں تھا۔ یہی سبب ان کی اوج سے متعلق تھا۔ ان کی بھی  
 وہ کوئی شعر سے تھا۔ تو مل دوقیہ سے کہتے ہیں کہ حضرت قاضی محمد شہید الدین صاحب اہل  
 جماعت کے نہایت بزرگ اور پرگوشتا تھے۔ "نعمت اہل" کے نام سے یہ کلام بھی سو کر شائع ہو چکا  
 ہے۔ مولانا غفر علی خاں "غور" جلی برائے ان میں سے بڑے بڑے تھے، ان کا کلام بھی اس کے  
 صاحب ادبے پروفیسر حبیب اللہ خان نے "کلام غور" کے نام سے چھاپ دیا۔ حضرت حافظ حق محمد  
 شاہ جہاں پوری کا کلام غالباً مکرم سید شاہ جہاں پوری مرتب کر رہے تھے یا جمع کر رہے تھے۔ خدا معلوم وہ  
 کام کس منزل میں ہے؟ کون سی منزل میں ہے؟ کون سی راوی میں ہے عشق باخیز کا قلم تحت جہاں؟  
 حیدرآباد کے ایک بزرگ ذوقی صاحب تھے جنکی نظر "اسلامی اسول کی فدا سنی" کے بارہ میں بہت مشہور  
 ہوئی۔ انکا انتقال پاکستان میں کر ہوا۔

انہی بزرگ شعراء میں حضرت شیخ محمد احمد صاحب منہر کا نام بھی آتا ہے۔ منظر صاحب ذری زبان  
 کے قادر الکلام شاعر تھے۔ مگر ان کے شعروں کی بجائے ان کا علمی کام زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا  
 اور نہ صرف پاکستان کے علمی حلقوں میں بلکہ دنیا بھر کے مستشرق حلقوں میں انکی عربی و املا، سند ثابت  
 کرنے کی سعی مشکور جانی گئی۔ جماعت احمدیہ کے ہم کلام کو دنیا سے روشناس کروانے میں حضرت شیخ محمد  
 احمد صاحب منہر کا بہت حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

۱۷۰۰ء میں بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک فارسی کوئی کی روایت چلی آ رہی تھی پاکستان کے ادبی  
 حلقوں میں اس روایت کا چمن نہ رہا مگر ہمارے ہاں مظہر صاحب، اور حضرت مولانا حبیب الرحمن کے  
 صاحبزادے بشیر محمد راجپوتی، ڈاکٹر اختر اور یونیورسٹی آف لٹریچر اور ماہر عبد الرحمن خاکی نے اس  
 روایت کو دیر تک نبھایا۔ جماعت کے پرچوں میں فارسی کی نظمیں چھپتی رہیں۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ  
 پاکستان کی ادبی روایت میں سے فارسی بالکل ہی خارج ہو گئی اور اس زبان کے جاننے والے خال خال رہ  
 گئے اور شعر کہنے والے؟ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہماری ساری ادبی روایت میں سے فارسی یوں  
 خارج ہو گئی ہے جیسے کسی نے لوکا لگا دیا ہوا!

مگر جماعت احمدیہ کے جو شعراء تقسیم سے پہلے ادبی حلقوں میں معروف تھے ان میں سے دو نام بہت

نہیں ہیں۔ دین توراہ - عید احمد ٹھارہ - یہ دونوں شعرا، یہ وقت کے مستمر رہے۔ ان پرچوں میں چھپا  
تے تھے میر صاحب برص - صاحب یونیورسٹی - یہ اس کا نام تھا۔ جس نے جازت علمی دینی تھی، اس  
نارنی ایک احمدی پٹی مزید صلیب کٹھن نے اس پر مقلد لکھا تھا۔ یہ تھا۔ جناب اس طرح جو محمد ریا صدر  
شعبہ ردو بحال یونیورسٹی کی عمرانی میں لکھا گیا تھا۔ سعید احمد اجماعی نے فلسفیانہ تفہیم بہت سہل کی جاتی  
تھیں۔ ان کا اصل میدان حکیمانہ شاعری تھا۔ خدا معلوم ان کا کلام اس کی دوسرے چھپوایا نہیں؟ ان  
دونوں شعرا کا کلام پاکستان بننے کے بعد بھی برساتی پرچوں میں چھپتا رہا اور دوا قسین حاصل کرتا رہا۔  
عبد السلام خٹہ صاحب کے والد چوہدری علی محمد سردار حوالی فی صاحب کے نام سے معروف تھے ان کا کلام  
بھی نہ چھپا۔

بزرگ شعراء میں سے اب عبد المنان مابیدی، یسے روئے ہیں جن کا کلام تقسیم سے پہلے کے دہائیوں  
میں چھپتا تھا۔ درہ قیس مینائی، فیض جنگوی، نسیم سیفی وغیرہم تو رخصت ہو گئے۔ چوہدری محمد علی صاحب بھی  
پرانی نسل کے نئے لہجے کے شاعر ہیں مگر تقسیم سے پہلے تقسیم کے بعد بھی کم کم کتب چھپنے میں آتے تھے۔  
نہجے میں حلق تھے اس نے ان کا کلام زیادہ تر پاکستان بننے کے بعد ہی الجھڑا سنا ہے۔

نائب ریوی صاحب اپنے "دور خسروی" کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ اس کو شاہنشاہ احمدیت بھی کہا  
جاسکتا ہے۔ اس ناٹے سے نائب زیدی صاحب ہمارے فریادی ہیں۔ نائب زیدی صاحب کا مجموعہ  
کلام "شہاب نائب" چھپ کر قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ منظر منظور محمد اور پیام شاہ جہاں پوری کے  
نام بھی جماعت احمدیہ کے شعراء میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعوں کا نام یہ نہیں۔ عبدالرشید  
تبسم کی ایک یادگار، ان کے پندرہ روزہ مشاعرے تھے۔ جو باقاعدگی سے ان کے دولت کدہ پر منعقد ہوتے  
رہے۔۔۔ مور کے بیشتر معروف شعراء کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مگر تبسم صاحب کی  
وفات کے بعد "آں قدح خلعت و ساقی نماند" کا عنوان ہوا۔ جماعت کے پرچوں میں جس شخص کا  
کلام سب سے زیادہ چھپا وہ حضرت مولوی مصلح الدین احمد دہلوی تھے۔

عبد السلام اختر بھی تقسیم سے پہلے کے دہائیوں میں چھپتے تھے۔ ان پرچوں میں چھپتے تھے۔ ان پرچوں میں چھپتے تھے۔  
وہیں سے معروف ہوئے۔ حضرت بانی سلسلہ کی سیرت کے بعض حصوں کو آپ نے نظم کیا تھا۔ وہ بھی

ایک کتاب تھی جو بزرگوں میں عبادتِ حق کی عادت سے چھٹی تھی مگر خدا صاحبِ دین بھی  
 چنانچہ کہتے تھے ہدایتِ حق در راں حاکمیت کے پرچوں میں نہ ملے گا۔ اس پرچہ نے بزرگوں  
 میں شہجہن پوری پاکستان سے قبل کا کلام میری نگاہ سے سب سے زیادہ شہرِ آبِ پاکستان میں بہت مقبول  
 ہونے لگا۔ وہ اب شاہ میں "کریمینے در" ہر جا کہ رفت خیمہ زد وہاں گاہِ سعادت" کا نمونہ دکھا دیا۔ حکیم سید  
 عبد لہادی بہاری بھی بڑے پرکوشاں تھے۔ مولانا دوست محمد شاہد کے خسر، مسٹر محمد ابراہیم شاہ، حاجی  
 موضوعات پر ثابت قدمی سے لکھنے والے شاعر ہیں۔ صاحبزادہ سید ابوالحسن قدسی کے صاحبزادے نعم  
 قدسی بھی نہایت اعلیٰ شعر کہنے والے تھے مگر اپنی دہاکا شکار ہو کر آپ اپنی آب کا خس و خاشاک ہو  
 گئے۔ مرحوم ہونے والوں میں ایک نام اور بھی تھا عبد اللہ شاہد ان کا کلام س کے بعد کی کریم دن نے  
 ان کی وفات کے بعد اب آ کے شائع کیا ہے۔ "ہم محمدی بیچے ہیں بچہ کر کے دھادیں گے" والی مشہور نظم  
 انہی کی ہے۔ ایک اور بزرگ پیام شاہجہن پوری تھے شاعر بھی تھے اور سی فی بھی س کا رسالہ تھے۔  
 پاکستان میں جس شخص نے دہلی حلقوں میں اپنی پیچیدہ حاصل کی وہ غالب احمد ہیں۔ غالب احمد کا نام  
 ادبِ طیف کے حوالہ سے بہت معروف ہوا۔ نکلے ماموں مکرم ملک عبد الرحمن خادم صاحب، خود شعر کہتے  
 تھے یا نہیں کہتے تھے ان کے اذوقِ طیف اور مزاج کا چرچا بہت تھا۔ آپ نے ہی استاد اہم دین بھرتی کا  
 دیوان اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کیا تھا مگر یہ تو تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ بھرتی کے شیدائے بھرتی کا  
 نام بھی نہ صاحب مقبول ہوا۔ غالب احمد جدیدیت اختیار کرنے والوں میں بہت نمایاں نام ہے۔ پھر غالب  
 احمد کے استاد پروفیسر چوہدری محمد علی کا کلام بلاغتِ تمام آہستہ آہستہ منظرِ مر پر آنے لگا۔ ادبی حلقوں کی  
 چٹائی رئے یہ ہے کہ چوہدری محمد علی اور ناصر کاظمی دو ہزار ادنام ہیں۔ ایک نے اخفا میں رہنا پسند کیا  
 دوسرے نے پاکستان کی چوٹی دہائی تک پاکستان کے ادبی حلقوں میں تہمت برپا کئے رکھا۔ چوہدری محمد علی  
 مضطرب صاحب تو خفا کلام کے سلسلہ میں بیسویں صدی کی چھٹی دہائی تک بڑے سزائے تھے رکھتے  
 تھے۔ بے غافلت رجب کے دور میں کھل کے سامنے آئے ہیں اور چھپنے لگے ہیں۔ مگر ان کا کلام صرف  
 سلسلہ کے پرچوں میں چھپتا ہے۔ ان پر غنیمت ست۔ تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ میں سے  
 پروفیسر نصیر محمد خاں، بہت پرکوشاں تھے۔ ان کا مجموعہ "رو چناب" چھپ کر ملک کے ادبی حلقوں سے

تیس سال کر رہا ہے۔ بڑا محمود، حسن صاحب، یحییٰ آج بھی اپنے مخصوص ہمارے گھر کے متاثرہ ہیں۔  
 "ماہنامہ" چھپ دیا۔ "تہذیب"

میں شعر و نثر لکھتے تھے۔ جماعت کے ایسے بہادر دانشور تھے۔ انہوں نے مراد علیہ ایب نہیں ہیں جو محض ادب تخلیق کرتے ہیں۔ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جن کی تحریروں میں ادبی شان موجود ہوتی ہے۔ ان بھائی کے بارے میں انبیاء حضرت مراد شیر احمد صاحب ہیں۔ حضرت میاں صاحب کی تحریر میں ایک خاص استاد انداز آویزی تھی۔ انہیں غفلتوں کو برتنا تھا۔ ان کی شریں بھی غلطیوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ جماعت کے علم کلام و تبرک و مہر تک پہنچانے کا کام انہیں کو سونپا اور تھا۔

جماعت کے علماء میں سے حضرت مولانا صاحب چاندھی، حضرت قاضی محمد نذیر صاحب لکھنوی بھی مناظر اعلیٰ ادب میں مفرود تھے۔ مولانا دوست محمد شاہ نے تاریخ نویسی میں اپنے اسلوب کا وہاں منوایا۔ جن لوگوں نے ادبی حقوق میں اپنی انفرادیت منوائی ان میں مہرم شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی بہت مفرود ہیں۔ شیخ صاحب حالی کے ہم وطن ہی نہیں اے معنوی شہر دہلی تھے۔ شیخ صاحب ہی کے صاحبزادے محمد حمد پانی پتی نے عربی کی مستند تاریخی اور علمی تصانیف کو اردو میں منتقل کیا اور پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں اپنی شناخت پیدا کی مگر ”خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود“ کا عنوان ہوا۔ قمر جنالوی صاحب نے ناول نگاری کے علاوہ صحافت میں اپنی فنکاری نگاری کا لوہا منوایا۔ عبد المجید سالک نے ان کے ایک فنکارانہ سے خوش ہو کر اپنا کالم افکار و حواشی انہیں بخش دیا تھا۔

حضرت ماسٹر محمد حسن آسان دہلوی (دلی کے ایک ہمدرد کرونگار نے انہیں پہلی ہزار دستاویز کا خطاب دے کر اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے) اور ان کے نامور صاحبزادے مسعود احمد خاں دہلوی نے دہلی کی شہینہ باجوہ زبان میں اپنی تیز حیثیت اور شان برقرار رکھی۔ سیٹھ محمد عظیم دکن کی تہذیب کے نمائندے تھے انہیں دکن کی مٹی سے بہت انس تھا۔ ان کے ہاں صاف ستھری زبان لکھنے کا چہن قائم رہا۔ جس طرح بھائی مسعود احمد خاں دہلوی نے دہلی کے اجڑے دیار کی یاد قائم رکھی۔ سیٹھ محمد عظیم صاحب سیلئے دکن کی محبت کے گن گاتے رہے۔ افسوس کہ ان کے مضامین بھی شاید دیکھ کی غذا ہی بن گئے ہوں گے۔ کوئی انہیں سجا کرنے درشائع کرنے والا نہ ہوا۔ میاں عبدالسمیع خان صاحب اپنے منفرد انداز

میں باغی یروں میں گھستے رہتے ہیں۔ جیسا مائی اوشی عیدالہ رات میں شادی میں تھا۔ اس میں میرا بہت  
آس تھا، مجھ صاحب منہ صاحب عی خوب کھڑے ہیں۔ مہمانیہ احمد فقی کا تہہ چار سلسلے سے۔  
انہوں کے ہاں خود دوست کا سب سے مشہور اور عمدہ نمونہ حضرت نانہ میر محمد امین علی بلوچی کی آپ  
میں ہے مگر حضرت چودہ کی محمد ظفر اللہ خان صاحب کی "تحدیت نعت" وہی اردو کی منظر و درمست  
خود دوست سمجھی جاتا ہے۔ کرم میاں محمد برائیم صاحب کی خود دوست میں تجھی کا دل قدر کا سب سے۔ ملک  
محمد مدد صاحب نے بھی پٹی داں جو جمع کر دیا ہے اسی طرح یہ صحت کی اصل اہم تحسیات کے بارہ  
میں ان کے بہتر مت محفوظ ہوئے ہیں۔

تاریخ نو کی بھی جماعت میں قائم رہی۔ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عراقی نے جماعت کے ہدفی ریکارڈ کو محفوظ کرنے کا ہم کام کیا تھا مگر اس سلسلہ میں اب سب سے زیادہ ہمدرد واقعہ پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک ملک صدر لہدین صاحب اور مولانا دوست محمد شاہ صاحب نے کیا۔ ”تاریخ احمدیت“ مولانا کا نام رہتی دنیا تک قائم رکھی۔

پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب کی جلسہ کی تقریریں جماعت احمدیہ کے علم کلام کا عمدہ نمونہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح موجودہ دور میں دو چار استاد نے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور پڑھنے والوں سے وہ حاصل کی ہے۔ پروفیسر مرزا مجید احمد صاحب اور پروفیسر میاں محمد افضل صاحب پروفیسر رحمتہ نصر اللہ خان صاحب اور پروفیسر عبد الباقی خاں صاحب کی ہاں خصوصاً سادگی اور سچی نمایاں ہے اس لئے ان کی نثر میں تاثیر ہے۔ کیا جانے دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے۔ کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایسا ہم بھی نہیں "اس سب مضمرات کے مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پروفیسر سعید احمد علی اور پروفیسر محمد ارشد چوہدری اور اب پروفیسر طاہرہ احمد نسیم مختلف تاریخی اور سیاسی و سماجی مسائل پر لکھتے رہتے ہیں۔ کینیڈا سے ذکر یہ درس سماجی مضامین پر خوب لکھ رہے ہیں ڈاکٹر عبد السلام پران کا تحقیق کام نمایاں ہے۔ پاکستان کے دیہوں میں مرزا ظہیر احمد قمر خوب فعال ہیں۔ انجینئر خالد سیف اللہ آسٹریلیا میں بیٹھ کر معنویاتی مضامین کے بارگاہ ہے ہیں۔ افضل ربوہ میں نئے نثر نگاروں کی ایک کھپ تیار ہو رہی ہے۔ نثر نگاروں کا مختصر تذکرہ کرنے کے حد پھر شعر کی طرف لوٹنا ہوں۔





جس حوالہ کے ادبی حلقوں میں بہت جگہ پچھلے ہیں۔ ان کا کلام بھی کمال میں تھا۔ ان کے ادبی مجموعے پچھلے ہیں۔ محمد حامد، برادر احمد، عارف انصاف نوید، رشید ندیم، عارف ثاقب، محمد مبارک رفیع رضا، دراعصف محمود، عبد السلام احمد اور چچے رستم سید قمر عیدان احمد جو ان نسل میں بے منفرد ہجرت کئے گئے شعراء ہیں۔ اب ان میں مبارک احمد خضر بھی شامل ہوئے ہیں۔ ان کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ انوار احمد بہت نمایاں ہجرت کئے گئے اور شاعرانہ مہارت جس کا کار ہو گیا۔ ان میں سے کچھ یعنی انصاف نوید، رشید ندیم، رفیع رضا، اکرم ثاقب مظفر منصور، عیدان میں ہیں۔ انصاف نوید اور اکرم ثاقب کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ عیدان میں بی ایک اور مانوس نام ہدایت اللہ ہادی کا ہے خاندان ربانی تو رہی عاقبت ہو گئے۔ جرمنی میں نوحوان شاعر خاندان ملک ساحل میں جن کا کلام چھپ چکا ہے۔ برطانیہ میں آدم جتائی ہیں۔ عبدالسلام اختر کے برادر خورشید منصور احمد ہیں۔ یہ لوگ اپنے رنگ میں جماعت کے ادبی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ امریکہ میں حبیب الرحمن ساحر ہیں جن کا کلام جماعت کے پریوں میں ساحر حبیب کے نام سے چھپتا رہتا ہے۔ بالینڈ سے جمیل الرحمن جمیل کے مجموعے چھپ چکے ہیں ایک تو حال ہی میں چھپا ہے۔ جمیل الرحمن نے جماعت کے ایٹمی کے نئے بہت سے ترانے لکھے ہیں اور اللہ کے فضل سے مقبولیت حاصل کی ہے۔ طاہر مجید ندیم محی الدین صادق درجہ محمد یوسف کا تعلق جرمنی سے ہے۔ ان کا کلام بھی اب سلسلہ کے پریوں میں چھپنا شروع ہوا ہے۔

موجودہ نسل کے جن شعراء کے کلام نے جماعت کے پریوں میں چھپنے کے بعد اپنی پہچان بنائی ان میں ذرا سینئر شعراء عبد الکریم قدسی اور، مبارک احمد عابد اور انجینئر میسر خورشید ہیں۔ اس کے بعد کے سلسلہ میں عبد الکریم حامد یوسف سمیل شوق، اکرم محمود اور طاہر عارف ہیں۔ طاہر عارف کے دو مجموعہ بائے کلام چھپ چکے ہیں ایف اردو کا ایک پنجابی کا۔ لیف قریشی نے آزد شاعری کرنے کے علاوہ البتہ تنویر صاحب کا کلام بھی کرنے اور شائع کرنے کی نیکی کی ہے۔ انور ندیم علوی صاحب آج کل خوب لکھ رہے ہیں مگر ان کا کوئی مجموعہ چھپا نہیں یہ بات میرے علم میں نہیں۔

موجودہ دور کے نوجوان احمدی شعراء کے نام ہی لکھنے لگوں تو ایک دفتر ہو جائے۔ مگر اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے نوجوان شعراء میں دو شعرائہ حسیت جسے poetic sensibility کہتے

نہ ناری بھیجی نسل سے نہیں۔ یاد ہے اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں تو۔۔۔ بہت سے شعراء اور  
ادبی کے شہسواروں پر نگاروں میں آئے اور اس امر کا بھی یقین ہے کہ وہ نئی سلا جیتوں  
اور نعت محمدیہ کے سرکار کی ترویج میں مصروف کریں گے۔

یہ بات کہنا خود ستائی میں شمار نہ سوتو کہہ دوں کہ وہ جوان نسل کے جن شعراء کا نام میں نے لیا ہے ان میں  
سے کچھ تعلیم الاسلام کالج کے پڑھے ہوئے اور میرے شاگرد ہیں۔ ذوالکفل اللہ یتیم کن یشاء۔

اس رہنمائی، جماعت کے مزاحیہ شعراء کے سرخیل تھے۔ گران کے رنگ کا تتبع کرنے والے کوئی نہ ہوا بہت  
ناجی ہزداری اس راہ پر افاقاں خیزاں اب تک ثابت قدمی سے چلے آ رہے ہیں۔ بابتوں فحشے ”بندے  
دے پتر“ بن گئے ہیں اور ”ابن آدم“ کے نام سے لکھتے ہیں۔ ناجی صاحب نے مدوں پہلے ”راج  
القدس کے موسیقار“ کے عنوان سے احمدی شعراء کا ایک انتخاب شائع کیا تھا۔

خواتین شعراء میں سے بزرگ خواتین میں سے سب سے پہلا نام تو حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ  
کا ہے۔ ”وزعدن“ جماعت کے طنز نگار کا علی نمونہ ہے پھر شاکرہ تھیں یا منیرہ ظہور، اب اس میدان  
میں صاحبزادی متاقدوس، ذاکرہ فہیدہ منیر، آغا طاہرہ صدیقہ ناصر سلیمان اور امۃ ابی ناصر در ارشاد  
عرشی کی ٹمک و تاز جاری ہے۔ جرمنی میں مقیم نعیمہ امجدین بھی ادبی حلقوں میں خوب معروف ہیں۔ اسی  
طرح کیسیدا سے نہایت امداد صدیقی اور راشدہ اشرف سیال اور وسیمہ قدسیہ بہت معروف نام  
ہیں۔ نہایت کو بعض ادبی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ امریکہ کی ایک صدیقہ کے مضامین ’’ابور‘‘ میں چھپ  
رہے ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد پر ان کی دو تحقیقی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ پروفیسر نسیم سعید سلسلہ  
کے لٹریچر میں قابل قدر اضافے کر رہی ہیں۔ ان کی بہت سی تصانیف معرض وجود میں آچکی ہیں۔ اپنے  
نامور باپ اور باپ سے زیادہ نامور ماں کے ورثہ کا تحفہ ان کا شیوہ ہے۔ ان کے بھائی سید برکات احمد  
سابق سفیر حکومت ہند نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعی کی کتاب ”مذہب کے نام پر خون“ کا انگریزی ترجمہ  
کیا تھا۔

یہ تو ادباء شعراء کا ذکر تھا۔ پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت میں ربوہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔  
تعلیم الاسلام کالج میں ملک کے ممتاز ادباء اور شعراء وقت فوقت آتے رہے۔ کالج میں ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۷ء

میں داخل یا تنہا روداد غرضیں بھی سوئیں جن میں سے پہلی کا مرتبہ فی الواقع اردو کے نام سے چھپا۔

تعمیم اسلام کاغذ کو حضرت حافظ مراد شاہ احمد صاحب حبیب بریل ملہ سے آگے چل کر منصب خدمت پر ملازمت سونپا تھا۔ حضرت صاحب کی رہنمائی میں تعمیم اسلام کاغذ اردو کی ترقی میں کوشاں رہا اور ملک کے دہاء و رعلما ان خدمات کے معترف ہیں ان کا غرضوں اور بزم روداد کی بیشتر سرکاریوں کے لئے پروفیسر محبوب عالم خاند اور خاکسار اتم الحروف کو خدمت کی توفیق ملتی رہی!

اب پھر ذرا سا گریز نثر کی طرف۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں سے سعید انجم، ناروے اردو کے چند مشہور ترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ عبد القیوم شاد، سلسلہ دار افسانوی داستانوں کے لئے بہت معتبر بنے گئے بدحوث کے بعد بھی اب تک ان کے افسانوی سلسلے مختلف رسائلوں میں دہرائے جا رہے ہیں۔ نثریہ نگاری میں اکبر حیدری اور حامد برنی کے نام بڑے ممتاز ہیں۔ اخبار کی نامہ نگاروں میں عرفان احمد خان نے اب آگے قدم رکھا ہے اور اپنا لولہ منوالیا ہے۔ امریکہ کے لطف الرحمن ٹکود کاغذ کے زمانہ میں لامیم کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے ان کے ہاں طنز و مزاح کی لطیف کیفیات موجود تھیں مگر اب انہیں فرصت نہیں رہی یا ”کشاکش غم پنہاں“ نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

اتم الحروف کو بھی نظم و نثر میں خدمت کی قہوڑی بہت توفیق ملتی رہی اور اس بکا مدد کے مضامین جماعت کے کسی ایک پرچے میں چھپنے کے بعد جماعت کے بہت سے دوسرے پرچوں میں اور دوسرے ممالک میں بھی مکرر چھپتے رہے۔ نظموں کا سلسلہ یہ رہا کہ خاکسار جماعت کے پرچوں میں تو چھپتا رہا مگر ملک کے واقع ادبی رسائل کے مدیران کے کہنے کے باوجود ان رسائل سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں پری شعری صدمہ کو صرف جماعت احمدیہ کی خدمت کے لئے وقف رکھنا چاہتا ہوں اور ان مدیران نے زرہ کرم میر سے اس عذر کو قبول فرمایا۔ ہاں یہ ضرور ہو کہ ادبی جراند نے جماعت کے پرچوں میں چھپنے والی کسی چیز کو اپنے پرچوں میں مکرر چھاپ کر میری عزت افزائی فرمائی۔ جماعت کے بہت سے شعراء کے مجموعہ ہاں کلام پر حق فرمایا لیکن توفیق ملتی رہی حتیٰ کہ ملک کے نامور نقاد ادیب اور شاعر ڈاکٹر دریاغی کی ایک کتاب کا قارئین کو دیکھنے کا اعزاز بھی اس حقیر کے حصہ میں آیا۔

غرض پاکستان میں اردو ادب کی ترقی و ترقی میں جماعت حمیدیہ کے ہر اہل علم و ادب کا ہر ایک حصہ ہے اور  
 اس میں ہر ایک کا حصہ ہے جماعت کی ہر ایک جماعت ہے کہ جس سے یہ پارہہ جماعت  
 کرتے چلے جاواں اور بے حد خوشی ہے کہ اس پر اس برسوں میں ادب کے میدان میں بھی جماعت حمیدیہ  
 کی سے جی نہیں رہی!

-----

تاریخ  
 اس کی  
 دینی  
 رکھنا  
 چور  
 ایک  
 جانہ  
 سے  
 کہ  
 غالب  
 موبی  
 و فریا  
 ہمیشہ  
 تھا  
 دھڑ  
 شامل  
 مسیح  
 نے  
 صاحب

## ربوہ کے احمدی شعراء

ہماری دینی سوشل آن لائن کھیں تو راجہ میں مولوی مصلح الدین احمد صاحب جس کی شاعری کا چرچہ تھا۔  
 ر کی نظم 'غرض' بہت مشہور اور زبان زوہام تھی۔ مصلح صاحب سے مدقات ہوئی تو یوں محسوس ہوا جیسے  
 فانی بدایوں سے مدقات ہو گئی ہے۔ فانی صاحب کے بارے میں کتابوں میں پڑھ کر جو تصور قائم کر  
 رکھا تھا مولوی مصلح الدین اس تصور پر سوہو پور۔ ترے۔ طبیعت کے نہایت مسکین۔ ٹنگو میں دھیسے۔  
 چار کی بکل۔ سر پر ٹوپی پاؤں میں رُرد و دجوت۔ ہماری گلی کی تکر پر خاندان محمدی الدین صاحب نے  
 ایک چھوٹا سا چائے خانہ کھول رکھا تھا۔ بس مولوی صاحب وہیں براہمان رہتے تھے۔ سیلونی کے چائے  
 خانہ میں بھی نہیں جاتے تھے کہتے تھے اس کی غامت سے دم گھٹتا ہے۔ ہمیں شعر کہنے کا شوق چرایا تو سب  
 سے پہلے مولوی مصلح الدین احمد صاحب کو اپنا کلام دکھایا۔ آپ نے امداد دی مگر ساتھ ہی نصیحت بھی کی  
 کہ سادہ کلام غور سے پڑھیں، میر، سودا، آتش، ذوق اور غالب کا کلام خود مولوی صاحب کو میر اور  
 غالب بہت پسند تھے۔ غالب کے تو وہ فقط تھے۔

مولوی مصلح الدین احمد، حضرت مولانا غلام رسول صاحب، جنکی کے بیٹے تھے۔ آپ کی ولایت سے نصیر  
 و فرمایا تھا۔ حد درجہ مستغنی ال احوال۔ ان کے ذریعہ، معاش کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا مگر فکر معاش سے  
 ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کا کام ان کے چھوٹے بھائی مبشر احمد صاحب راجپور کی نے مرتب کر کے شائع کیا  
 تھا۔ لیکن خود ہمیں بھی کئی مقامات پر احساس ہوا کہ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے کلام میں جہاں جہاں  
 دخل دیا ہے مگر وہ کلام انکی پوری شخصیت پر محیط نہیں۔ بہت سالیہ کلام ہے جو اس میں شامل نہیں یا جو وہ  
 شامل نہیں کیا گیا۔ اب وہ کلام کون جمع کرے گا؟

مصلح الدین احمد کی شخصیت کا جو پہلو اب بھی میرے ذہن میں متحضر ہے وہ ان کی حرماں پرستی ہے۔ آپ  
 نے حرماں پرستی میں تصوف کی چاشنی پیدا کر دی تھی۔ ان کے شعر درد مندی کی تصویر ہوتے تھے۔ مولوی  
 صاحب کرکی پرائزوں جیتتے تھے۔ چار دیواریں کس کو اپنے سارے وجود کے رُپیت لیتے تھے۔ شعر نے کا



کتابیں بنی گئیں سوئی تھیں حضرت حافظہ صاحب سے ایک بار ایک غیر ازجہ امت و حیدرہ مہاراجہ کو  
 نے۔ حافظہ صاحب نے ان سے ایسی دلائل منگوائے۔ وہ شکست بردار ہو گئے کہ اتنا سادہ نہیں مگر  
 سمندر اپنے سینے میں دبا۔ بیٹھا ہے۔ ہر کچل کر انہوں نے جوابی فتنہ کہاں ہاں نہایت بار حضرت  
 صاحب نے اپنی ایمرٹی سے کی منگلوں میں بھی دیا تھا۔ نبیوں نے کہا تھا "یہی ہے جی الہی" یہی "یعنی  
 آپ نے سب جھوٹے سے گروہ میں کس با کا عالم بند کر رکھا ہے۔

بزرگ شعراء میں سے حضرت قاضی محمد منظور الدین صاحب اکمل سے صرف ایک بار ملاقات کا موقع ملا۔  
 اکمل صاحب بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ کھتا ہوا گندنی رنگ تھا۔ ناک پر چیلے سنہری فریر کی جینک تھی۔  
 اکمل صاحب نہایت زود گوشہ طر تھے۔ در سہدے پر اے اخبارات و رسائل کے کلام سے بھرے  
 ہوئے ہیں۔ ان کی کلیت پر درمختصر جنید ہاشمی صاحب نے چھاپ دی تھی۔ "نقد اکمل" مگر یہ کلیات  
 میر تقی میر کے کلیات کی طرح اتنی ضخیم ہے کہ پڑھنا مشکل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بے ترتیبی سے چھپی گئی  
 ہے۔ اور اپنی فادیت کھو بیٹھی ہے۔ اس کا کاش کوئی اس کو دوبارہ ایڈٹ کر کے چھاپ کے۔ اکمل صاحب  
 کے دونوں بیٹے صاحب ذوق تھے جنید ہاشمی اور شبلی بی کام۔ شبلی بی کام کے نام کے ساتھ بی کام کا لاحقہ  
 یہ چپکا کر ایم کام ہونے کے بعد بھی لوگ انہیں بی کام ہی لکھتے رہے۔ کسی زمانہ میں اجبر مت کے ایڈیٹر  
 تھے۔ مانے ہوئے مصنفی در پاکستانی اخبارات میں اقتصادی۔ یو یو لکھنے کے بانی تھے۔ صدر ایوب کے  
 زمانہ میں میں میں خاندانوں کا بہت تذکرہ رہا۔ یہ ہیں خاندان وہ تھے۔ جن کی اقتصادی چیر دوستیوں کا تذکرہ  
 شبلی بی کام نے کیا تھا۔ بہرحال شبلی صاحب کا سلسلہ سے زیادہ گہرا اور قریبی تعلق نہ رہا۔ وہ سلسلہ  
 کے طلوع میں معروف نہ ہوئے۔ جنید ہاشمی صاحب تعلیم الاسلام کالج کے آفس پرنسپل تھے۔ وہ  
 رہنمائی اعلیٰ اولیٰ ذوق رکھتے تھے۔ سلسلہ کے اخبارات و رسائل میں کبھی کبھار ادبی موضوعات پر لکھتے بھی  
 تھے۔ جنید صاحب کی بیٹیوں میں سے فائزہ اور فائزہ اچھی صاحب ذوق لڑکیاں ہیں ایک انگریزی کی  
 پروفیسر ہے ایک فلسفہ کی۔ ان دونوں میں سے کوئی ہمت کرے تو "نقد اکمل" کو ایڈٹ کر سکتی ہیں۔

روا کے قسین شاعروں سے ہماری بہت دوستی رہی۔ عبد السلام اختر سید سنی در روشن دین تو میر۔ اب قسینوں  
 ہی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ زندہ شاعروں کے بارہ میں کھنہ تو مشکل ہو تا ہی ہے مگر مرے ہوؤں کے بارہ





ان اپنی ایک نمونہ بھی لیں۔ آخر صاحب کی وصیتوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے ان فہموں کے لئے میں نے کئی دستاویز بنائے۔ آخر صاحب سے بڑا رشتہ۔ آپ ان کے بچوں کے لئے بھول گئے؟ ہم نے کئی نئی کراچی کی بات یہ ہے کہ ہم دوستوں و ہمیشہ رندہ سمجھتے ہیں ان کے مرنے کا فہم لیں کیا کریں؟

۔ ہمارے غصے کا مغل

رقیبہ دے لے نازاں

دوستوں کا وہی تصور تنہا میں موجود رہا ہے۔ یہ آ رہے ہیں دو چار رہے ہیں۔ یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں!

دوسرے شاعرانہ دین تویر افضل کا ایڈیٹر بنے اور امدادی ہونے سے قبل وکالت کرتے تھے اور ادبی دنیا، نیرنگ دنیا جیسے ادبی مسائل میں چھپتے تھے۔ افضل کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے تو اس ایڈیٹر کی کوڑا دھماکوں کا ہونا۔ تنویر صاحب شاعر تو علی درجہ کے تھے ہی تھے بھی بڑی دل و خوب صورت لکھتے تھے۔ ہر روز کسی ملکی موضوع پر داریہ لکھنا۔ ان کا گھر نہیں مگر تنویر صاحب کے ہاں ہاتھ کاٹھیں تھیں۔ ان کا ذہن بڑا صاف تھا۔ قدر گزار تھے جاتے اور درادریہ سمجھتے جاتے تھے۔ شعروں کے باب میں بھی ایک حد تک حد تک تھے۔ مگر شعروں کی ذوق پک سنوارنے پر بڑی محنت کرتے تھے۔ اور سب باتوں کی ایک بات کہ اپنے کمزور شعروں کو ترک کر دینے میں انہیں کبھی عار محسوس نہ ہوئی۔ ہم نے کئی بار دیکھا کہ پندرہ پندرہ بیس بیس شعر کی نظم رات میں آتی مگر صبح اٹھ کر ان میں سے دو شعر قلم زد کر دیتے۔ ان کے بعض مسودات ہم نے دیکھے ہیں اور ان کی جگہ کاوی کی داد دی ہے!

تنویر صاحب کا اور ہمارا حلق دوستی کا تھا۔ عموماً کا قاعدت کبھی اس دوستی میں حائل نہ ہو۔ وہ بڑے بڑے اور ہم ان کے سامنے کل کے بچے اٹھ آفرین ہے کہ تنویر صاحب نے ادبی مسائل کے بارے میں ہماری رائے کو ہمیشہ ہی وقعت دی۔ "افضل" میں کبھی کبھی ہمارا کلام چھاپ بھی دیتے تھے۔ واپسی مرضی سے کائنات چھٹ بھی کر دیتے تھے ہم نے کبھی برا نہ مانا۔ اس طرح ان کا یہ عالم تھا کہ اتنی چست کاری کے باوجود کبھی بات پر ہلک جاتے تو ہماری رائے طلب کرتے اور مناسب سمجھتے تو مان بھی دیتے تھے۔ تنویر

صاحب بین میدان کے رہا۔ یہاں راستہ ہو۔ آپ نے یہاں سب کچھ شعر مرے کے  
 اس وقت سے لیا تھا

میدان قبل ہے عمر میدان کا رہا

جہاں قربان کروں عشق میں گمراہ جانا رہا

بیسرے یہ پہلی صاحب بنی صاحب ہمارے ہائے عمر تھے نہ بڑا این شعر قبل ہمارے ہم  
 ہے طریقی صاحب کی اور یہی بنی بطلی تھی جیسی ہم عمر دو توں میں سوئی ہے۔ تو دیاں کے زمانہ کی  
 ہمسائی کے ماٹے دوستی کا رشتہ اور یہ وہ منسوب ہو گیا تھا پھر بدو میں یہ ہماری ہی ٹکلی میں رہتے تھے۔ یہی  
 صاحب رہا، وہ شعر تھے چٹکوں میں فکر کہہ دیتے تھے درگت سے شعر کہتے تھے جب انصاف کے یوٹر سو  
 ئے تو نثر میں بھی یہی کثرت نویسی آگئی سارے کا سارا انصاف کے نثر پاؤں سے بھر موندتا  
 تھا۔ تحریک کے پرچے تحریف جدید کے یوٹر تھے تو وہاں بھی ان کا یہی طریق تھا۔ ہم نے کئی بار انہیں لکھا  
 کہ یہ دوسروں کی چیزیں بھی غفلت میں چھینے یا کریم گمان کا جواب تھا کہ جتنی محنت دوسروں کی  
 چیزیں ایڈٹ کرنے میں لگتی ہے اس سے آدھی محنت میں سارا پرچہ لکھا جاسکتا ہے چنانچہ یہی ہوتا تھا۔ کچھ  
 وقت ایسا تارک تھا کہ پابندیاں بہت تھیں در اونچی جج، جوتی تو پرچے کے خلاف پرچہ کٹ جاتا تھا۔ ان  
 حالات میں ایڈیٹر کا نہیں راستوں میں زبان کی طرح رہنے کا محاورہ تو بالکل معمولی لگتا تھا ہر طرف سے  
 دشمن تیر و تنگ لے کر پڑے تھے اس کے پاس یہی ایک چارہ رہ گیا تھا کہ اصرار کا دامن پاز  
 کر خود ہی سارا کچھ کھڈ میں اور پھر اخبار بھی روز نامہ ہے۔ روز کا داریہ، مختلف مضامین پر شذرات،  
 تبصرے، قطعات، نظمیں "سارا پرچہ ان کا اپنا لکھا ہوتا تھا اس پر باتیں بہت جتنی تھیں مگر انہیں پروا نہیں  
 تھی۔ (اب نئے ایڈیٹر مولانا عبدالمسیح خاں صاحب سے تو داریہ لکھنے سے دیسے ہی تو بھر لی ہے)۔ یہی  
 حال ان کی شاعری کا تھا نظمیں تو تھیں ہی، یہی صاحب نے قطعات بھی شروع کر دیے۔ قطعے کیا چو  
 مصرعے ہوتے تھے اور جب قید ہوئے تو روز انصاف کا ایک صفحہ ان کے قطعات سے بھرا ہوتا تھا۔ ہم نے  
 ایک بار مذاق میں انہیں لکھا کہ حکومت نے یہ دریافت کرنے کے لئے آپ کو گرفتار کیا ہے کہ یہ شخص ہیں  
 ایک دن میں اتنی شاعری کیسے کر سکتا ہے؟

کی شاعری کے بہت سے مجموعے چھپے ہوئے ہیں ایک قادیان میں سے ماہر ریاضیہ تھا وہ بھی  
تایید اظہار کی تھی۔ میں نے اسے کئی صاحب دہرے سے ملے تھے وہ اپنی ساری زندگی چوتھی  
نی کو اپنا مجموعہ رکھ کر پیش کیا تھا پھر بھی جی نے وہ نہیں اٹھایا تھا کہ ایک سو سیڑھی صاحب کی شاعری کی  
کتاب چھپی ہے تم بھی شاعری کیا کرنا۔ محمد نذیر کہ ہم نے شاعری تو جیسی کی سوئی مجموعہ ابھی تک نہیں  
چھپا۔ سیڑھی صاحب بنیادی طور پر بسنے تھے اس سے ان کی شاعری میں بھی تبلیغ موعظی مت عوام میں بھی  
افضل کے مزاج کی چیزیں پڑھتے تھے تو اب اعتراضات نہیں سنتے تھے کچھ ن کی برگی کا حزم  
آڑے آتا تھا مگر خود مشاعروں کے بہت خد ف تھے بد اخلاقی میں مشاعروں کے خلاف ایک آدھ بار  
لکھ بھی دیا۔ ہر ان کی دوستی کے قائل ہیں دوستوں کے دوست تھے۔ طہمیں سنتے سنا تے بھی تھے دوستوں  
کی تنقید سن بھی جیتے تھے مگر اپنے موقف سے درا اور ادھر نہیں ہوتے تھے۔ ان کی طبیعت میں استواری  
تھی۔ اللہ مغفرت فرمائے اب تو جنت میں آرام کر رہے ہیں۔

جب یہ مضمون پہلے پہل افغان میں شائع ہوا تھا اس وقت زندہ تھے حیف کہ کتاب کے پچھتے وقت وہ اس  
دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔

-----

وفیات

## جانے والے کا جان

جو بھی آیا ہے وہ ہے جانے والا۔ جسے اسے چاہیے جاتے ہیں اس کی یاد دہانی ہے نہ کہ کامرہ جاتے ہیں۔ بھی کل خود جو ایسا ہے اس کو یاد کرنے کا بیحد سوس تو اس کے آئے۔ کا وقت یاد آ رہا ہے۔ مریوں کی چٹپاتی دھویا بنوں کا مہینہ ایک کے جانے کا غم دوسرے کے آئے کا ہمارا ساری طاقت بے حس تھی۔ آجھ مری کے مارے پتھرس خوف کے مارے جس کا اثر وَلَسْتُ لَنُفِمْ مِنْ بَعْدِ حَوْفِهِمْ اَمَّا میں ہے۔ بارے یہ مرحلہ ہے وہ آیا تو کیا خوف سے کبھی ہوئی طاقت کے چروں کی رونق وٹ آئی۔ یوں محسوس ہوا کہ جھونکا ہے دھر سے اُدھر اور اُدھر سے اُدھر ٹھنڈک اور سکینٹ کا چھینڈ دیتا ہو۔ گذر گیا ہے۔ ۱۹۶۵ میں سکینٹ اترتی ہوئی پہلا بھی دیکھی تھی مگر ۱۹۸۲ کا نام اور تھا۔ آنے والا آیا سوکھے دھنوں میں پانی پڑ گیا۔ بیعت کا عہد تو سب نے اسی وقت بارہنیا مگر ہم نے اگلے روز اس نے دس سے ملاقات کی۔ یوں محسوس ہوا کہ راہِ ادبی مجلسوں میں بیٹھنے والا ساتھی روحانیت کی بلند یوں پر پہنچ گیا ہے۔ دیکھنے میں وہی چہرہ تھا مگر اب اس سے نور اور تھے ایک عجیب نور اس پر برس رہا تھا۔ اس کی باتوں میں مومن تھی مگر اب وہ مینشی ہو گئی تھیں۔ وہ تصدیق دیتے تھے تو اس میں اس کا ہاتھ ہماری کمر میں جا کر مل رہا تھا۔ اس کے کندھے پر اب سے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس ایک قسم کی ہوئی کہ یہ ہاتھ ہماری سہا تھ ہے تو سب کچھ ہے۔ یہ ہاتھ ہماری عمت کے سر پر ہے تو جماعت کو کسی کڑی سے نری آزمائش میں بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اور وہ نری آزمائش جلد ہی آگئی۔ مارشل لا اور وہ بھی اس مکروہ شخص کا مارشل لا جس نے سلام کے مقدمہ نام کو ستموں کر کے اپنے اقتدار کو طول دیا اور وطن کو اندھیراں میں ڈھکیل کر اپنے انجام کو پہنچا۔ مارشل کا خدیجہ جمہوریت کی شام کو نافذ ہوا ان کا خیال تھا کہ اگلے روز جمعہ ہے دیکھیں جماعت کا کیا رد عمل آوتا ہے؟ ہم نے بھی حیرت و خوف سے مودی محمد بشیر شاد صاحب کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مسجد میں آنا بھی یاد ہے ہاتھ اٹھا کر جماعت کو سلام کرنا بھی یاد ہے مگر اس کے منہ سے خلاف قانون کی ایک غلط تک نہیں نکلا کہ یہی اس جماعت کی روایت رہی ہے کہ تک کے قانون کا پورا احترام کرو۔ اب سوائے اس کے کیا بار دھتھ کہ وہ امام جو اپنی جماعت کو گھنٹ

ہمیشہ مل کر کھلتے ہیں۔  
 وہ بھی کھلی ہوئی ہے۔  
 اس کی طرف سے بھی  
 کاغذ کاغذ کاغذ  
 کے ہمارے جانے کا  
 حریف درری نہ ہو  
 ساتھ ساتھ کی سیٹ پر وہ دلیر درجہ کی سیٹ پر وہ دلیر  
 ہونے پر اس نے چائے بھی پی۔ اتر کر اپنے جاننے پہنچنے والے ہونے والے سے ملنے بھی  
 کی۔ کراچی پہنچا۔ یورپ کی پرواز کا وقت مؤاوتوی آئی پلی ماؤنچ سے ہو کر جہاز تک گیا یہ نہیں کسی خفیہ  
 راستہ سے جہاز تک گیا ہو۔ قنوں کی ذرا سی غلط درزی اس نے نہ کی کہ یہی اس کا شیوہ تھا اور یہی اس کا  
 کہا تھا کہ اگر اس کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہوا ہے تو وہ ہرگز ملک سے نہیں جائے گا۔ کے اہل ملک کا  
 ہوائی جہاز تو اوداع کہنے والوں کی جان میں جان آئی۔ وہ بغضِ تعالیٰ بغیریت پہلے ایسٹرن اور  
 پھر لندن پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں رت جھنکے کی وجہ سے سرخی تھی مگر اس کے چہرے پر سب آرائی کا کوئی اثر  
 نہیں تھا اس کے دورِ حلاوت کا سب سے کٹھن دور شروع ہو چکا تھا اور یہ اس کے کام کرے کا وقت تھا  
 آرام اس دن کے بعد اس نے نہیں کیا۔ دن کا مزارات کام اس ملک کا سفر ملک کا سفر یہ خطبہ تقریباً  
 جسد وہ جسٹس غرض اس کی منت سے آرام کا غلط یوں خارج ہو گیا گویا ایسا کوئی غلط موجودی نہیں۔ وہ  
 بیمار ہوا تو بھی اپنے فرائض کے مطابق سب نمازیں مسجد میں جا کر پڑھا تا رہا۔ ٹھیک ہو، تو، غلیں مؤاوت  
 اس کے کام کے اوقات تبدیل نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ اس کے چاہنے والوں نے بھی محسوس کیا اور اس سے  
 دبے غلطوں میں درخواستیں بھی کیں کہ وہ اپنے وجود کا اپنے آرام کا خیال بھی رکھے مگر اس نے سنی اس کی کر  
 دی۔ ہمارے پیارے عزیز شاگرد وزیر سید قمر سلیمان احمد نے بڑی خوب صورت نظم میں اس سے  
 خطاب کیا کہ تو جو سب کا خیال رکھتا ہے دوسروں کے دکھ درد بھاتا ہے کچھ اپنا خیال بھی کر مگر اس نے اپنے  
 پیاروں کی آواز پر کان دھرا تو صرف اتنا کہ خطبہ دینے کے لئے کرسی پر بیٹھنے کی بات مان لی۔ اس سے

یاد آ رہا تھا کہ میں نے قوس نہیں کیا۔ اپنی رملوں کے آخری راور سے ایک میں پہلے اس نے جودہ خدیجہ کیا۔  
مغرب میں اس کے زمین میں، وہ بن نہیں رہا تھا۔ یہاں سے چاند کے قوس میں رہا تھا۔  
قرآن مجید میں اس وقت کے پھر فرسی اور یہاں سو کیا پھر نہ تھا تھکے سب میں جودہ کا چکر لگایا۔ جب  
آر کا وقت آیا تو یہی مان لی۔

اس ٹیم کے عہد میں ہم نے درمیان کے علاوہ ایک یا مجرہ بھی دیکھی ہے جو نسل نے بھی دیکھ کر  
دو اس کے پس منظر سے آتے نہیں۔ ساتھ ہی وہاں کے اوپر میں تیسرے نام نے ایک بار بڑی حسرت  
سے اس خوش کا خیر کیا کہ یہ اور میڈیا کا اور ہے۔ کاش جماعت کو کہیں کسی جگہ کسی ملک میں اپنا  
ریڈیو سٹیشن قائم کرنے کا موقع مل جائے تو یہ خوب ہو۔ پھر ہی اہم نے ایک بار بڑی خوشی سے یہ بتایا کہ  
فریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک میں جماعت کو پناہ ریڈیو قائم کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ جماعت  
خوشی سے پھولے نہ سائی۔ حالانکہ ایک چھوٹے سے ملک کا ایک چھوٹا سا ریڈیو "اکیڈمی" کہا جاتا ہے جو ریڈیو  
کا "کے صدق" کیا کر سکتا تھا۔ مگر چونکہ ماسکی ہجرت نے جماعت کو نہ صرف کچن اور متحد کر دیا بلکہ  
ایسا مجرہ بھی دکھایا جو کسی کے دسم اداں میں بھی نہ تھا۔ ریڈیو تو ریڈیو جس دور میں جماعت نے پناہ دی  
تو نہ کر لیا اور یہ وہ کام ہے جو حکومتیں نہیں کر سکتیں کہ یہ گھانے کا سودا ہے۔ سودا گریوں کا حساب رکھتے  
ہے کہنے لگے جماعت میں زیادہ میں کیوں نہ لکھتے گئی ہے "اس نے کہا" "میں ہے متقی میں یہ ہم بھی  
جانتے ہیں مگر۔ معاملہ ہی کیا ہو "مزید اس کے لئے" اور ہمارے لئے یہ گھانے کا سودا منافع کا سودا نہیں  
اور وہ آواز جو ایک چھوٹی سی مسجد فضل لندن میں محدود محصور ہوتی تھی سارے عالم میں گونجنے لگی۔ چار سو  
مجرہ، حسن یوں گونجتا ہے۔ ایک آواز سے اب سارا جہاں گونجتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ہمیں ربوہ میں  
وڈ پیئر استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے بر ملا وڈ پیئر پر دہاڑتے چنگھڑتے اور اپنے  
ہی عید و غضب کے بھڑ میں جستے بھستے رہتے تھے۔ ہمارے وڈ پیئر کا نام بھی لیتے تھے تو مجرم قرار پاتے تھے  
دی نہ لکھتے کہ "ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔ وڈ لکھ بھی کرتے ہیں تو چرچ نہیں ہوتا۔ عدو  
سمجھتا تھا ہم نے ان کا گلہ گھونٹ دیا ہے لب" کہ اس سے آئے صدق اللہ اللہ اللہ۔ ربوہ والوں کی  
آوازیں اوڈ پیئر میسر نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے اندر بھی پہنچنا ممکن نہ ہوتا تھا اب پانچ سو





توئی کا آئی ہو اسے سب جانے اس نے تیرا کیا کیا تھا ہے۔ سوچ میں اسے سب اور میں  
 وزجہ کے تھے۔ یہ وہاں تھی میں نے کہتے ہیں۔ وہ ایک شخص تھا جو اس کے ساتھ رہتا تھا۔  
 ایک عہد تھا اس وقت اس کا ایک عہد تھا۔ ہے وہ عہد جس میں تمام ملکوں سے کروڑوں ایک  
 تہائی حدوں سے کل اس حد کوئی۔ جس کی آوار چار ایک سال میں کوئی۔ یہ بچوں کے انھیں اس کے  
 حصہ بخش ہوئے بعد وہ وہی ایک شخص یا جو ہو سکتا ہے۔

جانے اسے اس کے ساتھ قدم۔ اس کے چھ مشق موت تھا۔ ہم نے قادیوں اور بود میں خدا سے  
 اجتماع میں سے دیکھا اس کی چھریں اور اس کی چھری پر بڑے بڑے اور اس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر روز وہ  
 میں ہمیں ایک ہر سال کیل پان سے ساتھ جانے کا موقع ہمارے بھائی جان محمد احمد خیم واقف رند  
 مرہی و سلسلہ مرحوم مرش لموت میں جلتا تھے حالت لحد پر محمد درگوں ہو رہی تھی انہوں نے لکھ کر اپنی  
 خواہش کا ظہار کیا کہ مراد احمد صاحب کو بلائیں وہ اس کو دیکھیں اور ہو میو پیتھک کی کوئی اور دیں تو  
 شاید وہ نکلیں جائیں۔ میں وقف جدید کے دفتر میں گیا۔ جب میں سے بھائی جان کی خواہش کا ظہار کیا تو  
 فوراً جانے پر مستعد ہو گئے اپنی ساری پڑی اور یہ جاہ جا۔ ہم ہانپتے کانپتے اپنی ساری پڑی پر ان کے پیچھے  
 روانہ ہوئے۔ بڑی مشکلوں سے نہیں جایا اور کہا۔ تو ہر بان قافلہ سے یہاں آئے۔ ایک ہی رقم میں  
 تمہارے تو ہم نے فرمائے گئے آپ نے کس سے رہا نہ کا پسندیدہ شعر یاد دیا۔ پھر وہاں سے ساتھ  
 بہتہ بہتہ ساری چلانے گئے۔ گھر پہنچے۔ بھائی جان نے حسرت بھری نظروں سے نہیں دیکھا یہ لکھ کر ہٹا  
 چہ ہر گھر کہہ نہ پائے کیونکہ فحش کا رشتہ اور زبان نہیں اتنی تھی۔ بس وہ ان کا آخری وقت تھا۔ آپ کی  
 آنکھوں میں آنسو آ گئے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ واپس ہوئے ہمیں کہنے لگے بس آپ بھائی جان کے  
 پاس ظہریں ان کا وقت شاید آچکا ہے میں چلا جاؤں گا۔ ہم نے کہا جناب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آپ کو اس  
 راہ میں چھوڑ دیں۔ میں انہیں دفتر پہنچ کر واپس ہوا تو بھائی جان اس جہان سے رخصت ہو چکے تھے لیکن  
 انہیں یہ تو تسلی رہی ہوگی کہ ایک پاک وجود نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں لوٹا کہا ہے۔ اس  
 پاک وجود کا ہاتھ ہر مرحلہ پر لوگوں کو سکنت دیتا تھا۔ پھر تو اللہ تعالیٰ نے اس مہربان وجود کو ساری  
 جماعت کے لئے سکنت کا منبع بنا دیا۔

خدا ہم تمہارے لیے ایک بار ایک مجلس دعا سے کیا کہ آپ کے پاس فجر کی نماز میں حاضر کی گئی ہوئی  
 سے سن کر میری۔ اس۔ بعد خدا نے دعا کی۔ تو اس نے وہ فجر کی نماز اس مجلس کے بعد ہی مسجد  
 میں پڑھتے رہے۔ کہاں دارالاحمد میں تاملات اور کہاں وہ دورانیہ مسجد۔ سائیکل پکڑتے اور مسجد  
 کے وقت وہاں پہنچ جاتے۔ تربیت کا یہ طریقہ ایسا کامیاب تھا کہ ان کے زمانہ میں ربوہ میں خدا تمہارے  
 گمراہوں کی تعداد کہیں سے نہیں پہنچتی تھی۔ نہ دستور یہی تھا کہ نصیحت زبانی نہیں کرتے تھے عمل میں کا  
 ثبوت دیتے تھے۔

جس سالانہ کے موقع پر تائب افسر جلسہ سالانہ مہمان نوازی تھے دن بویا رات ہر وقت اپنی ڈیوٹی پر موجود  
 جس کے سب سے مشکل ڈیوٹی مہمان نوازی کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ رات خیر ہوئی تو سارا کام چھٹ سو گیا۔  
 کئی بار یوں ہوا کہ رات کو دو ڈھائی بجے ان سے ہدایت لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی تو اپنے دفتر  
 میں مستعد اور موجود پایا۔ ایک موقع یہ آیا کہ ہم نے کارکن کو ایک رقعہ دے کر بھیج دیا وہاں گیا کہ  
 نائب افسر جلسہ دفتر میں نہیں۔ ہم نے اسے کہا کہ دو چار منٹ انتظار کر لیتے ہیں کہیں کسی جگہ معاند کے  
 لئے گئے ہوں گے۔ تنے میں دیکھا کہ دبیر کی سردی میں سائیکل پر سوار آ پہنچے کیا ہوا مجھے کارکنوں نے  
 بتایا کہ آپ کا معاون آیا تھا۔ قافیہ وزمین برسر زمین ملے ہوا۔ لنگر خانہ جانے کی ضرورت تھی کہنے لگے  
 آپ بھی ساتھ چلیں۔ وہ موقع تھا جب پہلی بار ہماری گاڑی میں تشریف فرما ہوئے لنگر کے بعد ہم نے  
 گاڑی ان کے حوالہ کی کہ اب آپ اس میں دفتر افسر جلسہ میں تشریف لے جائیں ہم آپ کی سائیکل پر  
 آکر وہاں سے لے میں گئے۔ تو ہماری اس ڈیوٹی پھوٹی گاڑی کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ آپ نے اس  
 گاڑی کو چلایا بھی ہے۔ وہ گاڑی جب تک چلتی رہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر سال جلسہ سالانہ کی ڈیوٹی  
 میں استعمال ہوتی رہی۔ جلسہ کے دنوں میں ان کی چستی اور مستعدی کو پر لگ جاتے تھے۔ سوائے "کڑک  
 " چائے کے اور کوئی چیز ان کو پسند نہیں تھی اور جلسہ کے دنوں میں شاید چائے پر ہی گزارا کرتے تھے  
 کھانے کا یہ عام بھی دیکھا کہ کسی لنگر میں تنور پر بیٹھے ہیں گرم گرم اترتی ہوئی روٹی بغیر سالن یا دل کے کھا  
 رہے ہیں۔ سن آتے آتے ان کی بھوک کا تقاضہ پورا ہو جاتا تھا۔

پھر ربوہ کے رہنے والے اکثر لوگوں نے دیکھا کہ عصر کے بعد وہ سائیکل پر احمد نگر کو جا رہے ہیں آگے اپنی

کسی بی بی کو بھیجا۔ اسے سینڈس پر بٹا کر رکھا۔ اسے یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہ رکھو اسے اور ساری طرف اڑے جا رہے ہیں۔ مغرب سے پہلے، جس سوئے کے در مسجد مبارک میں نماز میں شریک ہوئے۔ یہ راز مدعا معمول تھا اور شریک کی ورزش و سیر کی سیر بچوں کی دل دی گئی۔ بالکل ایک عام آدمی کی زندگی مرد دست با کار دل بادیہ۔ حتیٰ کہ خدمت کے منصب پر فائز ہوئے تو اگلے روز سائیکل چڑھ کر ہسپتال کی طرف چل پڑے حفاظت کا کلدہہ، خود دیکھتا رہا۔ دو تو خدام، احمدیہ کے صدر ہمارے محمود احمد بنگالی صاحب نے کہا حضور اب حضور کی حفاظت کے نظام کا فرض جماعت کے کلدھوں پر ہے اس لئے حضور اپنے خدام کو سزائش میں نہ لیں اور اس انتظام، لوگوں سے تعاون فرمائیں۔ تب کہیں جا کر انہوں نے سائیکل کا پیچہ چھوڑا۔

طبیعت میں مزاج تھا پاکیزہ مزاج سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہم ۱۹۹۰ میں لندن میں حاضر ہوئے نئی دہلی میں آدم سن کی کتاب آئی تھی۔ از رو شفقت میز سے ایک نسخہ لے کر دستخط فرمائے اور ہمیں دے دیا۔ ہم نے ایک ہفتہ کے قیام میں اس کا اردو ترجمہ کر لیا۔ سوڈن جانے کے لئے روانہ ہونے لگے تو ترجمہ کا مسودہ ہمارے ہاتھ میں تھا فرماتے گئے "یہ کیا ہے؟" عرض کی حضور اس "بندے دے پتر" کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ حیرت سے فرمایا "بندے دے پتر" کون؟ میں نے کہا "حضور میں نے" آدم سن نام کا ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ بہت خدمت فرمایا۔ بعد میں ایک دو دوستوں کو خود بھی یہ حیفہ سنایا۔ اور ان کی رد و کلاس کے حیفے کسے یا نہیں؟ ان کی طبیعت کی کشمکش ماحول و شغف رکھتی تھی (سوائے مولویوں کے سب حنفی اندوز ہوتے تھے) یہ درویش، انہوں نے اپنے موعود باپ سے پایا تھا۔ اب درویش کی بات آگئی تو "آئے وہ" یاد آیا۔ وہ اپنے پیش رو کو مٹی دے کر واپس آ رہے تھے تو ہم نے فی دی پر انہیں دیکھا۔ کیمبرہ کسی انجی جگہ پر تھا اس لئے ہمیں صرف حضور کی پگڑی اور جسم کی حرکت نظر آ رہی تھی۔ ایک لحظہ کے لئے یوں لگا جیسے حضرت مرزا شریف احمد جا رہے ہیں۔ ان کی چار ڈھال ایسی ہی تھی بجا ہے دائیں بائیں دیکھیں۔ تو واضح کا یہ انداز حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی تھا۔ حضرت مرزا شریف احمد صاحب کو ہم قادیان کے زمانہ سے دیکھتے رہے۔ اب اس کا پورا احوال اللہ بقاء، ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت مرزا شریف احمد لنگی باندھتے تھے حضور نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ نہیں بھی آنکھ نہ کرا دھر

ہوا ایسا نہیں تھا غریب زمین پر مٹی رستی تھیں۔ ہم اپنی حالات کے باعث مدرس میں حاضر نہ ہو سکے  
 مرید کی حالت اے پانچواں ہے کہ مندرجہ پیش کردہ مسئلہ روز میں شریف سے اس کہتا ہے :  
 رخصت ہوئے

شہت ست پر خیر و دوا و مودت

-----

## ایک عالی دماغ تھانہ رہا

پاکستان کی تاریخ میں جن گئے چنے نامور اشخاص نے اپنے اپنے میدان میں نیک نامی اور قومی غیرت اور بہوث خدمات کا ورثہ پیچھے چھوڑا ان میں سے تین کا تعلق جماعت احمدیہ سے تھا۔ تینوں نے اپنے میدان کے مرد تھے، سیاست اور تہذیب میں سر فہرست اللہ خاں، سائنس میں ڈاکٹر عبدالسلام اور اقتصادیات میں ایم ایم احمد پٹیل، دو پہلے ہی اللہ کو چارے ہو چکے تھے کل ایم ایم احمد کی کنی بھی آگئی اکل من علیہ دن و سبھی وجہ ربک ذوالجلال والا کرام!

ایم ایم احمد کا پورا نام مرزا مظفر احمد ہے۔ آپ حضرت ہانی، مسند احمدیہ کے پوتے تھے۔ تقسیم ہند سے قبل آئی سی ایس میں شامل ہوئے۔ تقسیم ملک کے وقت سیالکوٹ کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کے رینے طے کرتے ہوئے مرکزی حکومت میں سکریٹری فنانس، پھر ایچی جیر مین، پبلک کمشنر۔ پھر چیرمین پلاننگ کمیشن، پھر مشیر خزانہ اور پھر وزیر خزانہ کے مقرر ہوئے۔ پھر وہاں پر فائز رہے اور ہر رنگ میں قومی خدمات سر انجام دیں۔ استاذی، محترم گورنر درپس نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ "ایم ایم احمد اقتصادیات کے آدمی نہیں تھے مگر ان کے تجربے نے انہیں اس میدان میں وہ کمال عطا کر دیا تھا کہ اقتصادیات کے معاملہ میں ان کی رائے پتھر کی بکیر بھی جاتی تھی۔" سرکاری ملازمت سے بڑے وقار سے سبک دوش ہوئے تو عالمی بینک میں اونچے عہدے پر سر فرما گئے۔ امریکہ کی جماعت احمدیہ کی ادارت کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتے رہے۔ شہرت اور نام و نمود کی خواہش کبھی نہ کی۔ نہ سٹائٹس کی تمنہ نہ صلے کی پروا، ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔ اپنے فرائض منصبی کی دنگلی میں کسی رو رعایت کے روادار نہ تھے اسی لئے بعض حلقوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھے گئے مگر سب لوگ، کیا ان کے ماتحت کیا ان کے افسران کی محنت، ان کی لگن، بروہاری اور اصول پرستی کے معترف رہے۔ یہی اوصاف ہماری نوکمرشہی میں مفقود ہیں اور ایم ایم احمد انہی اوصاف سے متصف تھے



سے قریبوں یا دور سے سو "میرا ایمہہ تھو کی این فریست آئے آئی کہ سب جہاں میں کی ہوگی یہ  
مائی ثابت نہیں۔ س سے نسوں سے س سے نہیں۔ اسٹ میں س سے سب سے سب سے  
رہی تو سب سے سب سے سب سے سب سے سب سے سب سے سب سے سب سے سب سے  
کرنے کا موقوفہ نہیں ملے۔ غلٹ پینے پانی تو خون میں لت پت تھے مگر موشی دھواں بجتے تھے حمد اور  
اوروں نے پڑ کر پائیس کے جواب کر دیا در س طرف ان بد بخت کا، رہنمائی ثابت نہ ہو کر اسے  
بہت بری طرف مجروح ہوئے تھے مگر امداد نے نفس کیا آپ صحت مند ہو کر پھر اپنے فرہنگ منہ کی میں  
مشغول ہو گئے۔ جسے اندر رکھے اسے کون چلے

ہم نے پہلی بار ایمہہ حمد کو جانا تو اس وقت وہ پنجاب کے ڈسٹرکٹ چیف سکرٹری تھے۔ ہم ان کے والد  
گرامی حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ ایمہہ حمد کو سور سے اپنے با  
سے دفتر میں ملاقات کے لئے آنا تھا، ہمیں رشاد تھا کہ مظفر آ میں تو انہیں انتظار نہ کرو یا جائے فوراً اندر  
بھیج دیا جائے کیونکہ ان کا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں مظفر احمد اتفاق سے ایک دھ منٹ دیر سے پہنچے۔  
ہم پہلے ہی ان کے منتظر تھے پوچھنے گئے اب کو انتظار تو نہیں کھینچنا پڑ ناراض تو نہیں؟ ہم نے جواب دیا  
ناراض تو نہیں اب یہ بے قرار ضرور میں۔ ایمہہ حمد نے ہماری اس "رباں در ری" پر ہمیں غور سے دیکھا۔  
ہم نے فوراً انہیں اندر دفتر میں پہنچا دیا۔ اسلام علیکم کی آواز گونجی، ہم اردو دہندہ کر کے باہر آ گئے۔ صاحب دفتر  
میں ایمہہ حمد کی اپنے اب سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے یاس کے بعد میں یاد نہیں کہ وہ دفتر میں آ  
کر مے ہوں۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی یہ بے قراری سب کے لئے تھی کسی کو یہ وہ کے باہر سے آنا  
سونا تو بے چین رہتے جب تک آئے دل پہنچ نہ جاتا، انہیں کسی کل چین نہ پڑتا۔ ربوہ والوں میں سے  
کسی کا انتظار سونا تو کان دروازہ پر گئے رہتے تھے۔

اپنے والد گرامی کے نام دعائی درخواست کے خط ان کی طرف سے باقاعدگی سے آتے تھے اور جواب  
بھی باقاعدگی سے جاتا تھا۔ خط کے نقاب بھی سیدھے سادے ہوتے تھے "عزیزم مکر مرزا مظفر احمد  
سلمہ" اور کبھی کبھی ان کی بیگم صاحبہ کے نام بھی ساتھ ہی میں لکھا جاتا "عزیزہ مکر مرزا صاحبہ صابزادی است  
خیرم سلمہ"۔ ہمیں عجیب لگتا تھا کہ بیٹے کے ساتھ صاحبزادہ نہیں لکھتے تھے۔ زبان و بیان کی یہ باریکی







دور کی بر وقت اس وقت ہوں جب اس کے والدین کا انتقال ہوا۔ اس نے تعزیت کے لئے حاضر تھے۔ میر نے جوتا تھا۔ سواری مانی تھی تو میر نے میر کے بیٹے کے ہاتھوں سے میں، میں اور ایک کرٹے لگا کر دیا۔ وہ بت گم گئی۔ آپ نے اسے ایک ملاقات یہاں سرکین بیت انجمن میں دینی۔ مرنے کے لئے میر نے اس میں داخل ہوئے۔ آپ نے میں دیکھ کر نظریں ملیں، میر نے فی الحال شاید سلام کیا تھا مگر تم نے، خدا نہیں سنے۔ یہی فیہ منوط محبتیں ہم نے اس کے سو، سو سال میں نہیں دیکھیں۔ آنکھوں کی مدد سے سب پتہ نہ آتی تھی۔ گلے روزن کی بھی نچی نے تو کیا کہ کل گھر میں آپ کے ربوہ والے مضمون کا ذکر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے میں نے اس مضمون، اس کو بیت زمین میں دیکھا ہے۔ وہ مضمون برسوں پہلے، ساہیہ خالد میں پھر لفظ میں دو بار دوچھپا تھا۔ دور میں "ماری بستی کے پچاس سال" والے مضمون بھی ان کی نظر سے گذرنا تو حسین کے الفاظ کہے۔ ایسا میر نے ہم کو بھی سن سنی سے اسی لگا تھا جو ہم سب کو ہے۔ ان کا وقت موجود امریکہ میں آگیا۔ بڑی دیر سے میل تھے، علاج معالجہ کی بھلا ان کے لئے کیا کی تھی؟

میر جان تو جان آفریں کے سپرد کرنی ہے، کر دی اور اب اس کی مٹی اسی زمین کو واپس بھیجی جا رہی ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اپنے وطن کی مٹی کو اور ڈھکڑو جائیں گے۔ سو جائیں گے اک روز زمین اور ڈھکڑے کے ہم بھی!

تمہاری نیکیوں زندہ تمہاری خوبیوں باقی"

-----

## قدم تیری یادیں

محرم ستارہ دوستوں کے تذکرہ میں سے ہم نے اپنے دوست ڈاکٹر نصیر احمد خان کا ذکر سجدہ بردار کیا تھا۔ کیونکہ نصیر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ محض شاعر کہنا اپنے سے انصاف نہ ہو پاتا، اسی طرح اپنے استادوں میں انہیں شامل کرنا چاہا مگر پھر خیال آیا کہ سائنس و رسم نے بڑھی ہی نہیں ہاں ہم نے ان سے پڑھا، پڑھ نہیں سیکھا، بہت کچھ ہے۔

نصیر صاحب نہایت وجہ اور حد سے زیادہ جامع ذہن انسان تھے۔ ہر اس سی "ن" کے وجود پر پھبتا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ چمکتی دھکی پیشانی، اے سرش نہ ہوش مندی، ملی تافت ستارہ بلند کی استادوں میں استاد تھے۔ بزرگوں میں بزرگ، شاعروں میں شاعر اور حسینوں میں حسین، نصیر احمد خان صاحب کا یونین کے نچر ج تھے۔ بڑے منتظم تھے۔ یونین کے جلسوں میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اونچی چچی مات بہہ جائے۔ نصیر صاحب کی شخصیت کے آگے بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔

۱۹۵۱ء سے ساتھ ان کا تعلق محض یونین کا نہیں رہا۔ شاعر تھے اس لئے ہم پر مہرباں تھے۔ کبھی کوئی تازہ غزل کہتے تو بد بھیجتے۔ حاضر ہوتے تو جس استاد کی زمین میں غزل کہی ہوتی پہلے اس پر طبع آزمائی کرتے پھر نہایت لطف لے لے کر کلام سناتے۔ ہر منہ لگے تھے اس لئے کبھی کبھی چٹکی بھرتے تو تھلا ٹھٹھے مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے جواب میں ایسی دور کی کوڑی لاتے کہ لینے کے دینے پڑ جاتے اگر یہ ہے کافی ہم دونوں کا ذاتی معاملہ تھی۔ گھر سے باہر ہم نے کبھی ان کے بارہ میں کوئی بات کہی نہ نصیر صاحب نے ہم پر کوئی فقرہ چست کیا ورنہ وضع واری آخر تک نہمانی۔

فرانس کے مانے ہوئے عام تھے اور پاکستان میں نکلیئر فرانس کے گئے چنے ماہروں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر ماتدری کا یہ عالم تھا کہ عید اسلام کالج میں ان کے وپر فرانس ہی کے ایک معمولی استاد کو بطور پرنسپل لگا دیا گیا جسے سائنس سے تعلق نہ تھا، سہ تو تھا جہاں کسی ان پڑھ کو ہو سکتا ہے۔ نصیر صاحب اپنے دوست

جس نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ میں نے اس کو نہیں دیا۔ یہ تو ایک نیا ہیرو ہے۔  
یہ تو ایک نیا ہیرو ہے۔ یہ تو ایک نیا ہیرو ہے۔ یہ تو ایک نیا ہیرو ہے۔  
تو مایاں میں شہید پر صرف کر دیں!

ہم نے شہید فرس ۵۰۰ روپے بھی دیے اور دل بھی نیو کیس میں۔ ہوں صحت نے بیستہ یونیورسٹی کی کہاں  
یونیورسٹی کے وسیع و عریض کیس میں نیو کیس صاحب نے اپنا علم کا چراغ بین برکھ تھا۔ صاف ستھری  
بیروٹریاں، ایکچر تھیٹر، ابریری نوٹی، کیس کے لئے آگے تو نیو کیس صاحب ایک ایک کردہ ایک  
بیروٹریاں اتار پیار اور اتنے گناؤ سے دکھاتے کہ دیکھنے والے ان کی محبت کی داد دینے بغیر نہ رہ سکتا!

نصیر صاحب کے انتقال پر کالج کے نیو کیس میں سے ایک قریب عزیمت برپا کی۔ باہر سے بہت  
سے دوست آئے۔ پروفیسر غلام جیلانی انصاری پر تو اتنی رقت طاری ہوئی کہ ان کی ساری طلاقیہ لسانی  
دھڑی رہ گئی کہنے لگے "میں جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی خاموش نہیں ہو سکتا۔ میں چپ ہوں اور نصیر  
صاحب کے کیس کے سناؤ میں ہر طرف نصیر صاحب کی یاد گونج رہی ہے" میرا نہیں کے شعر کی بدعت  
اس روز سمجھ میں آئی۔

یہ بے سبب نہیں سونے لکھ دوں کے سنانے

مکان یاد کیا کرتے ہیں کیسوں کو

نصیر صاحب کی خواہش تھی کہ وہ اپنا کلام سنی کر کے چھاپ دیں۔ چنانچہ وہ "دردِ چناب" کے نام سے  
چھپ چکا ہے۔ ڈکٹر وزیر آغا نے ویو چیک کیا ہے۔ اس کے مرتب کرنے میں کچھ ہماری بھی کوشش شامل  
ہے۔ مگر صاحب انصیر صاحب نے ہر شعر سے اتنا پیار کرتے تھے کہ کسی شعر کو برا کہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر  
ہم نے کئی شعروں پر چھری پھیر دی آفریں ہے کہ نصیر صاحب نے ہماری بات مان لی اور وہ شعر ترک کر  
دیے۔ مگر ہر شعر میں سقم نکالنے کے بعد پورے سائنسی طریق سے انہیں قائل کرنا پڑا تھا کہ اس شعر میں  
واقعی سقم ہے۔

نصیر صاحب کی حالت خوب اہل قہر کے اٹھنے بیٹھنے، چلے بھرنے، غصہ کرنے، اٹھنے بیٹھنے میں ایک خاص سبقت تھی۔ وہ اس کی باتیں کرتے تھے۔ آج اب ہمیں ہاؤس، دروازے، ان پر تھمے ٹھہرنے کی جھل میں بیویوں کا رہنا تھا۔ اسیف مزاح کی جھلکیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ ہمارے کسی درجہ یہ بات لکھی ہے کہ "جس مجلس میں جانی مسعود احمد خاں دہلوی ایسیٹھ محمد عظیم حیدر آبادی اور نصیر صاحب کھٹے ہو جاتے وہاں بھلی بھلیاں چھوڑتیں کہ چرغاں سو جاتا۔"

نصیر صاحب پلی سچائی کر کے اٹھتے۔ لوگ تو ایک نیل لوس ونگین مار بھی خریدے۔ کالج کے سٹاف میں پہلی بار برقی کار نصیر صاحب کو حق اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ کار پرانی ہوتی گئی۔ ربوہ کی مٹی اور اسکی شریڈ کے آگے بھاگ کر ٹھہر رہا ہے؟ کار پرانی مٹی تو واقف زندگی پر دھیرے دھیرے اس کے معدن معالجہ کے کہاں مقصد ہو سکتے تھے۔ اس کی برقی رفتار ہی رفتہ رفتہ آہستہ فرامی میں مد لئے لگی تو اسے سچ کر نصیر صاحب نے ایک فیٹ کار خریدی وہ آہستہ حرام بد مخرم پر عمل پیرا تھی۔ ایک بار ہمارے کالج کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے نصیر صاحب آئے گاڑی روکی کہنے لگے "آؤ بیٹو جاؤ" ہمارے عرض کیا "شکریہ آپ چلیں۔ مجھے ذرا جلدی جانا ہے" تھلا کر رو گئے۔ مدتوں بعد ہماری گاڑی ان کے گھر کے آگے پارک ہوئی۔ ہمارے جان کا درد زور ٹھکانا پہلے تو چائے پانی سے تواضع کی پھر فرمانے لگے "مگر آپ کو جلدی نہ جانا ہو تو میں اپنی گاڑی پر چھوڑ آؤں"۔

ایک بار کسی محفل میں آپ نے ایک غزال سنائی، میں نے بھی۔ "بے خودی تھی میں نہ تھا" "سر خوشی تھی میں نہ تھا" وغیرہ۔ "میں نہ تھا" کی روایف بھانا بہت مشکل کام تھا۔ نصیر صاحب آخر تک بھاگے۔ مگر مقطع میں آپری وہ سخن سترانہ بات اقطع تھا۔

رک گئی تھی تب یہ جو آکر نصیر

اک صدائے بے کسی تھی میں نہ تھا

ہم نے پکڑ لیا کہ روایف خوش ہو گئی ہے۔ الجھ پڑے کہ ثابت کرو۔ ہمارے کہا پہلے مصرعہ میں ب پر آکر رکھنے کا قریب ہے۔ صدائے ب کسی آواز فریاد ب پر آکر رکھ سکتی ہے آپ خود کیسے ب پر آکر رکھ سکتے ہیں؟ بہت جبر ہوئے مگر قائل نہیں ہوئے۔ اندر میں چھاپنے کے لئے وہی تو ہم نے مقطع کاٹ دیا۔ بہت

اس بار میں اسے پھر ایک بار کہنے لگے۔ باب سمجھ گئی تھی۔ اس لئے ہمارے صلیبیوں نے مار مار کر یہی غصہ کیا یہاں تک کہ وہ یہاں سے نہ ہوں گے وہاں!

سینے میں سے سب بے پناہ یاد کرتے تھے۔ خواتین تھیں۔ مائیں۔ (عزیزہ شہ نصیر) چھوٹی سی تھیں۔ بھائی بھولی آتی اور میرے کندھوں پر سوار ہو جاتی مگر ہاں کے معاملہ میں نہایت دور دورہ تھا کہ اسے وجود میں دینا نہ سکتا تھا۔ ماشی سے اسے پیار ہی نہ تھا۔ عزیزوں میں احمد خان اور عزیز کی میر احمد خان کے اوپر بنے ہمارے شہر آباد ہوئے۔ ایک نچھٹے بنے اور دوسرے ڈاکٹر ظہیر احمد خان نامور میں تھے۔ ایک بار ان میں نصیر صاحب سے ملے گیا تو غصہ میں تھے بنے گئے، ظہیر کی حرکت دیکھ کر "میں نے کھر کے بعد خط لکھا اور اس میں اپنی خیریت کے بارہ میں ایک خط بھی نہیں لکھا" پھر اس خط کا جواب دیا جو یوں شروع ہوا تھا۔ "عزیز کی ظہیر احمد خان ولدہ جد عزیز کی تھا احمد خان"۔ "بم نے کہا" "یہ کیا؟" "میں نے لکھے" سے اس نے دل مانچا بتا ہوا کہ وہ بھی باپ ہے اس لئے باپ کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے۔

بہت برس پہلے کی بات ہے عزیز کی ظہیر احمد خان سے چائے ملاقات ہوئی۔ حضرت نے نہایت بھونڈی داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ ہم نے کہا "بنے ایہ ریش طرازی (اوراری؟) تمہارے ذاتی معاملہ ہے مگر میں اتنا یقین ہے کہ تمہارا باپ تمہیں اس حال میں دیکھتا تو خوش نہ ہوتا" نصیر کی آنکھیں گھٹی ہوئیں۔ اسے باپ کی نعمت یاد آئی ہوئی۔

ہمارے شہر اور است عزیزم ڈاکٹر عنایت اللہ منگل نے جو اقتصادیات کے پی ایچ ڈی اور گولڈ میڈلسٹ ہیں، ہم سے خواہش کی کہ عزیز کی عارضہ نصیر کے رشتہ کی تحریک کریں۔ ہم چونکہ دونوں گھریلو کو جانتے تھے ہم نے موقع جان کر یہ تحریک کر دی۔ نصیر صاحب یکدم خاموش ہو گئے اتنا خاموش ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگے آج مجھے حساس ہوا ہے کہ میری ایک بیٹی بھی ہے جسے مجھے بیابا نہیں ہے۔ درندہ میری آنکھوں میں تو دو ایک مضمون سی پچی ہے اسی کا درندہ کا رشتہ ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے دونوں گھریلو سے خوش اور صاحب ادا میں مگر نصیر صاحب کی خاموشی ہمیں نہ بھوں!

نصیر صاحب کا ذکر تو ایک پیارے دوست کا ذکر ہے کیسے ختم ہو؟ جب قدرت نے ہی وہ رشتہ اچانک توڑ

ایسا تو ہم سے کیسے دور تر کر گئیں؟

موت سے کل دور ستارہ کی ہے

آج! کل تیری باری ہے

-----



## ایک اک کر کے ہوئے کتنے سترے رخصت

پچھلے چند ہی مہینوں میں ہماری ہستی نے ارشد و سترے محبوب ہو گئے۔ جانا تو: ایک کو بے طرب حریب الوطنی میں بیٹھ کر کسی کی سناؤنی سنیں تا سیدھی دل پر چوٹ پڑتی ہے، تاکہ ان لوگوں سے جو اپنا وقت گزار آگئے مٹا رہا ہے، میں ایسا قریبی تعلق نہیں ہوتا کہ جسے قربت اور دوستی کا تعلق چاہ سکے۔ مگر وہ دن ہستی میں چھپتے پھرتے جیتے جاگتے نظر آتے رہیں تو اس کو یقین نہ تھی کہ یہ دن ہمارے پاس ہی نہیں کسی وقت بھی استفادہ کا موقع ملے تو ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ لوگ نہ رہیں تو ہماری کلاس شدید تر ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا ستر ہے۔ دیکھتے دیکھتے منظر بدل جاتا ہے اور وہ آنکھوں سے جھل جھل جاتے ہیں اور ان دنوں ہمیں کوئی سوچ آتی ہے۔ منھوں میں خاک بھر کر دوست سے ہر دہن۔ زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے۔

ہم بہت چھوٹے تھے تو اپنے تایا کے ہمراہ اپنی ہستی کے ایک درویش خواب کی دیوڑھی پر چایا کرتے تھے تایا تو اپنے کار در بانی میں مصروف رہتے مگر صاحب صاحب کے پوتوں میں سے ایک سے کہتے رہتے جو ہمارے ہم عمر تھے درجن سے بعد میں کلاس میں مہیشیں کا موقع بھی ملا۔ انہی خواب صاحب کے ایک بزرگ پوتے تھے جنہیں ہم نے دور دور سے بہت دیکھا لیکن قریب آنے کا موقع نہ ملا۔ آخرت کے بعد یوں ہوا کہ ان سے تھوڑا تھوڑا بھی تعلق پیدا ہونے لگا کہ صاحب ذوق تھے۔ پھر ہمارے بزرگ بیٹا مولوی عبدالکریم لندن سے آتے تو ان کا بڑا صاحب کی موٹر ان کی موٹر میں رزقی۔ اس سہولہ دارائی کرنے کا موقع ہمیں ملتا کیونکہ چچا کا خیال تھا کہ پاکستان میں ڈرامائیٹک کرنا ان جیسے کہ مشق ڈرامائیٹک کے اس کارڈ نہیں۔ یوں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ ہم لاسور میں پڑھتے تھے تو دربار میں ان سے علیک سلیک ہوتی رہتی۔ اصل تعلق اس وقت پیدا ہوا جب ان کے صاحبزادے ہمارے شاگرد ہوئے۔ ایک خواب کے پڑاوتے دوسرے خواب کے پڑتے تھے۔ دو کے صاحبزادے۔

موسےؑ کے ساتھ چلے گئے۔ چنانچہ اس طرح اس طرح سے چلے رہے تھے۔ وہی ہے  
 تھالی رہی۔ ہم شہسپتے تھے۔ اس دن وہاں میں آئی تھی۔ اس نے اس کا عقد اس بات کہ  
 اس کے ساتھ کونہزیوں کی جوتیوں سیدھی کرتے۔ ایک۔ اس کے پیرا ایک بار میں جی میں نہ کہ  
 مامور وقت کی جوتیوں میں بیٹھے کو پہنے سے فخر سمجھتے تھے۔ ہم جس خواہش کو کر رہے ہیں وہ خواہش  
 میں ہوا کہ حمد خان تھے۔ وہ ان کے والد خواجہ محمد علی خان تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا حمد خان  
 صاحب کی رحلت کی حد علیٰ قدر تک اس رویش خواہش کا چہرہ آنکھوں کے سامنے چہرہ رہا۔ ہات  
 کرنے میں دھیمے مہمان نوری میں مستعد آئے آئے۔ کئی باریوں میں کہ ان کی کوئی پادری میں  
 کھانے کا وقت آ گیا تو وہ بڑا صاحب خود اپنے کمرے میں غافل خانہ میں بات چیت کرتے۔  
 خود کھانے کو اپنے کپانی سے۔ نوکر چکر موجود میں مہمان کی خدمت میں نہیں لطف آتا تھا۔ خاموش طبع  
 تھے۔ یہاں وہ تھیں۔ یہاں کرنا نہیں نہیں۔ تاہم کبھی کبھی مہمان کی مہمانی پر وہاں سوجتے تو ان کا وہاں  
 کھل جاتا۔ یہ ایسے تھے۔ یہ ان کے منہ و اعشاش کرنا د جاتا۔ (وہی دے اسے شش شش لکھتے  
 میں)۔ ہم سے بچپن سے انہیں ایک شہر کیا تھا اس سے ایک رعب اب ان کی شخصیت کا تھا اس سے  
 سب تکلف، دکر کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ مگر جب بے تکلفی ہوئی تو اس میں ہو کہ یہ رعب  
 اب محض ہماری اپنی طبیعت کی وجہ سے تھا۔ وہ تو ہر ایک سے بے تکلف ہو کر مٹنے والے ہیں۔ اب وہ  
 کھٹے ہیں تو ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔ ان کے ہاں ان کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک دوست  
 سیدنا احمد کا شش بھی انہیں دنوں ہوا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے کسی آجر کو جیسا مہمان نہیں  
 دیکھیں مزدوروں کام کرنے والوں کے حق میں رحمت۔ اللہ تعالیٰ اس درویش صفت خواہش کو اپنی رحمت  
 میں ڈھانپ لے۔ وہ ان کے علمی فنیس اور صیغہ کی ماحمت تو ان کی والدہ خلاف میں جاری رکھے۔  
 پھر ہماری ہستی میں دلی کے خواجہ میر درد کے خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ ان کی بزرگی اور طہیت کا ایک  
 رہانہ تو تھا۔ ہم نے جس کو بھی دیکھا ان کی طہیت کی تعریف میں رطب السان پایا۔ حدیث اور قرآن ان  
 کا فہم تھا۔ ان کا قرآن کا ترجمہ تو اب بھی مقبول خلاق ہے۔ ان کی مہمان نوازی اور عریب پروری  
 نے یہ سچ سچ لوگوں کی زبان پر ہیں۔ معذوروں، ناداروں کی انگیری کرنے اور کمپرس کو پوچھنے



انہیں چیتے دریا کیل چاہتے، لیکن ان کے پاس تو کچھ تو نہیں ہو سکتا تھا، ہمسایوں کی مستعدی کی راہ میں حائل نہ ہو۔ سرینویں چاہے، راتوں میں بھی تپا پاؤ تو بے۔ اللہ تعالیٰ۔۔۔ ماپ کے مٹی میں اس کا کھانف مل جا رہی رکھے۔ میری اقیقت دان کے کسی بچے سے نہیں جلتا اس دور میں مٹی کا ایک بچہ قمر حسین ہے جس پر اس کے تھوڑے بھائی بھائی کے علم اور قلم میں برکت ہے۔

یہ تو ہماری نسی کا ذکر تھا۔ ہماری چٹی گلی کے دو بزرگ انہی دنوں گئے۔ درہماری گلی کی رونقوں کو ساتھ ساتھ گئے۔ قریشی محمد فضل اور مولانا رشید احمد چغتائی۔ قریشی فضل صاحب کو ہم نے ہجرت سے پہلے چٹی بستی کے "افضل بر درز" کے حوالے سے جانا۔ ان کی دکان مشہور خلافت تھی مگر میں یہ انہیں۔ ہر کسی کی دکان پر گئے ہوں۔ تھا ہے کہ بڑے بارہ میں آتے جاتے وہاں سے گزرتا تھا۔ دوکانیں ذہن کے پردہ پر کل کی طرح آج بھی لکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی دکان "در علی" و "برینڈ سنز" دکان۔ پھر ہجرت کے بعد چٹی بستی میں آئے تو ان کی دکان پھر پہلے پہل اس بستی میں قائم ہوئی۔ ادھر ان لوگوں نے گھر ہماری گلی کی نکل پر بنا یہ منڈی کی طرف سے داخل ہوں تو دائیں ہاتھ پہلا مکان ن قاقہ اور مشرق کی جانب سے آئیں تو اس زمانہ میں پہلا مکان قریشی نذیر احمد صاحب کا قاقہ بعد کو دیت براہیم ایڈ سنز نے چھین لی۔ قریشی صاحب تو فریتہ میر دین کی شاعت کا کام کر رہے تھے۔ ان کی دکان میں سے عابر قریشی ہمارا اشارہ کر رہا ہوا۔ دوسرے بھائی قریشی محمد اکمل صاحب کوں بازار میں جا بیٹھے۔ ان کا بیٹا انور قریشی ہمارا گروہو۔ اس طرح پرانی بستی کے اس خاندان سے ہمارا ہم سنگی کے۔ وہ بھی ایک تعلق بن گیا۔ ان کے بھتیگوں محمد احمد قریشی درہم قریشی شہید سے کچے وادروں کے زمانہ سے دوستی رہی۔ یہ دونوں بھائی محمد فضل قریشی اور قریشی محمد اکمل صاحب اپنی طرز کے بزرگ ہیں۔ خاموش خلص اور حد سے زیادہ دیانت دار اور مین۔ قریشی فضل صاحب سے تو محلہ داروں کی وجہ سے اکثر آنا سامنا اور علیک سلیک ہو جاتی تھی ہمیں یہ بات بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے قریشی محمد فضل صاحب کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ ریر مہ پڑھتے دیکھ کسی کسی کریمہ کا ورد کرتے ہوں گے۔ ذکر الہی کرتے ہوں گے۔ درود شریف پڑھتے ہوں گے۔ ہم نے اس بات کی کریمہ نہیں کی مگر ہم نے ان کے ہونٹ ہمیشہ دیکھے۔ ہمارا قریشی محمد محمد قادیان کر چکیا کہ وہیں کا ہو۔ محمد سہم قریشی کو اللہ تعالیٰ نے شہادت سے سرفراز کیا اور اپنے پاس بلا

یہ بات سن کر وہاں پہلے نور خانہ میں سے گزرا تھے اس بات کا معنی یہ کہ ہر دارن کے باپ کا ستارہ تھا۔ مگر ان کے قریشی محمد افضل صاحب کا ہے۔ ان کی دعاؤں کا جو اثر تھا۔ یہ ہر رب پین گلی سے کیسوں سے شکر سہارا دیتے ہیں۔ اللہ جان ان کی دعاؤں کا بیش جادو رکھے۔

دھر مشرق کی جانب ستاویں کھڑا مقبلہ شیخ محبوب عالم صاحب خاند کے مکان کے ساتھ سو۔ ہار شید احمد چغتائی صاحب تھے ہمیشہ کد پر سنیڈ چڑی باندھ کر باہر نکلے دے۔ یہ میں اپکن ہم نے ہمیشہ دیکھی۔ ایک ضلع دہری تھی جسے بھر رہے تھے۔ ہا دہریہ میں برسوں رہے۔ عربی خوب جانتے تھے جن لوگوں نے ان سے پڑھا ہے (دوران میں ہماری بیٹہ بھی شامل میں) وہ ان کے تحریر کی تعریف کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے ایک گلی میں قریب تر رہنے کے باوجود وہ اسے شفقت کا حلقہ سے نہ ہوا کہ ان کی طبیعت میں خوردوں سے میل ملاپ رکھنے میں جب تھا اور ہماری تمام تر دوستی اپنے سے بڑی عمر کے بزرگوں سے رہی۔ چغتائی صاحب کی دوستی سے ہم محروم رہے مگر ان کی دعاؤں سے ہر بزرگ و دی نہیں رہی وہ گلی کے سب کیموں کے ساتھ مسرتگی کے حق کو نباتے تھے۔ ہر ایک کی خبر گیری کرتے رہنا پیاروں کی عیادت کرنا۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اسی لئے تو ہم نے بتدائی میں یہ لکھا تھا کہ ہماری گلی تھے تھوڑے۔ عرصہ میں اتنے بزرگ لوگوں سے محروم ہو گئی۔ اب شیخ محبوب عالم صاحب خاند ہیں اللہ ان کی زندگی میں برکت دے۔ ہم جیسے غریب لوطن لوگ دعائیں ہی تو دے سکتے ہیں۔ قبیلہ شیخ محبوب عالم صاحب بھی اس کتب کے مرتب ہوتے وقت رخصت ہو چکے ہیں۔ کن کن علیہا فان۔

-----

## ہوا تھی گوتند و تیز سیکن۔۔۔

ہجرت کے بعد قادیان میں جو درویش دھونی رہ کر بیٹھ گئے ان میں کا ایک وجود ملک صاحب الدین صاحب کا بھی تھا۔ وہی ہستی جو پنی تھی پر پی سوئی تھی۔ اہل کو بچے جن میں اپنائیت کا بہن برستا تھا انہیں اجنبیت کا گھن بگھیا تھا۔ جالے مانند نہ پائے رفتن کا مضمون تھا۔ ٹوٹ دار کسج میں محصور ہو کر جان بھیلی پر رکھے بیتیں دانتوں میں زبانت کی طرح بیٹھے تھے۔ باہر کی دنیا سے صرف دعاؤں کا رابطہ تھا۔ انہیں سب بات کا یقین تھا کہ ان کے اپنے نہیں بھولے نہیں بلکہ ان کی یا، میں بے قرار ہیں۔ دن رات ان کی سلامتی کی دعائیں کرتے نہیں تھکتے۔ شعب ابی طالب کی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ وقت کی حنائیں رفتہ رفتہ ڈھیلی ہونے لگیں۔ حارات میں بھڑک پیداسوا۔ باہر کی دنیا سے رابطہ سونے کی موہومی صورت سویدا ہونے لگی۔ ان محصور درویشوں کی پامری اور دوسری نے تاریخ کا سینہ تن کر دیا۔ اجنبیت کے ہا دل چھٹنے لگے اور زندگی معمول پر آنے لگی۔ ایسے جاں کا وہ حوس میں جس شخص نے قدم کو ہاتھ سے رکھ کے نہیں دیا تھا پچھلے دنوں موت نے اس کے ہاتھ سے قدم رکھوایا۔ اور درویش منہم من قصصی تعبہ کے زمرہ میں شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین۔ کیا صاحب قدم تھا کہ جان بھیلی پر لئے پھرنا تھا مگر تاریخ کے اور قیادہ کو محفوظ کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ اس کے لئے دن دن تھا نہ رات رات تھی، قلم تھا اور وہ تھا۔ ایسے ٹوٹ بہت کم ہوتے ہیں اور وہ تو میں خوش نصیب ہوئی ہیں جنہیں یہ دیوانہ وار کام کرنے دے مل جائیں۔

ہمارے سے تعلق قادیان کی ہمسائیگی کا تعلق تھا۔ ہم ان کے دیو رچ کے پڑوسی تھے۔ ہم نے اپنے ہوش میں جب بھی نہیں دیکھا ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہی دیکھی۔ اس زمانہ میں یہ تو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے یہ ہم سائے بھی دنیا میں جانے پہچانے ہیں۔ بعد میں جا کر اندازہ ہوا کہ ہماری طرح محض دب ہی نہیں چھانٹنے اپنے قدم کو سلسلہ کی خدمت کے لئے وقف رکھتے ہیں۔ ہمارے چھو پچھ حضرت

مہمانوں کی خدمت میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ حقیقتاً یہ وقت ان سے چھوٹا چھوٹا ہے چھتے رہتے۔ آتے  
 آتے بیٹھتے۔ چھتے رہتے۔ یہاں تک کہ وہ اس میں نہایت بڑا حصہ لے لیتے۔  
 مستروں کا ہمارا بڑا اس سے بھی راجہ اور تہ اس سے ملک صلاح الدین صاحب ہمارے گھر کے  
 ایک فریبی تھے اور قادیان میں محمد اری کے سر کے حقیقت یہی تھے حق ہمسایہ ہاں جایاں لوگوں کے  
 راجہ محض نہ تھے گھر کے ہاں قادیان میں دربار کا ہوا میں جیتا جاتا رہا یہ ان گئے تھے۔ جب  
 دو سو سالوں کے مابین آمد و رفت شروع ہوئی اور قادیان کے دربار کا ہوا جو آئے کا موقع ملتا تو ہمارے قوی  
 خیال ہے کہ ملک صاحب جب آئے تو حضرت مصلوٹ موہو، در حضرت مرزا بشیر احمد صاحب سے ملنے کے  
 بعد سیدھے گھر پہنچے آئے تھے اور پچو چاقی سے لکھے لک کر ٹوٹ کر ملے تھے۔ ہماری چھوٹی جی نے  
 اپنے بچوں کی طرح ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ کئی سال بعد ان کے برابر محترم اپنے بیٹے کے لئے بھائی  
 جاسم محمد نعیم مرحوم کی بیٹی کا رشتہ بیٹے سے تو اور پچو نہیں کہا صرف یہ کہا تھا کہ میں اپنے بزرگوں کی داد  
 میں سے ایک بچی کا رشتہ مانگ رہا ہوں اور ہم نے ہاں چون وجہ اس رشتہ پر صادر کر دیا تھا۔ قادیان کی  
 ہمسائیگی اور ملک صلاح الدین کا خاندان اور ہمسائے کس چیز کی ضرورت تھی۔

ملک صاحب نے سلسلہ عالیہ احمدیہ کی جو خدمت کی اس کا صلہ تو اللہ تعالیٰ ہی دے گا مگر ایک نازک وقت  
 میں یہ نازک مہم شروع ہوئی لینا اور چھ ساری عمر اس کی تحقیق و توثیق کیا دینا بھاری کا کام تھا۔ یہ  
 مردے دہر کا ہے۔ سلسلہ کی ابتدائی تاریخ تو حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی نے محفوظ کی اور اب اس بنیاد  
 پر مؤرخ احمدیت مولانا دوست محمد شاہد تاریخ احمدیت کی عبارت استوار کر رہے ہیں اگر یہ بنیاد موجود نہ  
 ہوتی تو عمارت کیسے استوار ہوتی؟ ملک صاحب نے جو کام اپنے ذمہ لیا اور کیا وہ کبھی کسی ایک شخص کے  
 کرنے کا کام نہیں تھا اور اس کا کام تھا مگر ملک صاحب نے تو یہ اس کام میں ہاتھ ڈال اور اللہ تعالیٰ نے  
 اسے قبول فرمایا اور توفیق ارزانی فرمائی کہ وہ اس کام کو اپنی بساط کی حد تک پایہ تکمیل تک پہنچائے مگر  
 فریاد تو یہ کاموں کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے ان بنیادوں پر عمارت ٹھٹھاتے ہیں۔

ملک صاحب نے بروقت اس ضرورت کو محسوس کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سامنے دلوں کی  
 زندگی کے حالات اگر اب محفوظ نہ کئے گئے تو میں ممکن ہے پھر وقت ایسے کام کی مہلت ہی نہ دے کیونکہ

جوں جوں وقت گزر رہا ہے گا ان اصحاب کے جانتے و سمجھتے ہوئے چلے جائیں گے یہ نیکو مردوں کا تعلق ہے۔ انہیں وقت اس بات کا تھا نہیں یا نہ کہ ہرگز سے جو چاہے پوچھنا ہے پوچھو اور نہ چھپے یہ بھی ٹھیک ہے جس بزم سے جس کو تمہارا حوصلہ نے ٹھکڑا کر پانا سکھایا ہے۔

ابھی یاد ہے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحاب مسیح موعود کی راہتوں کو جمع کرنے اور سیرت مہدی مرتب کرنے کی جو توفیق دی وہ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی کام ہے گا کیونکہ یہ روایتیں اس وقت محفوظ رہ سکیں تو معدوم ہو جاتیں۔ ان روایتوں کے بیان کا سلسلہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی جلسہ سالانہ کی تقریروں میں جاری رہا۔ ملک صاحب نے ان اصحاب کے حالات زندگی جمع کرنے اور چھاپنے کا بیڑا اٹھایا اور تنہا یہ کام کرتے رہے اور یہ اللہ اگر توفیق دے انسان کے بس کا کام نہیں۔ ہمیں خلیفہ کی توقع نہیں کہ ملک صاحب کو ان حالات کے حصول اور پھر تدوین اور پھر اشاعت کے لئے جو اخراجات اٹھانا پڑتے تھے ان کا کیا انتظام ہوتا تھا مگر خاطر ہے کہ حالات حاصل بھی ہوئے مدون بھی ہوئے اور زیرِ مصلح سے آراستہ بھی ہوئے اور اب انہیں بنیادوں پر لوگ آگے کام کر رہے ہیں۔

ملک صاحب مدین صاحب کی سیرت کے بارہ میں جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں وہ بھی اپنی ذات میں عجیب ہے۔ قادیان میں جب ملک صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہم سے پہلا سوال یہ کرتے کہ حضرت موعود صاحب کیسے ہیں؟ پھر فردا فردا اتمامِ گمراہیوں کی خیریت دریافت کرتے۔ ہماری پھوپھی جی کو استانی جی کہہ کرتے تھے اور سارا محلہ ہی انہیں استانی جی کہتا تھا۔ یہ کہہ کر وہ شہر بھر کے بچوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ ہم نے ایک مضمون میں جس میں پھوپھی جی کا ذکر خیر تھا یہ لکھ دیا کہ قادیان کا شیعہ ہی کوئی بچہ ایسا ہو جس نے پھوپھی جی سے قرآن نہ پڑھا ہو۔ اس پر کسی بزرگ نے کہا بھئی اپنے محلہ تک ہی ہات رکھو کیوں سارے شہر تک اس دائرہ کو محمد کرتے ہو؟ ہم چپکے ہو رہے کیونکہ ہمارے ناقصِ علم کے مطابق دور دور کے محلوں کے بچے بھی پھوپھی جی سے قرآن پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ مضمون ملک صاحب کی نگاہ سے بھی گزر۔ قادیان سے ان کا خط آیا کہ تم نے بالکل ٹھیک لکھا ہے استانی جی سارے قادیان کے بچوں کی استانی تھیں اور شاید ہی قادیان کا کوئی بچہ ایسا رہا ہو جس نے ان سے استفادہ نہ کیا ہو۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ



تعلیم کے نام پر بات و سماعت میں نہ آئے ایک طرف سے جس کی روٹی۔ اس سے یہ بات بھی حرام  
 مانتے تھے۔ ملک صاحب نے اپنے حوالے سے دئے مضمون بڑھا جس سے نئے نئے حوالے ملے  
 طرح میں تھے جو تو جیسے نہیں۔ اور اس کے لئے پر حصار تھیں کھینچے۔ اور یہاں سیدیں  
 میں اس کے کئی حوالے تھے جس میں انجیل کے بعد یا مسند کے اور مسند پر ان میں جیسے ایک ایک صاحب  
 یہ ساری رائے اس تھی مگر اس کے بعد کے بارے میں پتہ نہ تھا کہ یہ صاحب پڑھتے تھے اور لکھتے تھے ان کے حوالے  
 قرآنی بھی کرتے تھے یہ سنت بہت کم مانوں میں ملتی ہے۔ اصل دہا یہ کہتے ہیں کہ جو لکھتے اور دوسروں  
 کے لئے لکھ کر پڑھنے کا طلبہ کرنے کا حوصلہ کھتا ہے وہ بہت بڑا دہا ہے۔ ملک صاحب نے بھی  
 ایسا ہی ہو کر لکھا ہے کہ یہاں نہیں کیا ہوگا مگر ہم تو انی کہتے ہیں کہ وہ بہت بڑا ہے۔ یہ تھے کیونکہ وہ لکھنے والوں  
 کے حوالے قرآنی کرتے تھے۔ بعض شعراء کے بارے میں دہاؤں نے ان کے 'بے فیض' ہونے کی یہ  
 دلیل دی ہے کہ وہ ان کے 'فیض' تھے کہ اپنی رائے کے انصار میں نہیں تھے۔ ہم نے اپنی جماعت  
 کے بزرگوں کو فیض رسان پایا۔ اہم ترین اثر 'حمد تھے' حضرت حافظہ حق واحد شہجہان پروری تھے  
 حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل تھے۔ چرمہ خیرین میں روشن دین تھوڑے بھائی مسعود احمد صاحب دہوی  
 ہیں سیم ستمی تھے یہ دہاؤں کی جماعت کے کسی فرد میں ادنی صلاحیت و ریلقہ دیکھتے تو اس کی حوصلہ افزائی  
 کرتے تھے۔ ملک صاحب بھی صاحب فیش تھے ہم جیسے دور بیٹھے ہوئے ان کے فیض سے مستفیع ہوتے تھے  
 تو اس کے قریب رہنے والوں نے ان سے کیا فیش نہ پایا ہوگا۔

ہمیں ۱۹۵۹ میں یعنی تقسیم ملک کے کوئی گیارہ برس بعد قادیان جانے کا موقع ملا۔ ملک صاحب رہا کہ  
 بے حد مصروف تھے مگر ہمیں خود اپنے ساتھ لے کر مکہ دار الفضل گئے اور ہمیں ہمارے بزرگوں کے مکان  
 رکھے اور ان کا ذکر خیر کر کے سب دیدہ ہوتے رہے۔ ہمارے گھر میں آدم کا جو درخت تھا وہ اس وقت  
 تک موجود اور شہرور تھا۔ اس کے نیچے چار پائی بچھا کر بیٹھے تو ان وقتوں کو یاد کر کے سسلیں بھر بھر کے  
 رائے کہ اپنا بیٹھ کر دو پچو پچو جی سے اس لایا کرتے تھے۔ ہم نے انہیں یاد دایا کہ ہم نے اپنے دادا  
 جان کی جو تصویر دیکھی ہے اس میں وہ اس آدم کے نیچے چار پائی پر بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہیں اور ملک  
 صاحب کو یہ بات بھی یاد تھی۔ ان سے اس کی یہ معلوم ہوا تھا وقت رک گیا ہے ان کی باتوں میں مدامت اور



دو تین سفر نامے

## جادو، جادو، جادو پیکانی

یورپ میں رہتے ہوئے بھی ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرنا اتنا مشکل ہے کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں سویڈن میں تو سفر اتنا آسان ہے کہ اپنے پڑوس کے شہر تک ہالمتک ایک بار جانا سو ڈوبار سو چھ پڑتا ہے مگر ہمارے نئے لہذاؤں نے ہمارے شاگردوں کی وسعت سے سفر آسان اور راستے کشادہ کر رکھے ہیں۔ بھی پچھلے برس انگلستان اور جرمنی کا سفر کیا تھا۔ اب کے پھر تعلیم الاسلام کانٹنٹ وینڈ وائر ایسوسی ایشن والوں نے جرمنی بلایمچھا کہ جدید رود شاعر کی میں احمدی شعر کا حصہ کے عنوان پر لیکچر دیں۔ کانٹنٹ کے پہلے یورپ کے "لندن" ہوئے میاں عبدالمسیح نون پستان سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کی صدارت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو خوش رکھے کہ اس سال پھر انگلستان اور جرمنی جانے کا موقع ملے گی یا نہ صرف جرمنی و انگلستان کا سفر میسر آئے بلکہ سویٹزر لینڈ، آسٹریا، سنٹ مارٹن، فرانس کو بھی جھانک آئے جرمنی کے بیک فورسٹ کو بھی دیکھ جمیل ٹی ٹی کی کا لٹر رو بھی کر لیا۔ موڈ بند نے پچھلے برس کی اپنی غیر حاضری کی حد تک ہی نہیں کی جتنے دن ہم اس کے پاس رہے وہ پاب رکاب ہی رہا اور ہم جادو جادو، جادو پیکانی کرتے پھرے۔ "گرہا رہے ساتھ" دی دیرینہ بیماری وہی ناخوشی دل کی "والی علت نہ لگی ہوتی تو خدا جانے درکن کوں سے مقادیر کی سیر کروا دیتا۔ اس لئے ہم ان سب لوگوں کے احسان مند ہیں جو اس سفر کا سبب بنے اور ہماری سیر و تفریح کا اہتمام کیا۔ لیکچر دینا اور مشاعرے پڑھنا تو اب ایک عام سی چیز ہو گئی ہے اور اس سے ہم نے بڑے سبق حاصل کئے ہیں مگر شاگردوں کی محبتوں میں شراہور میں۔ اللہ کا کرم ہے اور نہ ہم کیا ہماری حیثیت کیا

جرمنی جانے کا پروگرام بنا تو حسب دستور نصیر شاہ درمیان میں آگئے کہ وہ اپنے ایک پاکستانی دوست کے اعزاز میں رنگھم میں ایک شعری نشست کا اہتمام کر رہے ہیں اس لئے ہماری موجودگی ضروری ہے۔ ہم مان گئے ورنہ اسی حساب سے غولیا۔ بریڈ فورڈ کا انگلستان میں ایک چھوٹا سا پاکستان کہلاتا ہے، کب

نے ہاں "نشت" نہ تھا۔ باری ملک کاٹ کر کے حملے کی انتہا یہ کہ سب کے برید فوراً جانے لگے۔  
 ہمارے نہیں رہیں۔ اور "نشت" نہ تھا جسے ہم پہاڑی نشت سمجھتے تھے۔ گئے تھے نہیں۔  
 تھام میں لڑائی تو کان کڑے ہوئے غم نہ نہیں تھا۔ سے تھیں یا اور اگلے روز برید فوراً جانے والی اس  
 میں بیٹھ گئے۔ نڈس سے برید فوراً جانے میں چار گھنٹے تھے ہیں۔ ہمارا نہیں تھا کہ آج سنا تو ہم ملے  
 کرے بریک تھا۔ بیٹھے ہیں باقی دو گھنٹے کا سفر تھا۔ باری ملک کو دو گھنٹے کا حساب رکھ کر مصلح کر دیا کہ ہم  
 گیا رہ بجے جیسے کے در کوئی ایک ڈیزل بجے نہیں گئے۔ ریر روشن ہو چکی تو باری کا فوٹو کیا کہ حساب  
 کوئی کوئی ایک ڈیزل بجے نہیں آتی پہلی کوئی تین سو اسی بجے پہنچتی ہے آپ کون سے سوئی سے سفر کر رہے  
 ہیں؟ وہی ہو جس بات کا ذکر تھا رستے میں کس تیر کا گھر تھا۔ معلوم ہوا کہ منگھم سے برید فوراً تک چار گھنٹے  
 لگتے ہیں اور اس حساب سے ہر دو رو کا وقت سین دو وقت بنتا تھا جس سے ہمیں باری ملک نے منع کیا  
 تھا کہ تین سے چار بجے تک وہ شہر سے باہر مصروف ہیں اس سے ہم میں اور چار کے درمیان برز نہ آئیں  
 اور ہم نے اپنی دانست میں اتنی حقیقت تھی کہ یہ ڈیزل بجے تک پہنچ جائیں تاکہ باری ملک کو کوئی وقت  
 نہ ہو۔ اب کیا ہو سکتا تھا وہاں پہنچنے تو باری کے آجا جان ہمارے منتظر تھے ان کو ہماری پیشانی کے لئے آنا پڑا  
 تھا۔ اگر "پسر" نہ تھا "چرا" نہ تھا!

بریک تھم کی شہری نشت واقعی "نشت" تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں کوئی پالیس پچاس آدمی ٹھہرے  
 بیٹھے تھے۔ مشعرہ فرشتی تھا۔ ابھر ہمارا حال یہ ہے بیٹھ جائیں تو وہ حال ہوتا کہ حضرت شیخ جہاں بیٹھ گئے  
 بیٹھ گئے۔ کوئی دوسرا ہی اٹھائے تو ٹھہر سکتے ہیں۔ گھنٹوں نے زمین پر بیٹھنے کی حد تک بلکہ یوں کہے کہ فرشتی  
 مشعرہ کی حد تک ساتھ دینا چھوڑ رکھا ہے۔ طوعاً کرہاً بیٹھے تو یوں بیٹھے جیسے کوئی بوسیدہ دیوار بیٹھتی ہے۔  
 جب شعرٹ نے کی باری آئی تو بھی، وزانو بیٹھنا مشکل نظر آیا۔ بعد میں وڈیو دیکھی تو محسوس ہوا ہم ایسے  
 شعر پڑھ رہے ہیں جیسے کوئی بچہ گھنٹیوں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نصیر شاد صاحب سے نشت شروع ہونے  
 سے ذرا پہلے ملاقات ہوئی تب اندازہ ہوا کہ اس نشت کے اہتمام میں شاد صاحب قبلہ بھی محفل مہمان  
 ہیں میزبان نہیں۔ جی تو چاہتا تھا اسیں کہیں جناب یہاں بنا کر آپ نے ہمیں دوسروں کے حوالے کیوں کر  
 دیا ہے مگر ان کی مسکراہٹ سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی عزت کے مارے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی اندازہ

میں تھا کہ میرا ہاں مہمانوں کو اس بیگ میں لے کر کے مشعر وادی سون پر پہنچا دیا۔ وہ تو  
حق یہ کہ وہ سور سے آئے۔ مشعر مہمانوں کا۔ اور میں نے ان کے لئے کھانا رکھا۔ وہ اپنے شغل  
کی صورت نکل آئی۔ ورنہ ہم ان اجیوں میں کسی کو جتن کو تلاش کرتے رہ جاتے۔ مندر سے بخش  
اپنی اور اچھے راہدار اقرار کرتے ہوئے تھے۔ مقامی شعر میں یا سبک حسیب تھیں۔ اپنے چغتائی صاحب  
تھے۔ اقبال ندیم صاحب میر جانی کر رہے تھے۔ مہمانوں میں سے ایک مبتدی سے شاعر تھے عزیز محمد  
کی کتاب کی تقریب رہنمائی ہوئی۔ جب وہ عزیز صاحب پر کلام نہ لکھ سکے تو معلوم ہوا مہمان خصوصی  
نے "ز" پر نقطہ ڈال کر انہیں "عزیز" کر رکھا ہے ورنہ اس قابل کہاں تھے کہ صاحب کتاب ہوتے استاد  
کی کا فیض تھا۔ ہوری قنوی کی جیسے تھنی مسکن خصوصی سے تھی۔ ہم نے جہ بھی دیا کہ صاحب کتاب بنا  
دیا ہے تو شعر کہنا بھی سکھ دیتے۔ وہ حضرت مسکرا کر چپ سو رہے۔ مشعر کے بعد لندن سے آئے  
وہ ایک شاعر نے میں ملکہ دے جا کر پوچھا آپ کو متنا معاوضہ ملا ہے؟ ہم نے کہا ہم تو نصیر شاہ  
صاحب کے مہمان ہیں ہمیں معاوضہ سے عرض نہیں۔ وہ بڑے حیران ہوئے اور اپنے معاوضہ کی رقم ہمیں  
بتائی اور کہا کہ آپ تو دیار غیر سے آئے ہیں آپ کا معاوضہ تو کہیں زیادہ ہونا چاہیے۔ ہم نے ان سے کہا  
آپ نصیر سے پیشہ ور شاعر ہم محض استاد ہیں شاعری کو بیچ جانتے ہیں اس سے معاوضہ کی خاطر مشعر  
نہیں پڑھتے محض دوستوں شاگردوں کا دل رکھنے کی غرض سے مشعر میں شریک ہوتے ہیں۔ انہیں  
وہ فلسفہ ایک آنکھ نہیں بھرا فوراً بھاگ گئے۔ وہ غالباً ہمارے معاوضہ کا حوالہ دے کر اپنے معاوضہ میں  
ضادہ کر دنا چاہتے تھے۔

اس مشعر کا بڑا فائدہ یہ ہو کہ مطبع اہل در سے کوئی چالیس یا پچاس سال کے بعد ملاقات ہو گئی سی  
بار یافت کو ہم نے پناہ دے دیا۔ وہ دو چغتائی صاحب کی نظم کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کے لئے مجلس  
میں شریک ہوئے تھے ورنہ مشعر وہ کہاں تھے۔ اپنے بزرگ صوفی عبداللہ بریلوی کی سنت کی پیروی میں  
ترجمے کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ہم کالج میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے تو پہلے سال ہی کالج کے مجلہ  
اسرائیل کی مجلس داریت میں شامل کر دئے گئے۔ چیف ایڈیٹر مطبع اہل در تھے۔ وہ کالج سے ریجنیشن کر  
کے نکلے تو ایسے غائب ہوئے کہ اب چالیس برس کے بعد نظر آئے۔ فرما نے لگے جب تم نے اپنے ایک

مومن میں یہ کہہ سکتا کہ مطلع اندر اذہار معلوم کن سے اور کہاں نہیں تو میں نے تمہیں بھی سمجھو یا تھا کہ میں نہیں رہا ہوں۔ ہم نے کہا کائنات یہ تو اس غم میں رہتے ہیں کہ ہمیں یہ دیکھ نہیں رہا۔ مگر یہ وہ مشہور چیز تھی کہ قتل گئے ہیں تو اس باغ باغ ہو رہا ہے کاشی مدت کا پنہاں سو دوست مل گیا دوتے ہست کہ یہی مر رہا ہے گاہے۔

ظہر روز برید فوراً نہ ہوئے۔ موسم ہوا لودھا جوا لگتا تھا دنوں وایک کھ نہیں بھتا مگر ہم مریوں میں جیسے ہوئے لوگوں کو چھ لگتا ہے۔ پھر خدا بگتی بات ہے کہ جیسے موسم میں ہنرے کارنگ ہی کچھ اور سوتا ہے اور اس موسم میں مارے یورپ پر ہنرے کا راج ہوتا ہے۔ اترتی چڑھتی میں کھاتی ہوئی سڑک، ایک متوازن اور معین رفتار پر ہوا ہے باتیں کرتی ہوئی بس وہ جو زمین پر چڑھ گئے کے سفر کا بوجھ تھا اتر گیا اور طبیعت آسودگی محسوس کرنے لگی۔ رستہ میں دو چار شعر بھی سو گئے۔ اس طرح ہم اپنی روایت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس تو مشاعرے پڑھنے نہیں پڑھیں تو ہمیشہ تارہ ترین کلام سناتے ہیں لوگوں کی طرح ایک ہی غزل کو بقول شخصے ”ری پیٹے“ نہیں چلے جاتے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو برسوں سے ایک ہی غزل ہر مشعرہ میں سناتے تھے جس کی زمین ہے ”فرہاد ہونا چاہیے، ایسا ہونا چاہیے“۔ وہ یہ غزل سنار ہے تھے کہ ہم نے آواز دہرایا ”اس غزل کو صاحب دل دہونا چاہئے“۔ سارے سامعین نے بیک آواز یہ مصرعہ اٹھالیا اور اپنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اب وہ اپنی غزل کی اولاد لوگوں کو سناتے ہیں ”رچہ وہ“، وہی اب سن بلوغ کو پہنچنے والی ہے۔ ایسی حرکت کرنے والے اپنی اس حرکت کا جو یہ پیش کرتے ہیں کہ مشعرہ کے سامعین کے ذوق کا اندازہ نہیں ہوتا اس لئے ہر شاعر اپنا ایک کلام ہی سناتا ہے جو مشاعروں میں مقبول ہو چکا ہو۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ شعراء ایک ہی چیز کے قول عام پر توجہ کرتے کیوں بیٹھ رہے ہیں؟ اچھا کلام خود بخود لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لے گا ہاں بعد میں فرمائش پر وہی پرانا آرمودہ کلام بھی سنایا جاسکتا ہے۔ ہمارے یار نور مسعود نے بنیان کا جگہ کیا بنایا اب لوگ ہر مشعرہ میں اسی کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس کا نقصان لوگوں کو نہیں انور مسعود ہو رہا ہے جو کسی نظم پر کے ہوئے ہیں نئی چیز لکھنے کی تحریک کیسے ہو؟ نہ بنیان کبھی ہے نہ سامعین کی جان چھوٹی ہے نہ انور مسعود کے ہاں نیام آتا ہے۔

برید فرما جاتے تھے شفیق اور درپس سے گذرے۔ چنانچہ امتحانات جامعہ قس کے تھے۔  
 دیکھتے ہیں بھی آتے۔ بعد و عہد ہو کہ ہمارے ادارے میں وہ۔ مثلاً۔۔۔ صدر محمد احمد  
 محمد الدین احمد علی درپس سے تشریف لے گئے۔ ہمیں اس وقت میں تیس فی گز دیو سنی۔ اور  
 محمد الدین احمد علی تھے درمنداوقات پہلی بار علی علی احمد کے ایک عزیز دوست کے بارہ میں  
 چچہ بیٹھے۔ وہ چچہ چلی گئے۔ ہوئے تو ہمیں ادارہ کو کہنا کہ صاحب علی گز سے تشریف نہیں لے  
 آپ نے خود ہی صاحب فرمادی کہ میرا تخلص مختار ہے اور علی گز والے اکثر مختار محمد الدین احمد رز تخلص  
 کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس مشعرہ میں سننے والے آپ نہیں گئے۔ ہوں کچھ  
 کچھ بھر گیا۔ سامعین میں بچہ ہمارے شاعر تھے، چچہ مقامی لوگ۔ سابق اور مسٹر جناب محمد عجیب بھی  
 تشریف لائے ہوئے تھے۔ آپ شیخ پروتھو احمد سونے درسیا سیو جھ بوجھ کی باتیں ہیں۔ مشعرہ کی  
 رد و رکھنا مقصود نہیں مگر جیسے جیسے شعر سننے میں آئے۔ برید فرما میں عزیز کی باری ملک نے سی سی اور  
 سماجی حلقوں میں خوب جان پہچان بنا رکھی ہے۔ پہلے روز ہی ڈیلی ٹیکراف کے فوٹو راز کو اپنے استقبال  
 کے لئے آیا ہوا پایا تو تھا ٹھکانا مگر دوسرے روز سن راز برید یو والوں نے۔ یہ انٹر دیو کوئی چالیس منٹ تک  
 نشر کیا تو اندازہ ہوا کہ باری ملک نے میڈیا سے خوب تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ اردو بولنے والے  
 حلقہ میں خاصی یکجہتی سے درمندا ہے اور یہ بات اس کے حق میں اچھا نشان ہے۔ محمد عجیب صاحب  
 نے اپنی تقریر میں تاریکین وطن کے سب جہد کو سر ہاک وہ لوگ ادیبوں اور شاعروں کو ملاتے اور اپنی زبان  
 سے دلچسپی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں مگر ہم نے اپنی تقریر میں یہ سوال اٹھایا کہ اس نسل تک تو آپ اردو لکھتے  
 بولتے پڑھتے ہیں کیا علی نسل بھی ایسا کر سکتی ہے؟ اپنی اگلی نسلوں کی فکر کریں۔ اردو بولنے تک تو بات  
 جو صد افزا ہے مگر نئی نسل میں کتنے لوگ ہیں جو اردو لکھ اور پڑھ سکتے ہیں؟ سنی سنی ایسا نہیں کرے گی تو  
 ادب اور شعر کے ساتھ دلچسپی نہیں رہے گی دراپنے پھر سے رطلوث ہو جائے گا۔ اس سوال کا جواب کسی  
 کے پاس نہیں تھا۔ یورپ میں ہی نہیں برصغیر سے باہر رہنے والے سب لوگوں کا یہی مسئلہ ہے۔ سوئیڈن  
 میں بھارت کے طلباء ہندی سیکھتے ہیں اس سے ہندی و سنسکرت کے کورسز موجود ہیں اردو کوئی نہیں پڑھتا  
 اس لئے اس کا وجود ہونے کے باوجود کوئی کورس جاری نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ”مختلفہ مضامین“ پریسیڈنٹ



اے۔ ان دونوں حوالے سے ہیں۔ یہ عقیدہ آئندہ سویر تک مسلمانوں کی خدمت کی اس  
 سے دینی مافیہ کی۔ امت اسلامیہ کی تائید و حمایت کے لئے۔ یہاں تک کہ اس  
 کو دینی کاموں کے حوالے سے پڑھائے جاسکتے ہیں باقی رہے ہم اللہ کا۔ یہاں کی پڑھائی میں  
 رہے ہیں تو انہی میں پڑھا چاہئے تو سمجھنا کریں۔ برید فوراً میں نے حضرت امین احمد  
 صاحب سے ۱۰ سالہ بی۔ بی۔ کو بلا کر یہ بھول گئے کہ جب تک یہی نسل اپنے ارد گرد کے متعلق  
 نہیں کرے اور ارد گرد کے متعلق نہیں ہوگی۔ کتنے بڑے ہیں جنہوں نے اپنے مشاغل میں سے  
 یہ وقت نکال کر غلطی تک اپنے ارد گرد کو سچا یا شاید ایک یا دو فیصد تک ایسے ہوں گے۔ اس کی مثال  
 یہ بھی ہے کہ اگر آپ اپنی دکانوں میں قرآن پڑھنا نہیں سمجھتے تو بڑے سوکرا نہیں پڑھیں گے  
 درت کے متعلق کرنے کی بنیاد یہی ہے کہ جہاں جہاں ہے جہاں کہ یہ کتہ لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہتا ہے۔  
 مغربی معاشرہ میں پیدا ہو کر رہتا ہے۔ اپنے صرف اسی صورت میں اپنے وراثتی کچھ۔ منسلک رہ سکتے  
 ہیں جس میں بڑے۔ اپنے ظہر۔ وراثتی کی بنیاد غلطی سے بچیں ہی میں رہیں۔ ہمیں نے ہاتھ  
 اس کتہ کو سمجھا ہے ان کا مین تو ہی لی وی ایم لی اے دیگر دینی پروگراموں کے ساتھ ساتھ اردو کے  
 اسباق بھی شکر کرتا ہے۔ حضرت امام جماعت احمدیہ اردو میں خود دلچسپی لیتے اور بچوں کو اپنی بے پناہ  
 مصروفیات کے باوجود بذات خود اردو پڑھاتے ہیں اس سے احمدیوں کے ہاں وہ تضاد پیدا نہیں ہوتا جو  
 دوسروں کے ہاں ہو رہا ہے۔ اس کا سبب وہ اس طرف توجہ کریں دین میں ان کے مسلک کی پیروی  
 نہیں کرتے تو دنیا کی اور اپنے کچھ کی خاطر ہی اس نیک اسوہ کو اپنا دیکھیں کہ اس میں ان کی دران کی  
 تندرستیوں کی بھلائی ہے۔

برید فوراً میں مشاعرہ کی نفاذ برید فوراً کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک خاتون نجمہ خان کر رہی تھیں اس کے جب ہمارے تعارف کا مرحلہ آیا تو اپنے استاد اور ہمارے شہر عزیز می جاوید احمد کو تعارف کرا نے کی دعوت دے کر سب دوش ہو گئیں۔ جاوید احمد نے ہمارے کہنے کے باوجود تعارف میں خاصی طوس بینی سے کام لیا حالانکہ وہ چار غرضی کہہ دینا کافی تھے۔ نجمہ خان کی بن آئی جب ہمیں دعوت کلام دینے گئیں تو استاد اساتذہ کہہ کر گلی بچھی کہ نکال دی۔ الاحول والا تو ہے۔ ہم کہاں کے، تائیں، کس ہنر کے یکتا ہیں؟



میں سے سوائے ان کے کسی اور کو بھی نہیں دیا گیا۔ سوائے ان کے کسی اور کو بھی نہیں دیا گیا۔

سوائے ان کے کسی اور کو بھی نہیں دیا گیا۔

وہاں سے فارغ ہوئے تو اچانک یہ مشہور ہوا کہ میں نے ضروری کی اور میرا لڑکا ہار گیا۔ افسانہ آگیا کہ وہاں تو ایک جمہور قبیلہ میں پڑھا میں نے یونکہ اگلے روز جرعی پہنچا ہے۔ جمہور کے بعد عزیز کی مرزاقمان احمد نے پڑھ لیا۔ تاہم میرے ساتھ بدریں۔ ہم نے اس عزیز کو سمجھا دیا کہ ہم کو ایک اور۔ پھر کی رخصتی سب نام مذکور میں ہو رہی تھی۔ میں نے شریک نہ ہونے کو "شریک" باتیں بنائیں گے اس لئے آپ نے ہمارے ساتھ جو سوکھا روکھا ہے ابھی اس سے سبک دوش ہو جائیں۔ چنانچہ ہم مرزاقمان احمد کے ہاں جانے کی بجائے ٹیپٹ، دوس میں رفیق روری کے ہاں چاہیٹھے اور مرزاقمان احمد سے اس کے باجمہورت صاحبزادہ مرزانا ناصر احمد نور اللہ مرقدہ کے کالج کے سنہری زمانہ کو یاد کرتے رہے اور ان مشاعرہ و محی جن کا ذکر میں نے "تاقب زبیدی کے ساتھ ساتھ دوائے" مضمون میں بیان کیا تھا۔ ہاں کا ذکر ہو اور سننے والے کالج کے پرانے طالب علم ہیں تو وقت پر لگا کر اڑتا ہے۔ چنانچہ وہی ہو ہوش اس وقت آئی جب شادی میں شرکت کا وقت عین سر پر آیا۔ عزیز کی ویتیم چوہدری نے ہمیں اپنی گازی میں ہمارے میزبانوں کے ہاں پہنچا دیا اور ہم وقت پر رخصتی کی تعریف میں شریک ہو گئے۔ نذیر کو خزانے خیر دے۔

مذکور میں ہمارے قیام ہمیشہ ہی!۔ جی عبدالکریم کے ہاں ہوتا ہے مگر اب کے اتنا کم تھا کہ کسی کی دعوت قبول کرنے کا سوسا ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ہاں خاندان کا کبھی ایسے لئے کہ انہوں نے ہفتے میں پائے کھانے کا وعدہ کیا۔ جب سے اس کی تکلیف اور دشواری کی طرف سے پائے کھانے کی ممانعت ہوئی ہے پائے کھانے کو ٹوٹ کر جی چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسی ترغیب ہو تو ہم کیسے انکار کر دیتے۔ بہت یہ شرط لگائی کہ پائے کھانے کے بعد انہیں ہمیں ہیتھرو رپورٹ تک بھی بروقت پہنچانا ہوگا۔ چنانچہ صبح "پاؤس" سے "شرف" تھمڈ "اصل کرنے کے بعد سیدھے سوائی اڈہ پر پہنچے۔ خالد نے سوائی اڈہ پر پہنچنے میں بڑی جلدت دکھائی۔ یہی سوچا سوچا کہ گر پائے کھانے میں شخص کو ہائی کویتھروڈل کی پیچیدگیوں کا شکار ہونا ہی ہے تو دوسرے ملک میں جا کر ہو۔ ہم دوپہر کے وقت بخیریت فریٹنگٹ پہنچے اور اب تک اللہ کے فضل سے توانہ ورنہ نہ ہوتے۔ اب بھی داؤ گئے تو "پاؤس" سے دو دو ہاتھ کرنے سے نہیں چوکتے!

فرینٹ میں اوار کے راز وہ بچے ۱۰ پہر ترقیب تھی جس کے پردہ میں کھانا بھی شام تھا سم نے بہارت کا کھانا کھا کر دوپہر کا کھانا کھاتا ہے اس سے شہر سے کھانا کھانا کر طینان سے مار میں پینچ تو معلوم ہو دو ڈک کھانے پر ہر نظر کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا بھگے لو، ہم اندر کیوں کر جیسے نیا بیٹس کے ہاروں کے سنے اپنے کھانے کا خون کرتے ہو؟ ہمارے تو کھانے کے اوقات ہی رہے ہیں۔ گھر میں بھی جب ہم ناشتہ کر رہے ہوتے ہیں سارا گھر خواب فروش کے مزے سے رہا ہوتا ہے۔ بھائی یو۔ پ میں صبح پانچ بجے کوئی ناشتہ کیا کرتا ہے؟ دوپہر کا کھانا ہم نے میں چھوڑا حد سات گھنٹے بعد کھا لیتے ہیں وہ وقت بھی شرف کے کھانے کا نہیں ہوتا۔ علی ہذا نقیہ۔ بہر حال لوگ کھانے سے فارغ ہو کر جہاں بیٹے اور "ڈکارے" ہوئے ہل میں پھر جمع ہوئے اور اجلاس شروع ہوا۔

میں عبد المسیح نون صاحب سرگودھا سے "ٹوپی، صدارت" کے طور پر پسند نے والی سرخ روی ٹوپی پہن کر تشریف لائے تھے۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے بعد ہم نے مدقوں بعد کسی کو ٹوپی پہنے دیکھا مگر وہ ہات کہاں مولوی دن کی سی۔ ہمارا خیال ہے چوہدری صاحب کے بعد دنیا سے اس ٹوپی کا رواج ہی اٹھ گیا۔ اک جوتب تھی کہ ساتھ ہی آفتاب کے صاحب صدر نے اپنا خطبہ، صدارت پہلی فرصت ہی میں ارشاد فرمایا کہ خد معصوم لوگ مجلس کے "خرنگ" پیشیں کے بھی یا نہیں؟ خطبہ، صدارت کے بعد دیب شیر بھائی مسعود احمد خاں دہلوی نے ٹھیکہ دلی کی با محاورہ زبان میں اپنا مقالہ ارشاد فرمایا جو ادیبوں کی ذمہ داریوں کے موضوع پر تھا۔ بھائی مسعود احمد خاں دہلوی دلی والوں کی آخری یادگار کے طور پر رہ گئے ہیں۔ ان جیسی زبان کون لکھے گا؟ اشرف صوبی نہ رہے، شہباز احمد دہلوی نہ رہے۔ اب لے دے کے شان الحق حق رہ گئے ہیں یا بھائی مسعود احمد خاں دہلوی اللہ انہیں سلامت رکھے۔ ان کی زبان کا چنچر رہا بھون نہ وہ کہیں ورنہ کرے کوئی"

اجلاس شروع ہونے سے پہلے عزیز کی عرفان احمد خاں نے کہ مجلس کے میزبان تھے ہمیں پوچھا آپ کا پیپر کتنی دیر کا ہے؟ ہم نے کہا میں جتنا وقت تہرہ ہے پاس ہے اس کے مطابق کی پیش کی جا سکتی ہے کوئی کچھ سوا مقام تو ہے نہیں۔ چنانچہ کہنے لگے آپ کلاس لیکچر دیجئے۔ مطلب یہ تھا چار بیس منٹ ہوئے۔ اور ہم نے بند کے فضل سے پندرہ لیکچر ختم کیا تو تین انٹیم میں منٹ اور ساٹھ سیکنڈ ہوئے تھے۔ لیکچر کیا تھا جدید

نہیہ ہاتھ تھک رہی تھی جو دہشتہ اور دھشتہ رہے۔ اس کا نام سنا کلام  
 میں پڑا۔ شعر میں اس کے لیے اس سے نہیں صرف یہ تھا کہ ساعت تھیں اس باب میں کسی  
 جہی میں فرق صرف یہ ہے کہ نہ لوگ عام انہی کی دہشتہ پڑا "حد ران" سے اور دہشتہ پڑا کا نام نہ جانے  
 میں

اس بعد متا ۲۰۰۔ یہ میراں کا فرض تھا کہ شعر اور وقت ہوتا ہے کہ ایک معین وقت کے بعد ہال  
 میں آنا ضروری ہے نہ تیار۔ نتیجہ یہ ہو کہ آخر میں پڑھنے والے شعر کو گھسوا کہ میں کا حق نہ گیا  
 حد تک کسی شاعر۔ بھی تین غزلوں سے کم شعر نہیں سنائے تھے۔ اگرچہ ہر ذوقی طور پر بہت خوش ہو  
 کہ یہ شعر سننے سے بچ گئے کہ ایک سے زیادہ غزلیں سننا ویسے ہی طبیعت پر گراں گذرتا ہے۔ نہ  
 جانے وہ کیسے ٹوٹتے ہیں جو سچ پڑا جائیں تو جانا پسند نہیں فرماتے۔ میں یاد ہے ہم نے ایک مشاعرہ  
 میں شعر کی اکثر تعداد کے پیش نظر میزبان ہونے کے ناظر یہ پابندی لگا دی کہ کوئی صاحب یک نظم یا  
 غزل سے زیادہ نہ سنائیں۔ اور رے ایک دوست نے اس کا بہرہ یوں کیا کہ صرف ایک غزل ارشاد فرمائی  
 جس میں بد مہارہ شعر تھے۔ ہال یہاں بھی "کھچا کھچ" بھرا ہوا تھا مگر اس صاحب باطل خالی تھا۔ اس شاعر  
 نے یہ کام مطلب یہ ہے کہ خواتین نے اپنے والے آدھے حصہ کو پر کرنے کی بجائے پچھلی سیٹوں پر دیک کر  
 جینے اور اپنے "کھس پھس کرنے کے نسائی حقوق" کو محفوظ رکھنے کو ترجیح دی۔ اس نسائی جھے میں بزرگ  
 شاعر جناب غلام محی الدین صادق اپنی چھتار میں مبارک سمیت اکیلے ہی پر کر کے بیٹھے رہے اور حق بھی  
 یہی ہے کہ وہ حصہ ان کی بھر والی ریش مبارک کی وجہ سے بھرا بھر نظر آتا رہا۔ یہ ظہیمین ان کے عصائے  
 جیری سے ڈرتے رہے اور انہیں یہ کہنے کی جرات نہ کر سکے کہ حضرت یہ حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔  
 ان کے عصائے جیری سے یاد آیا کہ ایسا لایو نیورٹی میں ہمارے غاری کے ایک برگ رفیق کا رجمن کا  
 خاندانی نام "جوں مردی" ہے ایک بار گر کر پاؤں کی ہڈی توڑا بیٹھے۔ کچھ عرصہ کے بعد یونیورسٹی شریف  
 آئے تو ایک ہاتھ میں عصا دوسرا ہاتھ اپنی اہلیہ خانم جوں مردی کے کاںدھے پر رکھے ہوئے تھے۔  
 شرف روم میں داخل ہوئے تو ہم نے کہا "بھان اللہ آپ کے ایک ہاتھ میں عصائے جیری ہے اور دوسرا  
 ہاتھ آپ نے عصائے جوں مردی پر رکھا ہوا ہے"۔ سب لوگ ہنسنے لگے پر و فیصر صاحب نے فرمایا "میں

نے اپنے خاندانی نام کاں سے بہتر "بھگت" پہنے نہیں سنا یہاں بھی کتاب - مکی مدین صدق صاحب  
کی وجہ سے وہاں ہندو بچا ہوا تھا۔

اس فرض سے اسوجانے کے بعد ہمارے پاس فریکسٹ میں دروئی کا کرنے کا نہیں تھا۔ اپنے پوت  
شاہد منصور اور اس کی نئی ٹوپی دلہن سے فون پر ربط نہیں ہو رہا تھا۔ انس اور اس کی بیوی پیسے ہی سڑ بھیس  
مل چکے تھے۔ اس لئے ہم نے معاذ اللہ کو فون کیا کہ ہم فارغ ہیں آج وہ معاذ اللہ بھٹی ہمارا چیتا شام سرد  
ہے۔ سھکی کے قریب کا بازار میندار مرگروش روزگار کہ اب یہاں جرمنی میں آیا بیٹھا ہے وہ جرمنی اور  
سوئٹزرلینڈ کے مرنہ پر واقع شہر فرنی برگ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے۔ پتی دیں پہ  
خاک جہاں کا خیر تھا وہ پہلی فرصت میں آ گیا اور ہم نے رخت سمر باندھا۔ آٹو بائیں پر دوڑتے بھاگتے  
کوئی تین چار گھنٹوں میں فرانی برگ پہنچے۔ اس کے چھوٹے بھائی کے ہاں جھانکا۔ وہ عزیز بھی ہمارا شام سرد  
ہے۔ پھر معاذ اللہ کے گاؤں پہنچے۔ مدتوں کا کیا ہوا وعدہ پورا ہو گیا۔ معاذ اللہ پاکستان میں جب کبھی ہمیں  
سکھیکی سے نڈرتے ہوئے دیکھتا صرا کر تا کہ میرے گاؤں چلیں۔ ہم مدیم غرمت ہونے کا بہانہ کر  
کے آئندہ آنے کا وعدہ کر لیتے۔ چنانچہ ہم نے گاؤں پہنچتے ہی اسے کہا لو بھٹی ہمارا وعدہ پورا ہو گیا ہم  
تمہارے گاؤں آ گئے ہیں۔ واقعی گاؤں، کھیتوں اور انگور کے باغوں کے درمیان مختصر سی آبادی، صاف  
ستھری، آستوں سے مگر۔ اس کی بیوی ہمارے ایک اور شاگرد ڈاکٹر عبدالخالق مانگٹ کی بہن لگی دوہرا  
رشتہ ہو گیا۔ ساجد پروین نے ہماری خاطر داری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اللہ اس کو جزائے جزیل دے۔  
میاں بیوی نے اپنا ماسٹر بیڈروم ہمارے لئے خالی کر دیا اور ہم چار دن اور چار راتیں اس پر قیام رہے۔  
کھانے میں بنیر کا گوشت، مکی کی روٹی، سرسوں کا گندلوں والا ساگ، ہر نعمت متی رہی جو شہروں میں نہیں  
مٹی۔ بالکل ایسے گستاخ کوٹ مراد میں زمیندار معاذ اللہ بھٹی کے ہاں بیٹھے ہیں۔ جس روز گئے تھے اس روز  
تو کسی درجہ جانے کی گنجائش نہیں تھی ورنہ ہم اتنے "مائل بہ سیر" تھے کہ سیر پر چل پڑتے تو بید نہ تھا۔ کچھ  
معاذ اللہ آتے ہوئے ایک طرف اشارہ کرتا تو کہتا بس اس پہاڑی کے پیچھے سوئٹزرلینڈ کا علاقہ شروع ہو  
جاتا ہے اور فرانس تو انگوروں کے اس باغ کے عقب میں دھرا رکھا ہے وہ سامنے جو اونچی پہاڑی نظر آ  
رائی ہے وہ آسٹریا کا علاقہ ہے۔ ہم رات کو سونے تو نہیں لکوں کے خواب دیکھتے رہے۔

ٹھہر مارا۔ صبح سویرے یورپ کے سفر پر نکل پڑا۔ سوئے۔ بارش کے راستے سویٹزر لینڈ میں داخل ہوئے۔  
 لندن کے ایک ملک واپس ہوا۔ وہاں رہتی تھی۔ سینیڈا۔ نیویا بھی وہی کمزور صورت نفس۔  
 سویٹزر لینڈ اور آسٹریا کا سن سن ہے۔ یہاں ہے اور بے محاسنوں نے قبضہ کر لیا۔ مظلوم لڑکی کے قوس  
 کے وہ بقی حسن فطرت کو تسخیر کر رکھا ہے۔ یعنی پانی ہے تو تو قوس میں ہے، پہاڑ میں تو ان کے نیچے سے سر نکلتا ہے  
 کر دے سے مگر کرتے ہیں۔ اگرچہ پہاڑوں کے اوپر سے گزرتا ہوتا تو فطرت کے اور حسین منظر دکھنے  
 دیتے۔ باز شہر میں تھوڑی دیر کے۔ گاڑی ایک جگہ پارک کی۔ شہر کے وسط میں گھومتے پھرنے کا راہ  
 یہاں گھبراہٹ ایک طرف جائیں تو تاریا اتر ہے۔ نادر ہے وہیں آتے ہوئے وہی اتار چڑھائی میں  
 بدل جائے گا تو کیا ہوگا؟ ہمیں دل کی بیماری کے ہاتھوں ہر وہ کام کرنا منع ہے جس میں سانس چڑھنے کا  
 اندیشہ ہو کیونکہ سانس چڑھے تو اس کے اکھڑنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ بھاگ سکتے ہیں نہ میز عیساں  
 چڑھ سکتے ہیں نہ سویٹزر لینڈ کے شہروں میں پیادہ دیر کر سکتے ہیں۔ اس سے پتھر کو بھی بڑی جانا چوم کر چھوڑ  
 دیا۔ تاکہ شہر بہت خوبصورت تھا۔ جوانی میں آئے ہوتے تو شہر گردی کا لطف اٹھاتے۔ ناچار پھر ہائی  
 اسے پر پہنچے مئے اور آگے کا رخ کیا۔ پروگرام تھا کہ ایٹلیس کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کریں گے۔ سڑک  
 پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی چلی جاتی ہے اور اونچے نیچے پہاڑوں کا سہرا، بیگانہ جھیلوں میں منعکس ہوتا  
 چاہا جاتا ہے۔ ایک سانے ایک فلک بوس پہاڑ آ جاتا، سڑک اس کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے گویا راستہ  
 تلاش کر رہی ہے پھر رن سے ایک لمبی سرنگ میں داخل ہو جاتی۔ اس سرنگ میں پانچ پانچ چھ کلومیٹر بھی  
 تھیں اور چھوٹی سرنگوں کا تو حساب نہیں۔ مگر ہمیں سرنگوں اور پہاڑوں کے

ساتھ سڑک کی آنکھ بچوں چھٹی گئی حتیٰ کہ ہم ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں سوئے ہوئے شہر فلیو مسر برگ  
 پہنچے۔ دریا جو ساتھ ساتھ چلا رہا تھا اسے عبور کیا، شہر میں داخل ہوئے اور پھر اندر دے اور بندہ لے پہاڑ  
 کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ مل کھاتی ہوئی صاف ستھری سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ نیچے  
 فلیو مسر برگ کا شہر کھونا سا دکھائی دینے لگا۔ پہاڑ کی دھلوان پر گھاس کے قطعے تھے مگر لگتا تھا انہیں بھی  
 باقاعدہ تراش کر ہموار کیا گیا ہے۔ واقعی یہ لوگ حسن فطرت کو تسخیر کرنے کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔  
 اوپر پہلی چوٹی پر پہنچے تو ایک موٹل تھا "میٹ وائس" جو نو رشتوں سے اتانا بھرا ہوا تھا۔ انفرمیشن داؤں

سے پا چھ تو معلوم ہو ایک دن کار یہ کوئی بڑا مال کے قریب سے۔ تو یہ تو یہ وہ میں خوشی سے۔  
 سو میں اس کے سب کر رہی تھی تو سو نہیں سکتے مگر حسن ذوق سے وہ سے کر رہی تھی۔ رات کر،  
 نظم کر، دم لے کر، قدرت کے حسن کی داد دیتا جانتے تھے۔ ہمارے طرح بخت اور غریب اوصی کے  
 ہرے ہوئے نہیں تھے۔ آگے گئے تو لوگوں کے جھنڈ کے جھنڈ پہاڑ پر ہائیکنگ کرتے نظر آئے۔ یہ وہ پا  
 چل کر حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے والے ہاتھوں میں ہائیکنگ وان چھڑا۔ پاؤں میں مناسب  
 جوتے یا جوڑے، کانڈھوں پر تھرموس میں پانی یا کافی۔ ہم ہوتے ہوتے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے  
 آگے ہائیکنگ والوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ آگے سر ہٹک چونی تک جانے کے لئے جیمر غٹ ہے۔ ہمیں  
 کیس رائڈ کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا خود رائڈ کر کے پہاڑ کے دوسری طرف جا پہنچنے کا۔ چنانچہ کچھ دیر کے  
 لوگوں کو واپس اپنی اپنی بسوں کو چوں میں بیٹھتے دیکھا اور سفر کی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔  
 سردیوں میں یہ سارا علاقہ ایک عظیم الشان گلیشیئر بن جاتا ہے۔ پہاڑی سے اترتے ہوئے حسن کا نیا پہلو  
 آیا۔ وہی رفتہ رفتہ قریب ہوتی ہوئی چونی اب ہوتے ہوتے دور اور اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم پھر ہٹی  
 وے پر آ گئے اور اگلی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ پہاڑ، سہرہ، پانی اور تہہ بہ تہہ ہوتی ہوئی دھلوانوں  
 پر نگور کے باغات، ہزار بادہ، ماخوردہ درگاہ تاک است

ایٹالس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک مقام پر "لی سن ٹائن" کا نشان ملا معلوم ہوا یہ مئی سی ریاست  
 یعنی پرنسی ویلیس ہے جیسی فرانس میں مائیکو ہے۔ اس کے دار الحکومت "واوڈ" میں پہنچے۔ ایک بس سٹاپ  
 پر رکت کر کچھ معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو ایک نوجوان ملا۔ سامنے بتایا کہ یہ پرنسیپلیٹی رقبہ کی نظر  
 سے کوئی زیادہ بڑی نہیں مگر امیر پرنسیپلیٹی ہے۔ دنیا کے لوگ اپنی دولت ہمارے پاس امانت رکھواتے ہیں  
 اور ہم امین لوگ ہیں۔ اس نوجوان نے ایک مبلغ کے جذبہ سے ہمیں اپنے وطن کے بارہ میں معلومات بہم  
 پہنچائیں۔ سکرٹریٹ۔ سٹ ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا جو ہمارے لاہور کی فری میسن ہل جتنی ہوگی۔ بنکوں  
 کی البتہ بھرا تھی۔ دادو پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑ بھی ایسا عمودی طور پر بلند ہوتا ہوا کہ چوٹی کو  
 دیکھنے کے لئے دستار تھا مٹا پڑے۔ عمودی پہاڑ کے اوپر ایک مخروم چوٹی پر حکمران جوڑے کا قلعہ ہے۔  
 میاں، بیوی، ہزار ہائی اس آدم خانی اور ان کی بیگم ہر ہائی نس ماری دنیا میں زیادہ مشہور و معروف تو نہیں لیکن





تھوڑی سی بڑھی۔ بہت شریف میاں بن گئے ہیں۔ مسکین صورت بن گئی ہیں اور سات گتے میں سات  
لوگوں سے زیادہ۔ یہاں یہ نفس سموت ہم پکڑ رہی ہے۔ لوگ تھوڑے ہیں مگر محسوس ہر مرد ہیں۔  
اور ایک چھوٹا سا شہ ہے مگر اس میں چار مختلف فرقوں کے گروے نظر آتے۔ انہیں درشتا واد  
لوگ کہتے ہیں۔ سارے قیام وادوں میں۔ یہ وہ کسی رہا مگر ہم یہاں کے اور بادشاہ و عدوت کے محل تک ضرور  
گئے۔ کوئی پہرہ وہ وہ بھی نہیں تھا۔ عام سا گھٹا تھا۔ مچھلے تھے مگر کھوس دان قد امت کے سوا اور کوئی  
چیز اس میں بہت وئی نہیں تھی۔ ساز و سامان بھی ایک عام متوسط خاندان کے سامان جیسا لگتا تھا۔ معاذ  
اللہ کہنے لگا ہم یہاں کیوں نہ آ گئے؟ خواہ مخواہ جرنی کے سمندر میں گم ہو گئے ہیں۔ یہاں ہم زکما اپنی  
نفرانیت تو قائم رہتی۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں۔۔۔ انہیں "ن سنن ماسن" کی یہ  
ریاست آسٹریا اور سویٹزر لینڈ میں گھری ہوئی ہے۔ معاذ اللہ کو اس بات پر حیرت ہوتی رہی کہ جنگ  
میں جرنی نے اس پر قبضہ کیوں نہ کر لیا؟ اور اخیال ہے اتنی مٹی کی ریاست کو ہڑپ کر جانے والوں  
نے اپنی جنگ جانا سونگا۔ اس ریاست کی ساری تمدنی رودادہی اور نیچہ کی رہائش پر ہے۔ مصنوعات کے  
نمونے دیکھے تو گایوں کے گلے میں باندھی جانے والی تھینوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آئی یا ایک دو بھل  
تھوڑی سیسٹوں کے بنے ہوئے بھلے، جو چرواہے اپنے جانوروں کو اٹھا کرنے کے لئے بھونکتے ہیں۔  
بداند خیر مل۔ سربراہ اب حد قہاروں، وادیوں اور یاؤں سے بھر پڑا ہے۔ سارا ملک ایک چراگاہ  
معلوم ہوتا ہے۔ سردیوں میں برف سے ڈھک جاتا ہے تو لوگ گناڑیوں کو چنے کے تیراجوں میں بند کر دیتے  
ہیں اور سلج (برف پر پھینپنے والے تختے) چڑھاتے ہیں۔ زندگی کا کاروبار چلتا رہتا ہے یہ لوگ اپنے آپ کو  
چھٹیاں گزرے کا ملک کہتے ہیں اور چچ کہتے ہیں۔

وہی پر ہم نے ہائی دے چھوڑ کر ماسٹر فک سے لی تاکہ شریا کے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سمندر نما سلوش سی نامی جھیل کے کنارے کنارے چلیں اور جرمنی کے بلیک فارسٹ کا چھ حصہ جس میں جھیل ٹی ٹی شامل ہے دیکھ سکیں۔ اس سفر میں فاصلہ کچھ بڑھ گیا مگر بلیک فارسٹ میں جھیل ٹی ٹی کے کنارے رکے تو یوں لگتا تھا جیسے غوہوں کے کسی ملک میں آ گئے ہیں۔ جھیل کے کنارے سناں شہر آباد ہے۔ دنیا بھر کے ٹورسٹوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سن ہے برسوں پہلے ہونوں کی بلیک ہو جاتی

تھے۔ امریکیہ تو تیار ہو چھٹ رہا ہو چکا تھا اس سے جانوں اور بھی خوب گون بن گئے۔ کچھ دیر اہل رے۔ رنگوں، رنگوں میں سیٹیں دشت کی وادیوں پر چلنے کے لئے، خستہ کپڑوں پر اوبستہ سورج کے احسب رنگوں میں بہتے بگڑتے دکھائی، رہے تھے اور نیچے جھیل کے گہرے پانی میں ان کا کس پنا چھا دیا تھا۔ کسی نے کیا خوبصورت بات کہہ رکھی ہے کہ نقاشِ فطرت سے بڑے رنگوں کا چادر اور کوئی نہیں۔

مم ٹی ٹی سے واپس چلے تو لمبے سفر کی تھکان اپنا تر دکھا شروع کر چکی تھی مگر اونچے سر بلک پہاڑوں کے درمیان بے حیثیت چوٹی جیسی سڑک رہتی جارہی تھی۔ ایسے سر بلک پہاڑوں کے درمیان بے حیثیت اور حقیر سڑک کا ایک نظارہ ہم نے ایک دور کے ریکیز کے سفر کے دوران دیکھا تھا۔ دونوں جانب پر ہیئت پہاڑ و درمیان میں گھری ہوئی حقیر سڑک جو پہاڑ کے اوپر سے بہتے گھٹس یہ و کسر دکھائی دیتی ہوگی۔ بیک فارمٹ میں بھی کچھ دور تک سڑک کا یہی عالم رہا پھر جیسے پہاڑوں کی میت نے رستہ چھوڑ دیا اور ہم واپس اس زمین پر دوڑنے لگے۔ بیک فارمٹ جرمنی کا قابل دید حصہ ہے جسے جرمنوں نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ اونچے پہاڑ سر بلک دیو پٹل درخت، جھیلیں اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ اور ہمیں کہیں پہاڑوں کے اندر سرنگوں میں اوڑتی ہوئی رہیں عجیب نگارہ ہے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کبھی صرف اس ملاقہ کی سیاحت کے لئے نہیں گئے۔

واپس گھر پہنچے تو تھک کر چوتھے۔ معاذ اللہ اگلے روز کسی اور جگہ سیر کا پروگرام بنارہا تھا۔ ہم نے کہا میاں توقف کرو۔ ایک دن آرام کریں گے پھر فرانس کا رخ کریں گے۔ فرانس میں بھی سڑ، سڑ، سڑ کا جہاں اس لوگوں نے یورپ کا نیا دار الحکومت بنا رکھا ہے۔ یورپ کی اسمبلی، یورپ کا سیکریٹریٹ وغیرہ۔ اگرچہ متحدہ یورپ کا نڈوں پر وجود میں آچکا ہے مگر بعض ممالک ابھی تک یورپ کی ایک کرنسی اور ایک حکومت میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنی، فرانس جو پاسپورٹ ہے اسے یورو چین پاسپورٹ کہتے ہیں۔ ہم یورپ میں کہیں بھی سفر کریں تو ایسے ہی ہے جیسے ہم اپنے ملک کے اندر سفر کر رہے ہیں مگر کرنسی مختلف ہے، کرنسی کی قدر بھی مختلف ہے۔ انگلستان بھی ابھی تک یورپ کی متحدہ کرنسی میں شامل نہیں۔ اسی طرح یورپ کے ایک ملک کا یورو چین ویزا سوڈن، برطانیہ جیسے ملکوں میں کارآمد نہیں۔ ان ملکوں کا متحدہ ویزا دیتا پڑتا ہے۔

یورپ کی کرنسی کے ہوتے تھے بڑے بڑے بینکاروں کی طرف سے کرنسی کی خرید و فروخت کے لئے ایک خاص ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ بینکاروں کی طرف سے کرنسی کی خرید و فروخت کے لئے ایک خاص ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ بینکاروں کی طرف سے کرنسی کی خرید و فروخت کے لئے ایک خاص ادارہ قائم کیا گیا تھا۔

ایک دن کا وقت اسے کرنسی کی طرف سے۔ یورو پرک تو مارے رستہ میں تھا۔ یہ کونسا معاملہ تھا؟ وہ نے ہائی اسکول کے بعد سے اس ملک سے سفر کرنا پسند کیا تھا۔ دریا۔ اس کی جو کئی مقام پر آسنی اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان سرحد بن جاتا ہے۔ اس مقام پر جرمنی اور فرانس کے درمیان سرحد کا کام لیتا ہے۔ اس نے آج مگر ہم رات سے اس پہلے کو طے کر گئے۔ پہلے فرانس شروع ہو گیا۔ وہی علاقہ جہاں سے جرمنی نے فرانس پر قبضہ کرنے کی طرف ڈلی تھی۔ تحریک نعت میں ایک جگہ جو ہمدی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ جنگ کے بعد میدان جنگ دیکھنے گئے مگر میدان جنگ زیر کاشت تھا۔ ہم نے بھی وہی عالم دیکھا۔ ہر طرف کئی کئی فصل کھڑی تھی۔ لمبیدار علاقہ ہے۔ حد کاؤ تک کھیت نہ آئے اور ان کھیتوں میں اکا اکا چھوٹی چھوٹی آبادیاں۔ ایک گاؤں میں بھی جھانکا۔ جنگ کے زمانہ کی ایک تہ شدہ حالت کو گاؤں والوں نے محفوظ کر رکھا ہے۔ چائیک میں خیال آیا کہ ابھی بچھے دنوں ہم نے ایک برطانوی جرنیل جنرل سرجن ہیٹ کی ایک کتاب پڑھی ہے "میں جینی تھا"۔ یہ صاحب برٹش جیٹروپ ریٹھ کے ریٹھ تھے اور جنگ کے آخری زمانہ میں دشمن کی صفوں کے پیچھے پہنچے چھاتہ بردار اتارتے ہوئے طیارہ کے رخی سو جانے کے بعد خود بھی زخمی ہو گئے تھے اور اسی علاقہ میں کود گئے تھے۔ یہاں کے۔ یہ کراس ہسپتال میں ان کی دیکھ بھال ہوتی رہی تا آنکہ ان کے فوجیوں کی خفیہ سروس نے انہیں ہسپتال سے بچنے "انوا" کر لیا اور دریائے رائن کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ڈیجیٹل جرنیل کے پاس چھپا دیا اور پھر مناسبت انتظامات کرنے کے بعد انہیں دشمن ملک سے نکال لیا۔ وہ صاحب بعد میں حزن منائے گئے اور نیٹو کی برٹش فوجوں کی کن کرتے رہے۔ اس گاؤں کے ہر مکان پر ہمیں بھی شبہ ہوتا رہا کہ یہی وہ مکان نہ ہو۔ و  
اللہ اعلم۔ مطالعہ میں آنے والی اجنبی کی اجنبی کتاب نے ہماری سیر کو ایک معنویت دے دی۔

چھوٹے چھوٹے کئی گاؤں دیکھنے کے بعد ہم نے سٹراسبرگ کی راہ لی۔ ہائی وے اختیار کرنے کی وجہ سے

یہ سائنس دانوں نے طے کیا کہ فوٹو سولر ٹیبلٹس - جن کی باتیں عواموں پر بدستور ہو رہی ہیں - کے استعمال سے  
 زمین پر ملنے والی انرجی کو استعمال کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ سائنس دانوں نے بتایا کہ یہ سائنس دانوں نے  
 میں فروغ دے گا۔ پورے دنیا کی بڑی طاقتوں نے ایک ایسے رپورٹ میں مشترکہ اعلان کیا ہے کہ ان کے  
 پورے زمین پر لگائی گئی ہیں۔ ایک جہد ایک دو گنا کی رفتار سے آگے بڑھے گا۔ ان کے  
 کر کے کھانے پینے کے لیے ایک ایسا ایسا کہ ہم نے کھانے پینے کے لیے ایک ایسا ایسا کہ ہم نے  
 میں اس پر عمل درآمد کریں گے۔ ان کے ذریعہ کھانے پینے کے لیے ایک ایسا ایسا کہ ہم نے  
 اس کو بہتر سمجھا جائے گا۔ ان کے ذریعہ کھانے پینے کے لیے ایک ایسا ایسا کہ ہم نے  
 ہے۔ (یہ تقریر پاکستان پارلیمنٹ میں کی گئی)

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ معاذ اللہ گاڑی کو تیس مناسبت جگہ لے جا کر پارک کر دے اور محمد امین بیٹو کو کھانے کے آنے کا انتظار کریں۔ معاذ اللہ کیا تو ایسا لگے کہ ایک گھنٹہ تک وہ بس یہ نہ آیا ہم اپنی جگہ بہت پریشان کہ خدا معلوم کیا ہوا وہ جوان کدھر گیا؟ خدا خدا کر کے آیا تو اس وقت تک کھانا ختم ہو چکا تھا مگر اس بہت سے اطمینان ہوا کہ اسے کوئی ایک گلو میٹر دور پارکنگ مل گئی ہے۔ اور اب گاڑی کے کریں سے اٹھائے جاے گا کوئی اندیشہ نہیں۔ بہت تو بچے حصے کا کھانا کھا چکے تھے معاذ اللہ کھانا زہر دار کرنا پڑا۔ اس کے بعد یورپین پارلیمنٹ کی نئی بڈنگ کی تلاش میں نکلے۔ جس سے راستہ پوچھیں وہ کہیں نہیں نکلا۔ اسے نہ برمن آتی ہے نہ انگریزی۔ فرہنسیسی ہمیں نہیں آتی تھی۔ کس سے پوچھیں کیسے پوچھیں؟ بدلتا خوش قسمت کی تو ہر پھر کر ایک سی چوک میں پہنچ جاتے رہے۔ آخر حجب آ کر فرماں برک کی رو پڑی۔ تھق ایسے ہو کہ یک موز مزے تو سامنے یورپین پارلیمنٹ کی شیشے کی بنی ہوئی عمارت آ گئی رشید قیصر نے یاد آگیا۔ ایک عمر جستجو میں گذاری تو یہ کھل۔ وہ میرے پاس تھا میں جسے دعوئہ تارہا۔

بس ایک موڑ کا فیصلہ تھا۔ اترے۔ سکرینزٹ کی عمارت کے اندر جا چاہا تو معصوم ہوا کہ پہلے سے وقت  
 بیٹا رہتا ہے۔ سامنے سارے مکوں کے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف دریا کا کنارہ ہے دوسری  
 جانب سبز درجہ۔ خوب صورت جگہ ان لوگوں نے چن رکھی ہے۔ پاریمینٹ کی نئی عمارت بین رقی سے  
 اور تقریباً مکمل ہے۔ یہ عمارت شیشہ کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ یعنی اس میں باہر کا سارا حصہ شیشے کا ہے شیشہ کیا

و سرکار۔ جسکی دکان میں وہ رہتا ہے۔ قریب ہتے سونے دروازے پانی میں اس کا کھس براہم  
معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی حالت سننے کے لیے وہ اپنے کونے میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ  
میں بیٹھ کر اس کو یہ پتہ نہیں چھپنے جاتے تھے اس کے لیے کہ کوئی اس کی بات نہیں کریں گے اس سے  
سبک دینے کی تلقین کریں۔ پچھلے دنوں یورپی یونین کا جو وفد چین کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لیے اس میں  
اس کا جو حشر ہوا اس کے سامنے ہے اس پر ریمٹ میں اس کی قانون سازیاں ہوں گی جو کسی کی صیغ  
نارک پڑیں نہ گذریں۔ یہ عمارت دیکھنے کے بعد سٹراہم برگ میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اس سے، میں  
ہائی وے پر آئے اور انی سمت میں ہائی وے پر چڑھ گئے۔ جب انی پچیس میں کلو میٹر سفر کر چکے تو نشان  
رو نظر آیا۔ لکھا تھا پیرس چھ سو کلو میٹر اب کیا ہو؟ مزید اس بارہ کلو میٹر جا پڑا تب ہم انکھنی کی پھیل سوئی۔  
دوسری جانب سے کسی ہائی وے پر دوبارہ روانہ ہوئے اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد اپنی صحیح منزل  
کی جانب گامزن ہوئے۔ رستہ میں رکے۔ کافی دیر روٹی دروازہ پر گرجی کی سرحد میں داخل ہوئے  
فرانز برگ تک پہنچے تھکاوٹ بہت ہوئی تھی معاذ اللہ کا حیاں تھا ہمیں مزید ایک دو قبل دید مقدمات کا سفر  
کرنا چاہیے جن کی تین سو وقت کے بعد سے موجود تھی مگر ہم نے ہتھیار ڈال دئے کہ ہماری توانائی میں  
مکملش نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر نے بڑی اچھی ہدایت کر رکھی ہے کہ "کسی صورت میں بدن کی سوار کو نظر انداز  
نہ کرو" یعنی جسم سے کھٹک گیا ہوں تو اس کو مزید مت آزماؤ۔ گھر واپس آئے۔ نکلے روز گاؤں کے میئر  
صاحب نے رورہ بند پروری ہمیں ملاقات کے لئے وقت دیا۔ ان سے ملے، بچھے آدی تھے۔ گریزی  
کا ایک حرف نہیں جانتے تھے۔ نہیں یہ بات ہم نے غلط کی۔ انہوں نے دو غلط گریز کے بھی بولے تھے  
۔ بدام میں ویکٹر ہاتھ در رخصت ہوتے ہوئے تھینک ج۔ ان سے ملے۔ تصویر کھینچوائی کہ یادگار رہے  
دراپنی دانست میں اس گاؤں سے رخصت ہونے کے انتظامات مکمل کر لئے۔ گلے دور ہمیں فریٹنگرفٹ  
واپس جانا تھا۔ معاذ اللہ تو ہمیں وہیں "گھر" تک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہم نے کہا نہیں بس بہت  
سوچنگی اب یہاں سے انٹرنیٹ کی سپر سس میں بٹھاؤ۔ فریٹنگرفٹ تک تین گھنٹے جانے کی اور تین گھنٹے واپس  
آننے کی ڈراپ کو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اصرار پر وہ مان گیا۔ چنانچہ ہم نے اس کے ساتھ قریب  
کے ریوے اسٹیشن پر جا کر ریزرویشن کروائی اور اسٹیشن سے سی گریزی عمران احمد خاں کو اپنی آمد کے وقت

مطلع یا تاکہ دوشنبہ سے بیس راتوں کے، پس ٹکلیل کے چر پہچانے جہاں ہم نے چھوٹی چھوٹی  
 کی تھی جی۔ یہ سب یہ ذرا ہر غصہ کے تھے۔ ہمارے ہمیں بھی اس طرح میں غصہ ہے، مثلاً کی مس  
 نوار کی سے متعلق ہوتے تھے۔

گاری کا وقت ہوا تو دیکھا کہ معاذ اللہ اپنی رسیداروں والی ڈانگری پہنے ہزارے در سجدہ بنی اور یور  
 نی ہڑی میں۔ معلوم ہو کہ ہم سے درمیان میں مینڈی جتنی کی تھی تو اس دور میں انہوں نے بیوی اپنے  
 بھتیجیوں کی جانب نکل گئے تھے اور اب سجدہ ڈانگریوں کی تاکہ دایں آکر میں صا حسب اپنے کام  
 میں جت چا میں۔ سجدہ نے ہمیں فرار کی بڑ شہین تک پہنچایا۔ معاذ اللہ اسی لباس میں ہمارے ساتھ تھا  
 ۔ جب تک گاڑی میں ہمیں سو رہا کہ دایا ساتھ کھڑا رہا اور سجدہ بیوی باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کرتی  
 رہیں کیونکہ پارکنگ کا مسئلہ یہاں بھی بدستور تھا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ میں بیوی اور ان کے بچوں  
 نے ہماری خاطر داری میں کوئی دقیقہ فرو گزشت نہیں کیا۔ فجر اہم اللہ حسن الجزاء۔

فرشتی، یکسپر میں نے اٹھنے اور کھنٹ میں ہمیں فریکسٹ لانا۔ ہمیں یورپ کے ریلوے شیشوں  
 پر اس بات پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ سامان اٹھانے والی ٹریلوں کو حاصل کرنے کے لئے سکے ڈالنے  
 پڑتے ہیں۔ اب مسافر کے پاس سکے نہ ہوں تو کیا کرے؟ اگر چوڑوں والے اتنے مہربان ہیں کہ وہاں  
 فراریں صا اور مفت دستیاب ہوتی ہیں۔ (بات پرانی ہوئی اب ایرپورٹ والے بھی ریلوے والوں کی  
 طرح چا۔ ک ہو گئے ہیں) ریلوے والوں میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہے یا ضرورت سے زیادہ بکھدار ہیں  
 کہ ہر مسافر کو ہمارے ملک کے سکے ضرور جیب میں رکھنے چاہئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزیدی عرفان احمد  
 صا کو ہمارا سامان بڑی دور تک اٹھ کر لےنا پڑا مگر آفرین ہے کہ ماتھے پر شکر نہیں پڑی ورنہ تا تو چھوٹا  
 سکاتھا کہ اتنے سامان کے ساتھ سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر اسے اندر دیکھا کہ ہمارے سامان میں  
 سامان کم درتہ میں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ اس لئے ہم جہاں جائیں تہیوں کی دکانیں جھانکتے پھرتے ہیں  
 فریکسٹ پہنچے تو اپنے پوتے سے رابطہ ہو گیا۔ شام کو وہ اپنی دلہن کو لے کر آ گیا۔ ہم نے دس برس

کے بعد اسے دیکھا تھا۔ ماشاء اللہ شاعرانہ جوان نکلا ہے۔ اس کی دلہن طہرہ بھی ماشاء اللہ دسویں انگلیاں  
 دسویں چراغ اللہ نہیں زندگی دے۔ اگلے روز ہم اس کے ہاں گئے۔ ایک وقت کا کھانا کھا یا اور دعا میں

ایک دن کہ اندھ گھبراہٹ کے درختوں سے گھبراہٹ کے شور و غوغا میں جھٹکا رہا، اسی وقت اسی دن  
 نے بارہا کھڑا ہوا تھا۔ حضرت نے فرمایا: "اب میں خود آئے گا۔" یہ کہ وہ کی حالت سے اہمیت  
 قیوں پر چکا ہے اس لئے جو چاہیے۔ چنانچہ گئے۔ پانسی تو نیکل خانہ و اس نے نہیں پناہ مراد جس  
 کے سے رہا تھا۔ گئے چنے چند اہل ذوق تھے۔ کاروائی تم باتیں کیا دیکھیں۔ سہ ماہی اہل ذوق  
 سے مل کر خوشی مائی۔ اجلاس کے بعد صوفی مسعود احمد خاں دہلوی کے پاس حاضری دی وہاں کی قعدہ بھی  
 کی زبان کے مزے تھے۔ میاں عبدالحق صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی کا وہ ہے۔ صرف نوں پر  
 سے "لو" "ہا" "کوئی" بہر حال چودہ روز کے اس سفر کے بعد اگلی صبح فریڈرٹ سے لندن اور لندن سے  
 شک ہر پہنچ گئے۔ صاحب نے کہا تھا۔ "ورق تم سوا درمدن باقی ہے"۔ ہم اس میں تحریف کے  
 مرتعب ہو رہے ہیں سفر تم ہو پر تھکان باقی ہے

-----



## ذرا اوسلو تک

میں نے یہاں تک کہ ایک ہی صبح صبح میں گھر آیا۔ اپنے پہاڑوں، سمندروں، فوراؤں، برافروں اور آگے رت کے سورج کی اجڑے دیں میں مغرور ہے۔ نارتھ چوں کا وہ حصہ جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا مارا دے ہی میں ہے۔ اگرچہ سوئڈن کو بھی حصہ رسدنی خورشید نصف شب میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ہے مگر "نورویک" کا وہ مخصوص علاقہ نہرے کی تخصیص ہے جس سے مارے سیکند میوہ کے دیگر ملک سے "مزید" خوب صورت ہے۔ اس تخصیص میں ایک اور اضافہ ہونے والا ہے یعنی دنیا کے شان ترین علاقہ میں خدا کا جو گھر تعمیر ہوگا وہیں نورویک میں ہوگا اور اس کی تعمیر کا سر اجیت احمدیہ کے سر بندھے گا۔ یہاں میں مسجد تعمیر ہوئی تو اس بات کا بہت چچ کیا کیا کہ یہ مسجد نارتھ پول کے قریب ترین علاقہ کی مسجد ہے مگر نورویک میں جو اللہ کا گھر بنے گا وہی الحقیقت نارتھ پول کے مین وسط میں بنے گا۔ زمین خریدی جائیگی بے تشہ بن رہا ہے کوئی دن کی بات ہے کہ اس علاقہ میں اللہ کا م پانچ وقت بند ہو کرے گا۔ نارتھ پول پر پہلی ذرا بھی جماعت احمدیہ نے دی تھی جب چند برس قبل حضرت امام جماعت احمدیہ نورویک تشریف لے گئے تھے اور وہاں جمعہ پڑھا تھا۔

"فوراؤ" اصطلاح میں اس منظر کو کہتے ہیں جہاں سمندر دور تک پہاڑوں کے اندر تک گھٹ چلا گیا ہو اور یوں محسوس ہو جیسے سمندر پہاڑوں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے مقامات پر سمندر کا پانی بھی بہت پرسکون ہو جاتا ہے کیونکہ باہر کے کھلے سمندر کا جو رہی ٹا یہاں تک نہیں پہنچتا۔ یہ فوراؤ بہت صحت، فراقت سمجھے جاتے ہیں جن پر پہاڑوں اور سمندروں کا موسم یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ بھلے زمانوں میں جرمنی کے قیصر ولیم مارے کے فوراؤ ذرا ہی میں آکر پناش ہی یاچ Yacht یعنی جہاز نگر انداز رتے اور سیرتے حلف انداز ہوتے تھے۔ قبلہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں صاحب نے تحفہ بیعت میں قیصر ولیم ثانی کے یاچ کے "سوگن فوراؤ" میں نگر انداز ہونے اور قیصر ولیم سے آمنا سامنا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ سوئڈن سے جاتے ہوئے ہم ایک ایسے ہی فوراؤ سے گزرے وہاں سمندر دو پہاڑوں کے اندر اتنا محصور ہے کہ

چھاننا۔ یہ سب سے پہلے تھا۔ اس وقت اس نے اس سے جڑی کے خلیے میں بیٹھ کر دیکھا۔  
تھا۔ اس نے اس سے اس کے خلیے میں بیٹھ کر دیکھا۔ اس نے اس سے اس کے خلیے میں  
قویوں کے آگے آگے بیٹھ کر دیکھا۔ اس نے اس سے اس کے خلیے میں

دہر کے بادشاہ قویوں کے خلیوں میں یہ وقت تک کے تھے۔ خلیوں کے بادشاہ کے ہر وہ  
مشہور ہے کہ بہت مہارت تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ اس میں جانتے تھے۔ ایک بار دہر کے  
سفیر کا کوئی بڑا آدمی اس کی سر پر مارا۔ وہ آیا تو یہ لوگ اسے اس کی سر پر مار کے گئے۔  
وہ بہت تھکا ہوا اور اپنے کانٹے کی خاص جگہ کی سر پر مارا۔ بادشاہ دہر کے خلیوں میں۔  
آخر ہم بھی وہ تھیں تاریخی محلات اور باغوں کی سر پر مارا۔ میں انوں نے کہا کہ اسے تو ہنسی پیش  
کر دیوہ دیکھیں۔ اس نے ایک بڑھا بیٹھا ہے۔ کہنے لگے ہاں بیٹھا ہے اس نے تو میں کہہ رہا ہوں اس نے  
کہ چوہا جس فقیر نہیں جاتا۔ بادشاہ جاتا ہے۔ میرا ہاں نے کہا یہ جو بڑھا آپ کے سامنے بیٹھ کر بیٹھ  
ہے یہ اتفاق سے ہمارا بادشاہ ہے۔ وہ صاحب اپنا سامنے لے کر رہ گئے۔ یہاں یہاں میں بھی ہم نے  
ایک روز دیکھا کہ پرانے قلعہ کے سامنے ایک کے کنارے ایک جوتاں لے رہا ہے۔ وہ بڑے جوش  
خروش سے ہاتھ بڑھاتے ان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ معلوم ہوا اس کا سونے کے بادشاہ سلامت  
درمک چاہل قدمی فرما رہے ہیں۔ خلیوں کے قلعہ میں تو نظر نہیں آئے۔ حالانکہ اسی ماہ  
زندگی کی وجہ سے سونے والے پرائیم وزیر اعظم قتل کر دیئے تھے۔ وہ پائے سوشل ڈیموکریٹ دہر  
اعظم تھے اور عام عوام میں بہت مقبول تھے۔ ایک روز سنیما سے رات کو فلم دیکھ کر نکلے۔ وہ بیوی کا ہاتھ پلا کر  
بیل ہی اپنے گھر کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ بڑی سڑک پر پہنچے تو قاتل نے انہیں گولی کا نشانہ بنادیا  
سج تک ان کے قتل کا معاملہ نہیں ہوا۔ ہم فوراً اس کے ذکر سے چلے تو ہمیں کے نہیں نکل گئے ہاں  
موز کرو پک اپنے مضمون کی طرف آ رہے ہیں۔

ہم دس سال سے سینڈینیا میں بیٹھے ہیں مگر اس لوگ صرف دو بار گئے ہیں۔ دونوں بار اپنے شاعر اور فی  
کئی کانٹے دندوئے سعید انجمن کی دعوت پر۔ ایک بار اس کی زندگی میں دوسری بار اس کے مرنے پر۔  
یہ زندگی کا کاروبار ہے۔ پہلی بار واپس آ کر جی چاہا کہ اس لوگ کا سفر نامہ لکھیں مگر پتہ ہی نہ ہو کہ وہاں

ہا میں کہ مطلق نہ ہو۔ وقت ندرت یا تو صحت سے یہی فیصلہ کیا کہ مٹنے کے بعد۔ جنگ و سہد نہ ہو سکتا ہے۔  
اس نے کہا کہ۔ اس کے بعد باوجود اس کے دوستوں کے اس کو تھکا دیا۔ وہ سب سے پہلے اس کی مدد کی اور اس کے  
حالات میں آئیں۔ وہ جاہل نہ ہو، جس سے باہر کو بہن سبک میں رہی۔ وہ مگر اس کی تدفین کے لئے  
تو ہمیں جاہل تھا۔ گئے مٹھیس میں خاک جگر دوست آئے۔ ہر فن زندگی جگر کی محبت کا صلہ دینے  
لئے۔

یہی بارادلو گئے تو یک مشعر کی دعوت پر گئے مگر سعید انجم کے ہاں قیام کیا کہ اصل مقصد اس سے  
مدد تھا سعید جدید افسانہ نگاروں میں منفرد تھا علامتی افسانہ میں تو اس نے یہ کام حاصل کیا کہ اس کا  
افسانہ "نیک ندوں کا زیور" اور "کا بہترین علامتی افسانہ شمار کیا جاتا ہے۔ ہم سائیں سچ کے ساتھ اس کی  
فیملی کے ساتھ گئے تھے فیملی کا قیام کہیں اور تھا سعید کے ہاں ہم تھے اور سائیں سچ کے کچھ وقت اب کی  
باتوں میں ندرت کہیں۔ اگلے روز مشاعرہ پڑھا تو اجنبیوں کی طرح بڑھا کیونکہ یہاں ہمیں پہچاننے سے  
انکار کی تھی۔ بہت خور مسعود ورمھا۔ الحق قاسمی بہت حیران ہونے کے ہم کیلئے نیویا میں رہتے ہیں اور اسلو  
و سائیں نہیں جانتے پہچانتے۔ اگرچہ عطاء الحق قاسمی ناروے میں پاکستان کے سفیر بن کر آ گئے تو انہیں  
بھی ہمیں پہچاننے میں وقت ہونے لگی۔ اب کے برس برٹن میں ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے خوب  
پہچانا۔ ہم نے کہا دونوں کی بہتری اسی میں ہے جان پہچان تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو جانے پہچانے ہوں  
پنے شعروں کی وجہ سے یا اپنی پلی آر کی وجہ سے۔ ہم دونوں باتوں سے محروم و نا بلد ہیں۔ اب سعید کی  
وفات پر جانا تو سب لوگوں نے پہچان لیا بلکہ تنظیمیں متاعرو نے چار سال پہلے نہ پہچاننے پر معذرت  
بھی کی کہ افسوس ہے کہ ہم آپ کی قدر افزائی نہ کر سکے۔ ہم نے کہا بہت شکریہ کہ چار سال بعد آپ نے  
پہچان لیا نہ پہچانتے تو ہم آپ کا کیا بگاڑ لیتے؟ فرق صرف یہ تھا کہ اس موقع پر ہم ان کے مہمان نہیں تھے  
فہیم شاہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں ہم سے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ؟ جی یہ لفظ ہم نے  
یونہی استعمال نہیں کیا۔ مغرب میں جو لوگ مشعرے پڑھنے آتے ہیں یا بلاتے جاتے ہیں بس اوقات وہ  
تنظیمیں کے لئے بلائے بے درماں بن جاتے ہیں۔ دو تین برس پہلے لندن میں تو باقاعدہ ایسا حادثہ ہوا  
کہ اردو کے دو بڑے شعرا کو تنظیمیں نے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور ایک مہینہ وقت تک ان کے ہوٹل کا سارا

خرچ بھی ہوئیں دلوں کو اور کر دیں۔ شعرا کو اس کا مقررہ معاوضہ بھی ادا کر دیں۔ اب شعرا پنچ ستاروں والے دلوں میں قیام فرماتے تھے اور ہر دوسرے شخص کی حکومت قبول کر کے مشاعرے پڑھتے دعوئیں ادا کرتے اور معاوضے وصول فرماتے پھر رہے تھے۔ جب معاوضے سے زائد قیام کے بعد دلوں سے جانے لگے تو دلوں نے ان کو یہ طلب کیا تو شعرا ہکا بکا ان کا منہ دیکھنے لگے۔ منتظمین سے رابطہ کیا یہ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے قبل تاریخ تک کر یہ اور معاوضہ ادا کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس وقت کے بعد آپ ضرور نا چاہیں تو اپنے خرچ پر ٹھہر سکتے ہیں۔ ہذا ہم تو سب دوش ہو چکے ہیں۔ شعرا نے کہ پاکستان کے ہاتھ نہ دے اور مشہور شاعر شہر ہوتے ہیں بہت داؤد کیا کہ ہمیں تو اتنا معاوضہ بھی نہیں ملتا جتنا آریہ آپ لوگ ملے گا۔ رہے ہیں۔ وہ تو خدا بھلا کر سب پاکستان کے ہائی کمشنر کا کہہ دے آئے اور شعرا کا بل سفارت خانے کے ہنگامی فنڈ سے ادا کر کے ان بزرگوں کی جان چھڑائی۔ اخباروں میں اس بات پر بڑا فضیحت ہوا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اب شعرا کو لوگ بلانے سے باہر کرنے لگے۔ ان باتوں سے ہم نے خوب عبرت پزیر رکھی ہے۔ مشاعروں میں تو مارے باندھے جانا پڑتا ہے کیونکہ گندم اگر ہم نہ رسد بھی قیمت است۔ لوگوں کو بڑے شاعر نہیں ملتے تو ہم جیسے بھی پس پڑنا کر کے ہیں مگر اس کے علاوہ ہمارے شاعروں کا اپنا ذوق ہے جو ہمیں دور دراز کے علاقوں تک جاتے اور جی کڑا کر کے ہمارا "کلام جاغت نظام" سنتے بھی ہیں۔ اسی لئے ہم باہر کے حصوں میں جانے سے گریز کرتے ہیں۔ دعوئیں تو بہت آتی ہیں مگر ہم پیشہ ور شاعروں کی طرح ہر مشاعرے میں کوئی نہیں پڑتے سال میں ایک دو مشاعرے پڑھ لیں تو ہماری حرص پوری ہو جاتی ہے کہ یہی رفتار ہماری شاعری کی ہے۔ دو یا حد تین غزلیں سال نہ۔

پہلی بار اوسو گئے تو سعید نے اپنی بساط کے مطابق ہمیں خوب خوب سیر کروائی اوسلو ایسا شہر ہے جو پہاڑوں پر اور وادیوں میں آباد ہے اونچ نیچ اور اتار چڑھاؤ یہاں بہت ہے۔ ہم نے دوسرے دن ہی اعلان کر دیا کہ بس بھر پائے ہم ایسے شہر میں نہیں رہ سکتے جہاں آدمی پیادہ یا چل ہی نہ سکے۔ چار گزر میں بھی سیدھی اور ہموار نہیں۔ ہم ہیں کہ چھل قدمی کے بغیر ہمارا گنڈا نہیں۔ نہ چلیں تو محاورہ کے مطابق بھی وردیے بھی ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ذیابیطس کے اور دل کے مارے ہوئے ہیں دونوں بیماریوں کا بہترین پرہیز اور ساج پیدل چلنے میں مضر ہے اس لئے پیدل چلتے ہیں اور اپنا دل میں بھی انتھار حسین کی

زبان میں پایا، لکھتے کرتے پھرتے ہیں۔ چھت دنوں ہمارے سویش دوست شاعر اس بیسٹر میں  
 چھتے ہیں۔ میں اب اس ایک مسموں پیوہ جس کا عنوان تھا "سایہ پستہ شرمی" کے ساتھ  
 "میں یقین ہے کہ اگر آپ کے کسی رہنے والے نے ہمارے مرنے یا جینے پر کوئی مضمون لکھا تو اس کا  
 عنوان ہوگا "پایہ دہ چنے والا پروفیسر"۔ میں اس سمجھنے کہ دوسو ہمارے مزاج کا شہر نہیں ہے۔

سب کی بار جانے سے پہلے ہم نے سید نعیم شاہ سے ہر دیا کہ ہم اس کے ہاں ٹھہریں گے کیونکہ عید کے ماں  
 تو ٹھہرنے کا موقع نہیں۔ تعزیت کے سنے آنے والوں کا ہجوم ہوگا اور ہمارے اعصاب ہجوم کا زیادہ  
 دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی آخری رسالت میں شرکت کریں گے مرقم کی جگہ رکھیں گے  
 جہاں برآرام میسر ہو۔ رشید اس کا بھائی ہمارا دوست ہے۔ نعیم برادر خورد ہمارا شاگرد ہے مگر ہمارا اندازہ  
 تھا کہ وہ دنوں تعزیت کرنے والوں کے ساتھ اور تجویز و تنقید کے انتظامات میں مصروف ہوں گے انہیں  
 تکلیف دینا مناسب نہیں۔ ہم ڈک کار کے ذریعہ کوئی چھ گھنٹے کا سفر کر کے گئے تھے تعزیت کے فرض سے  
 اور ہوئے سعید کی بیوی طلعت سے تعزیت کی بیچوں یا سر اور حنا کو پیار کیا۔ اچھے میں ہمارے طے شدہ  
 پر اگر اس کے مطابق نعیم ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ اگلے روز اس کی تدفین میں شریک ہوئے اور یوں اس  
 منفرد صاحب اسلوب افسانہ نگار کو مٹی میں دفن کر آئے۔ خوفناک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے۔

نعیم شاہ نے، شاء اللہ داڑھی ترک اور تہ چھوڑ رکھی ہے۔ "فارغ لبالب" بھی حد سے سوا ہے مگر الحمد للہ کہ  
 طبیعت میں مزاج اور براداری بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح کالج کے اور ہمارے پڑوس کے زمانہ  
 میں تھی۔ بیوی اس کی ہمارے قادیان کی ہوئی ہے۔ اس کے اب اب بھی وہاں درویش ہیں۔ یہ بوئی کالافہ  
 ہم نے اس لئے استعمال کیا کہ نعیم کے والد قبہ سید عبد اللہ شاہ صاحب کلر سید کے رہنے والے تھے ہمارا  
 "بائی وطن بھی پوٹھوہار ہے اس نے قبلہ محترمہ صاحب جہاں ملتے جب ملتے ہی فرماتے تھے کہ تر  
 ہمارے "وطن دی بوئی ہو" اس نے ہمیں یہ دے ہو۔ روئی ہمارے "وطن دی بوئی" ہے اس نے  
 ہمیں در بھی چھی لگی۔ اس نے خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اللہ اسے جز دے۔

موقع سیر کا تھا نہ مشاعروں کا مگر دونوں کی دعوتیں پے پے آنے لگیں۔ ہم نے مشاعروں سے تو سختی سے  
 انکار کر دیا مگر سیر کی دعوت کو رد نہ کیا صرف اتنی شرط لگائی کہ جو بھی سیر کے لئے اوسلو سے باہر لے کر گئے وہ

پست اسٹیشن لے کر چلے گئے وہاں بھی رہا وہی ایک بیٹی۔ یہی حال ان میں اپنے ساتھ لڑکیاں لے کر آتی تھیں۔  
 حالت سے ادھر ہوئی ہے اس سے بیبیوں پر تو ہم عزیمت کر چکے تھے مگر درویش میں آکر اس نے سہمہ  
 جانا نہیں چھوڑا وہاں پہنچے تو نمیدانے کچل بات ہی یہ کہی کہ میں اس انتظار میں تھی کہ آپ میرے ہاں  
 قریمت کے لئے کب آئیں گے؟ اگر آپ میرے ہاں آئے بغیر چلے جاتے تو مجھے بہت دکھ ہوتا۔ ہم  
 نے اس سے کہا بیٹی ہم یورپ میں آ تو گئے ہیں مگر بھی اتنے یورپین نہیں ہوئے کہ اپنے کچل کے سب  
 قریمت بھول جائیں۔ اس بچی کے میاں فوزی صاحب سے ہمارا تعارف زندہ مگر بیٹی تو پنی ہی تھی اس کے  
 ہاں کیسے نہ جاتے؟ ہاں درمن جانے سے پہلے فوزی صاحب کی قبر پر دو تھ کے لئے حاضری دے کر گئے  
 تھے۔ نیلہ رفیق ہمارے بزرگ ڈاکٹر بشیر احمد صاحب ایم سی کی بیٹی ہے۔ ایم سی سے یاد آیا کہ ایک بار  
 ایک سینٹر فوجی فرسٹ ریفرمڈ تشریف لائے ہوئے تھے۔ گول بازار سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ  
 ایک کلینک پر کپٹن ڈاکٹر بشیر احمد ایم سی کھڑا ہے۔ رکت گئے کہنے لگے یہ کون ڈاکٹر ہیں؟ مجھے ان سے  
 ملاؤ۔ نذر گئے تو ڈاکٹر صاحب کو انہوں نے باقاعدہ مٹری و لاسیوٹ کیا حالانکہ خود حاضری سروس  
 بریگیڈ کرتے۔ کہنے لگے تمہیں معلوم ہے یہ ایم سی کیا ہوتا ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ مٹری کر اس کا  
 مخفف ہے اور بہادر کی کا تمغہ ہے۔ صرف اس شخص کو مگر یہ دیتے تھے جس نے جان جو کھوں میں ڈال  
 کر کوئی نمایاں کام کیا ہو۔ لازم تو سمجھے ہوئے تھے کہ یہ کوئی ڈاکٹر ہی نہ ہوگا اب معلوم ہوا کہ ہمارے  
 ڈاکٹر صاحب تو باقاعدہ تمغہ یافتہ ڈاکٹر ہیں۔ توجہ دینی کہ دریں گردوارے باشد۔ ڈاکٹر صاحب پہلے  
 قادیان میں درویشوں کی خدمت کرتے رہے پھر راجہ میں اہالیان راجہ کی خدمت کرتے کرتے وہیں  
 بیوی نہ خاک ہوئے۔

درمن اوسو کے نواح کا شہر ہے کوئی پچاس ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ سعید کے ساتھ ہم درامن کی مشہور  
 زمانہ SPIRAL یعنی پہاڑ کے اندر ہی ہوئی وہ سرنگ جو اندر ہی اندر مل کھاتی پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچتی  
 ہے دیکھ چکے تھے۔ جس طرح گھبرائی درخت پر چڑھتے تو سیدھی نہیں چڑھتی۔ درخت کے گرد اگر چتر لگا کر  
 اوپر چڑھتی ہے درامن دالوں نے یہ جدت روادار کھی ہے کہ بجائے باہر سڑک تعمیر کرنے کے پہاڑ کے اندر  
 مل کھاتی سرنگ تعمیر کر رکھی ہے ہم اس سرنگ کو ایک بار دیکھ چکے تھے اس لئے ہم نے قدم آگے بڑھا دیا۔

حرم صاحب ہور رہا تھا بھی تھے ارکار چلانے والے بھی۔ فیہر اور میں محسوس اور تشریف تھے ہم نے سارا صاحب کو بھی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ جہاں جاتے ہیں۔

اور میں سے آگے بڑھے اور طویل و مدید جھیل کے روبرو اراکب پھر کات کر کے مقدم پر آئے جہاں پہاڑ کی چوٹی سے دگ پیراشوٹ چمپ کرتے ہیں۔ سردیوں میں یہی پہاڑ کی اوٹوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور وہ پہاڑ کی چوٹی سے کسی رستے کرتے جھیل کی ترائی تک اترتے اور زندگی کا طوفان نکالتے ہیں۔ چنے سے پہلے روٹی نے آؤں والے پر ٹھے بنا کر ساتھ کر کے تھے کہ جہاں بھوک لگے ان سے دور ہاتھ کر ہیں چنانچہ جھیل کے خوب صورت کونے پر پہاڑ کے مین دامن میں پانی کے کنارے بیٹھ کر کافی دور پر ٹھوں سے خطا اٹھایا۔ بھوک چمکی ہوئی تھی سامنے جھیل میں راج انسانوں کے جوڑے تیر رہے تھے دپر سردیوں پر رنگ برنگے پیراشوٹ منڈا رہے تھے موسم بھی اندھ کے فضل سے بہت خوش گوار تھا بہت طف یا بیٹ پوجا کے بعد پہاڑ پر چڑھنے کی ٹھانی۔ آگے ایک ناں سپاٹ تھا یعنی اوپر جانے سے پہلے اس سڑک والوں کو نذرانہ دینا تھا۔ دیکھا کہ کوئی آدمی وہاں متعین نہیں۔ اترے آگے فارم پڑے تھے اور چاسک کے غافے۔ ایک بس تھ لکھا تھا فارم پر اپنی گاڑی کا نمبر لکھے اور ڈول کی فیس اس غافے میں ڈال کر بس میں ڈال دیجئے۔ شکریہ ہم نے فارم پر کیا فیس کے پیسے اس لفافے میں ڈال کر بس میں ڈال دئے اور اوپر چڑھنے لگے۔ سڑک چھوٹی تھی۔ راستہ خطرناک بھی تھا خوب صورت بھی۔ مڑتے ہی کھاتے پہاڑ کی چوٹی کا رخ کیا ایک ذرا سی جگہ پارنگ کی ٹلی تو رک گئے اور پیراشوٹ والوں کو دیکھنے لگے جو بڑے مڑے سے اضافوں میں تیر رہے تھے اور درختوں میں الجھنے سے بچتے پھرتے تھے ہمارے رہنما سلام صاحب بڑے خطر پسند نکلے۔ جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے وہاں جھنگلے سے باہر صرف پاؤں نکالنے کی جگہ ہے ورنہ نیچے تک عمودی چٹان ہے اگر خدا نخواستہ ذرا پاؤں پھسلے تو آدمی نیچے تک گرتا چن جائے اور اس کا انجمن بکھر جائے۔ مگر سلام صاحب فہم سے اصرار کرنے لگے کہ میں اس ذرا سی جگہ میں پاؤں نکال کر کھڑا ہوتا ہوں آپ تصویر کھینچیں۔ فہم تصویر کھینچتے ہوئے ڈر رہا تھا مگر اسلام صاحب تصویر کھینچواتے ہوئے نہ ڈرے۔ ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ یہ جو ہر جگہ اور ہر وقت "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگتا ہے یہ شاید "اسلام" کی فطرت میں ودیعت ہے کہ ہر وقت خطرے ہی میں رہتا ہے اور خطر پسند ہے۔ خطر پسند

طبیعت کو سارے گارنٹس۔ وہ نکتہ اس کے جس نکتہ میں نہ ہو صیاد۔ مگر تو سمجھتے تھے کہ اس صاحب نام کے 'سرم' ہیں وہ تو فی حقیقت اسم، مسمیٰ تھے۔

پیر اشوٹ رنگ برنگے تھے ایک دوجہ اشوٹ سویڈن کے جھنڈے کے رنگ کے تھے یعنی زرد اور نیلہ جو عقیقا سویڈش پیر شوٹر ہوں گے۔ کچھ دیر رک کر ان کا نظارہ کیا۔ آگے بڑھے تو وہ جھگڑ گئی جہاں سے یہ اشوٹ والے چھلانگ لگاتے تھے۔ دیکھا کہ دو تین پیر اشوٹ قطر میں کھڑے ہیں۔ پیر اشوٹ کا سارے پیرا فرنیچر تیار ہے صرف دو قدم بھاگنے اور پیر اشوٹ کھولنے کی کسر ہے وہ فضا میں تیرنے لگتے ہیں۔ یہ نظارہ بڑا دلچسپ تھا کچھ دیر رک کر دیکھتے رہے اور پیر اشوٹوں کو فضاؤں میں تیرتے اور پھر دور سے نیچے صاف جگہ پر میدانوں میں اترتے دیکھتے رہے کیسا خطرناک کھیل ہے مگر حضروں سے مردانہ دار و گرانماہی تو زندگی ہے۔ آگے چلے تو سڑک ایک موٹوں میں گھس گئی معلوم ہوا یہ مہنگا موٹوں نے شادی شدہ جوڑوں کے ہنسی مون کا مقام ہے۔ وہ لوگ دنیا سے دور پہاڑ کے اوپر آ جاتے ہیں جہاں بقول اقبال "دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو"۔ یہاں دامن کو وہی بچے کھدے کوہ تھا اور جھونپڑے کی بجائے اچھا خاصہ پانچ ستاروں والا ہوٹل۔ دوست اداحقین دلہا دلہن کو یہاں تک چھوڑنے آتے ہیں دعوت میں کھاتے پیتے ہیں اور پھر دونوں کو چھوڑ کر پہاڑ سے نیچے اتر جاتے ہیں کہ لو اب زندگی کا پہاڑی راستہ خود طے کرو۔

بسم اللہ مہر سواو مہر سہا۔

ہم واپس اترے۔ پٹرول سٹیشن سے پٹرول لیا۔ اسلام صاحب نے اس سٹیشن پر کام کرنے والی ٹرکی سے شناسائی بکھرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہم نے طعنوں پر دھریا تو فرمانے لگے میں اسی مقام پر اپنے ابتدائی زمانہ میں رہ چکا ہوں۔ یہ بچی اس وقت بہت چھوٹی تھی اور بھولی بھالی۔ ہم نے کہا اس کی شکل و صورت سے یہی لگتا ہے کہ چھوٹی تو یقیناً ہوگی مگر بھولی واں بات بھول جاییے۔ اتنی بھولی بھی نہیں لگتی۔ چھٹے خاموشی ٹوٹنے کی کوئی صورت بھی نکل آئی ورنہ ہم لوگ اس نظارہ سے اتنے متاثر تھے کہ دم بخود بیٹھنے لگے۔ واپسی کا سفر ایسے وقت میں شروع ہوا جب سڑکوں پر ریش شروع ہو چکا تھا۔ کچھ راستہ بھی پہاڑی تھا۔ ترقی چڑھتی بل کھاتی سڑک کبھی فرار کبھی نشیب۔ ساتھ ساتھ جمیل۔ بانیں طرف پہاڑ کی تفصیل۔ چپتے ہاتھ کرتے ایک "سر راہ شیوسک" پر رکے کہ ذرا چائے دوائے ہو جائے مگر وہ تو سلام کے اور خیم کے



میں نے ایک شخص کو بھی فوج میں لے کر دیا۔ ایک سال میں میں حضرت صاحب کے تعلقہ کے ساتھ  
 گیا۔ وہاں میں نے ایک سال کے بعد صاحب کے تعلقہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہاں  
 مادرِ قریب آپ کے ساتھ تھا۔ چچا میں گئے یہاں چچا میں سے اور حضرت صاحب نے مل کر کھانا پلایا۔ یہ سارے  
 دن ان دنوں اور زندہ کر گئے میں تمہاری۔ بھی چچا اس پہلے حضرت صاحب سے بھی ملے۔ یہ پانی  
 روٹھا ہوا تھا۔ ان کے عیوریں ہوتے ہوئے یہ مدت سوچا اور فرمایا کہ یہ یہ جو تمہارا صاحب نہیں  
 تم لوگ کچھ نہیں تھے اور میں نے چودہویں نور میں صاحب کو الپا کر رکھا تھا۔ وہ دونوں جانتے۔ وہ  
 گئے تھے کہ تھی مذید وال تو میں نے زندگی میں بھی نہیں کھائی۔ خیر حمد مقرر خدا برطرف۔ ہم اس کے ہاں  
 بیٹھے چائے وغیرہ پانی اور پھر دینی کی راہ پکڑی۔ تارک وہاں بیٹھے ہوئے سائین کی تھیں چارہاں یہ بھی  
 وہاں رہیں اور پھر آئے بڑھ گئیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی یہ اثاثہ چپ کے لئے دعا کا رخ  
 کر رہے تھے وہ جہدِ اہلِ دوق میں خاصی مقلد مقلد تھی ہے۔

نکلے روز اسلو کی سب سے مشہور بند دیکھنے کا پروگرام تھا یعنی اسلو کا سکی چمپ۔ ہمارے شکل کا سامنا یہ سکی چمپ اسلو کا سب سے مشہور اور سب سے اونچا مقام ہے۔ رات کی تاریکی میں بھی یہ سکی چمپ روشن رہتا ہے اور سردیوں میں تو بادل بھی رہتا ہے مگر ہم ایسے موسم میں گئے تھے۔ سکی کا موسم نہیں تھا۔ بل کھاتی سڑک کے ساتھ ہم بھی بل کھاتے اور سکی چمپ تک پہنچ گئے۔ دور سے جو منہ سالن ملتا تھا قریب سے ایک عظیم شان ڈھونڈ نھر آیا سکی کرنے والے اس ڈھونڈ کے اوپر سے سکی کرتے ہوئے پڑے سامنے بنے ہوئے تاب میں پتا نہ رہتا تھا جیسے حوسر دیوں میں برف کا میدان بنا ہوتا ہے اور یہ کھیں برفی کھیں میں بہت مشہور کھیل اور تفریح سمجھا جاتا ہے۔ سکی میں تو ہمارے سویڈن والے بھی کسی سے پیٹھے نہیں بلکہ سرائیوں کے اوپر کھیں میں سکی کی ٹیمیں تھوڑی سی ہیں۔ سویڈن کی کی ہیں۔ سویڈن کی کی کیا ہمارے اپنے شہر اپنا، ہی کی ہیں۔ یہ سکی چمپ دنیا کا سب سے اونچا سکی چمپ ہے اور اپنی راحت کے اعتبار سے بھی رات۔ دوسرے لوگ بھی چاہیں تو بنائیں مگر اسلو جس بلندی کہاں سے! ایک اس لئے اہل اسلو میں رہتے اور اس سب سے سکی کرنے کا عہد اٹھاتے ہیں۔ ہم نے سکی تو نہیں کی اب ہم سے ریستورن میں بیٹھ کر ایک وقت کا کھانا ضرور کھایا اور وہ سائیز ریٹنگ پر کھڑے ہو کر فیملی سے سکی

حسب خیل نے تو حد سے رہے مگر اس کا ہم بھی محض ہوا ہے عموماً بھی کسی کہاں کرتا تھا اس میں رسول نے بچوں کے لئے چھ دی ہیں تھی۔ بچے کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہے دایں چارے بچوں کو دنیا کے مشہور ترین مکی جہاں کی دولت میں گئے۔ ترقی یوں ہے کہ ہم یہی بار سے تھے تو سعید باجوہ خواہش کے ہمیں مکی جہاں نہ دیا۔ کافی اب فیہ اور اسلام نے وہ سر چوری کر دی۔ اس کے بعد ہم اوسو میں تعمیر ہونے والی مسجد دیکھنے گئے۔ اس مسجد کا کافی حصہ بن چکا ہے مگر شاید سے مکمل ہونے میں اب وقت لگے گا۔ یہاں بھی سوڈن کی طرح بہ کامیابی سے درختوں سے پانی ہوتا ہے۔ ترت پھرت ہمارے مشرق والوں کے حصہ میں ہی رہی ہے ہاں پری میٹر یکیدہ جی پہلے سے بنے بنائے گھر دس تو ان کی تعمیر میں تھوڑا وقت لگتا ہے کہ ہر چیز ایک مائر در معیار کے مطابق پہلے سے تیار شدہ مل جاتی ہے مگر خاص نقشہ دنی ہمارے وقت لیتی ہیں کیونکہ نہیں رک کر قدم بہ قدم چننا ہوتا ہے۔ جو کسی نماز مسجد میں پڑھی۔ سعید کے گھر الوداعی ملاقات کے لئے گئے۔ طاعت اور بچوں کو دعا حفظ کیا اور گلے دوز اس میں بیٹھ گئے۔ نہایت آرام وہ بس تھی۔ وقت پر چلی وقت پر سناک بالہ پانچا اور سناک ہالم سے ہم ایک ٹمپل میں داپس اپنے گھر پہنچ گئے۔

دوسو میں دعوتوں کا موقع نہیں تھا اس سے باوجود لوگ دعوتیں دیتے جاتے تھے ہم نے صرف اپنی سببی جی فرزانہ کی دعوت قبول کی وہ بھی اس لئے کہ فرزانہ سے کوئی تیس بیستیس برس بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہمارے قبلہ و کعبہ سید عبداللہ شاہ صاحب کی بیٹی اور ہماری چھوٹی بہن ہے۔ شادی کے بعد اپنے میاں شاد شاہ صاحب کے ساتھ ناروے آئی۔ فیہ کے گھر ہمیں ملنے آئی تو ہم حیران رہ گئے۔ وہ مکی سی بی بی شاہ، اللہ بڑے بڑے بچوں کی ماں بنی ہوئی ہے۔ شکل و صورت سے تو اسی طرح معصوم اور پیاری لگی۔ طبیعت میں اپنے بڑے بھائی جان یعنی ہمارے یار ہو جان سے ملتی ہے اس کا کہا کیسے مالتے پھر اپنے بہنوئی شاد شاہ صاحب سے ملاقات کا پہلا موقع تھا اور بے بی کے بچوں سے ملنے کا بھی اس نے دعوت میں بڑا تکلف روا رکھا تھا۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ دوسری بہنوں شادہ کی بیٹی اور راشدہ کا بیٹا دونوں آپس میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی اس دعوت میں آ گئے اس طرح قبیلہ شادہ جی عبداللہ شاہ صاحب کا ناروے کا سارا خاندان اکٹھا ہو گیا۔ یہی کیئی بہت غیبت ہوتی ہے پھر یا قسمت یا نصیب۔ بھرا گروں فلک کی

جس دینی سے کئے انشاء جہت ہے کہ ہر صورت میں اس کو چاہئے کہ وہ اس میں سے کچھ نہ لے لے۔  
تو یہ اور روٹی کے بھونے بھونے کے لئے ہے۔ یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔  
جس کوئی تاریخی درجہ ملتا ہے۔ یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔  
یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ناروے والوں کا شکوہ کئی سال سے چلا آ رہا تھا کہ ہم نے ابھی تک ناروے کے بارہ میں کچھ نہیں کیا۔  
خاص طور سے ہمارا یار محمد احمد صبر تو بہت ناراض رہتا ہے حالانکہ ہم اس کی اقتد میں بہت کمزور پڑھ  
چکے ہیں۔ چنانچہ وہ شکوہ اصل جانا چاہئے مگر اس سفر میں ایک تاریخی واقعہ بھی ہوا کہ ہم ہمیشہ اپنے  
شامروں کا شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ بچپانے پر اصرار کرتے ہیں اور ہمارے حائفہ کا امتحان دیتے رہتے  
ہیں۔ اس سفر میں اپنے ایک شامروں کا سامنا ہوا۔ وہ عزیت کے لئے سعید انجم کے ہاں آیا تھا۔ کسی نے  
تعارف کروایا۔ ہم نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ دایا کہ وہ ہمارا شامروں کا بھی تھا اور محمد وار بھی۔ دو برس محمد وار  
لبرکات میں اس کے محمد وار رہے تھے اور دو برس ہی وہ عزیز ہمارا شامروں کا بھی رہا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ شامروں  
ٹھیک ہو؟ اب راضی ہیں؟ کہنے لگا معاف کیجئے میں نے آپ کو بچپانے نہیں۔ احوال دل تو وہ۔ ہم اس کا منہ  
دیکھنے لگے۔ یہ پیدا موقع تھا کہ ہمارے کسی شامروں نے ہمیں نہ بچپانے بچپانے سے نکال کر دیا ہو۔ ہم  
بہت خفیف ہوئے۔ مجلس میں کسی حاضر شخص نے ہمارا تعارف کروایا تب بھی ان کے چہرے پر امتحان کی  
کوئی دھاری نمودار نہ ہوئی۔ معلوم ہوا اپنے باسے بھی چار ہاتھ آگئے ہیں۔ یہ ۱۹۵۲ کی بات ہے ہم  
نور ہسپتال میں کلرک تھے۔ ایک صاحب جو اب جرمی میں مقیم ہیں اپنے کسی بچے کی دوائی لینے کے لئے  
ہسپتال تشریف لائے۔ پرچی پر نام لکھنا اور پرچی کو درج کرنا ہمارا کام تھا۔ ہم نے پوچھا کہ بچے کا کیا  
نام ہے؟ سوچ میں پڑ گئے مانتے پر ہاتھ مار کر بولے برا ہوں نسیاں کا بچوں کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔ ہم  
نے پرچی پر دفتر فداں یا پسر فلاں لکھ دیا۔ دوائی وغیرہ لینے کے بعد تشریف لائے کہنے لگے ہاں نام یہ  
آگیا ہے لکھ لیجئے۔ یہ حضرت انہیں صاحب کے صاحبزادے تھے باپ پر پوت چاہر گھوڑا بہت نہیں تو  
تھوڑا تھوڑا۔ یہیں تھوڑا تھوڑا یہ پورا پورا سے بھی آگے کا مقام تھا۔ جرمی گئے تو انہی بزرگ کی طرف  
سے ان کی کتاب کسی دوسرے کے ہاتھ تھمتھ موصول ہوئی۔ ہم نے رسید بھیجی تو لکھا الحمد للہ کہ آپ کو ہمارا

میں نے روک لیا، شہر کے حلقہ، رتھدوتہ، رانا، حوت، نیچے میں۔۔۔ اس کے ساتھ یہ رہا، یہی رہی،  
 رہت ہے جو اس کے ساتھ ہیں اس کی۔

-----

## سربردگی واپسی

بات بجا ملک کے بیسیوں سے شروع ہوئی اور بت بہ بت دورے کیے گئے۔ سربراہ سرنگ پٹنئی  
ہمیں قطعاً اندر نہیں تھا کہ لکھنؤ کی جہتی ہمیں وہاں پہنچا دے۔ خانے کا بندوبست کروے گا اس  
کی قدر تک بھی عجیب ہیں اور انسان چاہے کتنی ہی بے تہ مہربانیوں کو مہربانیوں کا احاطہ نہیں کر  
سکتا و ان نعدو نعمت اللہ لا تحصوها۔

ایک روز اچانک بجا ملک کا کینیڈا سے فون آیا کہ دو چوہدری محمد علی صاحب کو اور ہمیں کینیڈا بلانا چاہتا ہے  
ہمیں فرصت ہے؟ ہم نے کہا فرصت تم بلا کے تو آجیو ہم کیسے ذکر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ لندن کا ویزا ملو کر  
پنی طرف سے تیار ہو گئے لندن کا ویزا اس نے کہ کینیڈا اولوں نے یہاں شاگ ہال میں اپنا سفارت خانہ  
تو کھول رکھا ہے مگر ویزا اسٹیشن لندن میں ہے وہی اپنے کچھ بھائی بندوں کی طرف کہ کالج لاہور میں نہ  
تھا تو کالج کا ہوٹل مرسر میں کھول دیا تھا کہ کسی بھائی کی حق تلفی نہ ہو۔ کینیڈا حکومت نے بھی ایسا ہی  
تقدیم کر رکھا ہے۔ سفارت خانہ شاگ ہال میں اور ویزا اسٹیشن لندن میں۔

پھر ایک روز اچانک عزیز یزید نعیم کا جرمنی سے فون آ گیا کہ آپ کینیڈا جانے کو تیار ہیں؟ ہم نے ہاتھ تیار  
سے تیار ہیں۔ اس نے کہا تو آپ فوراً لندن پہنچیں اور کرم چوہدری محمد علی صاحب کا ویزا ملو گے۔ یونکہ  
کینیڈا اداوار نے ویزا لگانے سے انکار کر دیا ہے۔ ہم نے سوچا ہم چوہدری صاحب کے یزید کا کیا انتظام  
کریں گے کی بہن لندن چھتے ہیں وہیں جماعت برطانیہ چوہدری صاحب کے ساتھ خوشام مہمانے کا  
انتظام کر رہی ہے اس میں شرکت کریں گے چوہدری صاحب سے ملاقات بھی سو جائیگی ہم خیر و اہم  
تواب۔ لندن پہنچے چوہدری صاحب سے ملے بھی ان کے کمرہ ہی میں بیٹھے تھے کہ کرم بشر اللہ یزید  
صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ کرم امیر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر رحمت نہ ہو تو ذرا سی دیر کو تشریف  
لائیں۔ ہم نے سوچا کہ کرم امیر صاحب تو قبلہ قاضی محمد اسلم کے ناٹے سے ہمیں خوب جانتے ہیں اس  
طرح مختلف سے بلانے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ بہر حال حاضر ہوئے۔ ایمپیسڈ راقب احمد خاں

صاحب فرماتے تھے: آپ بھری گدلی صاحب کے ساتھ ایک شام استراحت ہے۔ کیا یہ آپ کی مجلس میں جوہری صاحب کا قیام ہو سکتا ہے؟ ان کے منہ کیوں میں۔ شرعاً۔ قبلہ صاحب۔ یہ کیا کلمہ؟ شہر تھوڑا دور تھا۔ صاحب سے بارہا میں کل شب ہی ہمیں حکم دے چکے ہیں کہ ہم لندن در اسوج کھڑے کر دیں۔ چونکہ ہمیں پوہری صاحب کا تعارف ہی کرنا تھا تو اسکا مذاہم نہ صرف یہ کہ میں بلکہ اس حد تک تیار ہیں کہ جوہری صاحب کا تعارف یہ لکھ ہی رکھا ہے۔ دو تہا ریفہ تیار۔ کام آگیا جوہری صاحب کا تعارف ہم یہ کہواتے کہ وہ پاتھار فہ آپ ہیں۔ آفتاب آمد ایل آفتاب۔ اس تعارف کا ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ سیدی حضرت القدس کے جو میں پہنچے وہ حضور کے قرب سے متعلق ہونے کا موقع مل گیا۔ قبلہ میر صاحب تعارف کے ایسے موقع پر ہمیں یہ ذکر لیا کریں ہم سر کے بل آئیں گے آراش شہ ہے۔ ہم نے ایک روز قبلہ محمد امیر صاحب مولیٰ محمد احمد صاحب جمیل مدظلہ کا ویزا لگوا لیا تھا اگلے روز جوہری صاحب کے ویزے کے لئے پہنچے تو امیر صاحب سیدہ اکی طرف سے تائیدی ٹیکس بھی پہنچ چکا تھا قبلہ جوہری صاحب کا ویزا بھی لگ گیا اور اگلے ہی روز جوہری صاحب سے ویزے کی جو فیصلہ وصول کی گئی وہ بھی واپس کر دی۔ ہم نے کہا اب تو آئے ہو نا کینڈا والو اختر مر جوہری صاحب کا ویزا لگنے کی دیر تھی کہ ہم نے سیدنا حضرت القدس کی خدمت میں اجازت کی درخواست پیش کر دی حضور نے اذراہ بندہ پروری اجازت مرحمت فرمادی صرف اتنی پابندی لگائی کہ ویک اینڈ سے پہلے سفر نہ کریں۔ ہم نے خوش خوش جوہری صاحب کو حضور کی اجازت کا فرمان سنایا تو جوہری صاحب حسب دستور سابق پسر گئے کہ وہ خود حضور سے اجازت طلب کریں گے تب اپنا پروگرام معین کریں گے۔ جوہری صاحب نے خدا جانے کیا اجازت طلب فرمائی اور کیسے فرمائی کہ حضور کا ارشاد آیا: جب تک آپ کام مکمل نہیں کر لیتے جانے کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چلے چھٹی ہوئی جب تک جوہری صاحب اپنا کام ختم نہیں کریں گے چاہیں سکتے اور کام ختم کرنا جوہری صاحب کی سنت جاریہ نہیں۔ ہم سوئڈن سے جا کر لندن میں بیٹھے تھے گویا مسلسل سفر میں تھے اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو ہم واپس سوئڈن آ جاتے اور پھر جوہری صاحب کا کام ختم ہونے پر دوبارہ رخصت سفر بندھتے یا سیدھے کینڈا چلے جاتے اور وہاں بیٹھ کر جوہری صاحب کی آمد کا انتظار کھینچنے عزیزی نعیم سے مشورہ مانگا تو اس نے کہا آپ سیدھے کینڈا چلے جائیے عزیزی سید شکیل

نہ جہیز میں سے دواؤں میں کیڑے کے کاغذات پانچ سو ساڑھے چنانچہ عزیز کی نکلیں ہو، سید کا  
 ۱۰۰۰ روپے خرچہ ہو گا، یہاں پر میرے بارے میں تو سوچا جائے گا، کیوں کہ میں نے سارا کچھ بچھ  
 نہیں آلی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ بات سجاد ملک کے فون سے شروع ہوئی، لیکن سب سے کسی ارٹ  
 لندن جانے کو، دوفرینکفرٹ سے کوئی اور سہارہ کیڑا کا یہ دوا لے کر برٹش ایئر لائن پر کارساز ہوا۔

۱۰۱۰ء

غازی مہدی تو ہمارے پہنچنے کے دو چار دن بعد ہی جرمنی بھاگ گیا کیونکہ اسے وہاں جرمنی کے جہاز میں  
 تقریر کرتا تھی مگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے فارغ نہیں ہونے دیا۔ ایڈمنٹن البرٹا سے کہ کیڑا کا 'تیس کاٹواں'  
 کہتا ہے، میری ہشام ملک کا فون آیا کہ کیا آپ اب کے برس میں خدمت کا موقع نہیں دیں گے؟ ہم  
 سے کہا کیوں نہیں دیں گے تم آگے تو دیکھو۔ دوسرے دن ہی ایڈمنٹن کا جانے کا نظام ہوا اور تیسرے  
 دن ہم ایڈمنٹن پہنچ گئے۔ مری ٹرائی رفتار پر نہ کرتی تھی۔ تو دیکھ یہ میں کہاں آ گیا کہ اس سے چلے۔ ایڈمنٹن  
 میں مزیدی ہشام ملک تو خیر ہمارا شہر تھا۔ زیادہ کھد بہ اپنے دوست مرزا محی الدین سے ملنے کی ٹکی  
 سوئی تھی کیونکہ یہ شخص چھابھلا بایولوجی کے کسی میدان میں پی ایچ ڈی تھا اب سننے میں آیا تھا کہ  
 ہو سکتی تھی کے کسی میدان میں بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری لئے بیٹھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس کے طور اظہار  
 دیکھیں کہ ہو سکتی تھی نے اس بھوے بھالے (اس میں بھلا مسکرانے کی کیا بات ہے؟) شخص پر یہ اثرات  
 مرتب کئے ہیں؟

ایڈمنٹن پہنچے تو سب سے زیادہ خوشی قید پر دفسر مرزا منظور احمد صاحب سے مل کر ہوئی۔ مرزا صاحب  
 ہمارے استاد پر دفسر صوفی بشارت الرحمن مرحوم کے برادر نسبتی ہیں۔ مگر نہیں قید صوفی صاحب کے  
 مزاج سے دور کی سبست بھی نہیں۔ نہایت خندہ رو اور خندہ پرور شخصیت تھے۔ ہمیں اس نے بھی اچھے لگے  
 کہ ہمارے ساتھ ذرا سی بھی شناسائی نہیں تھی اس کے باوجود ملنے کے لئے تشریف لائے اور نوٹ کر ملے  
 فرمانے لگے بس آپ سے اغضل کا رشتہ ہے ورنہ اس سے پہلے ہم کبھی نہیں ملے۔ قبلہ مرزا صاحب کی  
 زندہ دلی کے بارہ میں بہت کچھ سن رکھا تھا ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ لوگ دوسروں کے مزاج کا صرف  
 ایک ذرا سا ادراک ہی حاصل کر پاتے ہیں اصل جوہر تو عند الملاقات ہی کھلتے ہیں۔ مرزا صاحب سے

مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اے کاش ان سے اور ملنا ہوتا اور ملنا ہوتا۔ بہت جی خوش ہو احوالی سے مل کر۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم اور صحت و سلامتی سے رکھے آمین۔ (اس کتاب کے مرتب ہوتے وقت مرزا صاحب وہاں چلے گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا)۔ انفضل کی قوت کا بھی اس روز اندازہ ہوا کہ یہ بظاہر چھوٹا سا پرچہ کتنا بے پناہ توانا پرچہ ہے۔ مقبول چوہدری صاحب بھی تھے مقبول صاحب کے بارہ میں ہشام نے پوچھا آپ انہیں پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا صورت شناسا ہے باجوہ خاندان میں سے لگتے ہیں وہ واقعی باجوہ خاندان میں سے تھے اور خود ان کے قول کے مطابق سکول کے زمانہ میں یعنی ۱۹۵۷-۱۹۵۸ ہمارے اتنے سے شاگرد رہے تھے کہ انہیں یہ ضرور یاد تھا کہ ہم کلاس میں سوائے شعر سنانے کے اور کوئی کام نہیں کیا کرتے تھے ہم نے جھٹ اپنے اس گناہ کا اعتراف کیا اور انہیں اپنا جج کا شاگرد مان لیا مقبول صاحب تو بہت دلچسپ نکلے ان کے جوہر اگلے روز کھلے جب ہمیں ان کے ساتھ کینیڈین راکیز کے طویل سفر کی رفاقت اختیار کرنا پڑی یہ شخص تو مردت اور خلوص کا چٹلا نکلا (یہ لفظ زبر سے بھی پڑھا جاسکتا ہے) ہمارے دوست مرزا محی الدین کی ہومیو پتھی کا امتحان بھی ہو گیا۔ مقبول نے اذرا تفنن مرزا صاحب سے کہہ دیا کہ کوئی ایسی دوا ایجاد نہیں ہوئی جس سے بیوی مطیع و فرماں بردار بن جائے؟ مرزا صاحب نے کہا کیوں نہیں میں نہ صرف ایسی دوا ایجاد کر چکا ہوں بلکہ میری جیب میں بھی موجود ہے آپ چاہیں تو آج ہی آزما بھی سکتے ہیں۔ ہمارا جی تو چاہا کہ محی الدین سے پوچھیں یہ دوا صرف دوسروں کی بیویوں پر کیوں اثر کرتی ہے؟ مگر ہم چاہتے تھے کہ ذرا بات بڑھے تاکہ مرزا محی الدین کی ہومیو پتھی کے کچھ اور گوشے سامنے آئیں مگر معلوم ہوتا ہے مقبول صاحب اسی ایک نسخہ پر مطمئن ہو گئے تو ہی نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگی و داماں بھی تھا۔

ہشام ہمارے بزرگ مکرم و محترم ملک سیف الرحمن مرحوم مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا بیٹا ہے۔ نہایت زندہ دل اور شوخ۔ کہنے لگا ہم آپ کے شاگرد تو رہے ہیں مگر ہمیں آپ کی باتیں کبھی سمجھ نہیں آتی تھیں۔ ہم نے کہا درست کہتے ہو جس کبھی عمر میں تم ہمارے شاگرد رہے ہو ہماری کئی باتیں تمہیں کہاں سمجھ آئیں؟ اگر سمجھ میں آگئی ہوتیں تو آج اس احترام سے نہ ملتے جس احترام سے مل رہے ہو۔ دلیل اس بات کی یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کے قول کے مطابق غالب واحد شاعر ہے کہ جس کا کلام سمجھ میں نہ آئے تو دونا مزا



دیتا ہے۔ ہماری استاد کی کابھی یہی عالم رہا ہے۔ جن شاگردوں کو ہماری باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں وہ ہمارے زیادہ گرویدہ ہوتے تھے۔ ہم شاگردوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت ہی خوش نصیب رہے ہیں اور ہیں۔ ملک صاحب سلسلہ کے مفتی تھے۔ جامعہ کے پرنسپل بھی رہے۔ سلسلہ کے بزرگوں میں سے تھے مگر ہمارے ساتھ ہمیشہ محبت کا سلوک فرماتے تھے فرماتے تھے تم میرے بیٹوں کے استاد ہو اس لئے میرے دل میں تمہارا بہت احترام ہے اب ایسی محبتیں کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟

کینیڈین راکیز کی سیر پر روانہ ہوتے ہوئے یہ طے پایا تھا کہ راستہ میں کھانے پینے کا جو سلسلہ ہوگا اس کی ذمہ داری مرزا محی الدین پر ہوگی۔ چنانچہ یہ سوچ سوچ کر جان بھگت ہوئی رہی کہ کہیں ایسا نہ ہو کھانے کا وقت ہو تو مرزا محی الدین جیب سے ہو میو پیٹھی کی کوئی شیشی نکالیں اور کہیں حضرات ناشتہ تناول فرمائیے اور پتھلی پر کوئی کینیڈین کیورینو قسم کی گولیاں رکھ دیں کہ نوش جان فرمائیے۔ کھائی نہ جاسکیں تو ان کا سونگھنا بھی مفید ہوتا ہے۔ مگر اللہ نے بچالیا۔ محی الدین نے پراٹھے پکوار کھے تھے۔ دو تین قسم کا سالن بھی بندھا ہوا تھا۔ چائے بھی تھی اور اس بات کے علی الرغم تھی کہ محی الدین خاندانی طور پر چائے سے بیزار ہے۔ سفر پر روانہ ہوئے تو طے پایا کہ اولیس پڑاؤ پر رک کر ناشتہ کیا جائیگا چنانچہ اولیس پڑاؤ پر ہی ہم سب لوگ ناشتہ سے کیا دوپہر کے کھانے سے بھی فارغ ہو گئے۔ کینیڈین راکیز کے سلسلہ میں سیر کرتے ہوئے ہم لوگ جاسپر پارک کے ایک مقام پر رکے اور کیسل کار کے ذریعہ سیٹیاں بجانے والے پہاڑ کی چوٹی تک بھی گئے راکیز کے سلسلہ کی یہ اونچی چوٹی دور دور تک کے مناظر پر محیط ہے پھر واپسی کا سفر شروع کیا تو سلسلہ در سلسلہ پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے کولمبیا گلیشیر کے دامن تک پہنچ گئے رستہ میں ایک مٹی سی آبشار بھی دیکھی مٹی سی اس لئے کہ نیا گرا فاولڈ دیکھنے کے بعد اس آبشار کو مٹی سی قال ہی لگنا تھا۔ جھیلوں اور پہاڑوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم لوگ رات کے کھانے سے پہلے مقبول صاحب کے گھر پہنچ گئے اور مرزا محی الدین کی دوا استعمال نہ کر نیکی باوجود نہایت پر تپاک استقبال سے دوچار ہوئے مسز مقبول نہایت سمجھدار اور مہمان نواز خاتون نکلیں۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ مقبول صاحب راستہ بھر جو قصیدہ پڑھتے رہے وہ محی الدین کی ہو میو پیٹھی کی آزمائش کے لئے تھا اور بس ہمیں مقبول کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ میاں بیوی میں محبت بڑھانے کا یہ ایک نسخہ بھی بہت مفید ہوتا ہے اور زود اثر۔ کسی ہو میو پیٹھی کی

دوائی کی ضرورت نہیں ہوتی؟

اپنے بزرگ دوست تیمور احمد چغتائی صاحب سے ملنے کے لئے میں خود ان کے در دولت پر حاضر ہوا تیمور صاحب لاہور پنجاب گورنمنٹ کے سکرٹریٹ میں انڈر سکرٹری رہے۔ پاکستان اٹاک انرجی کمیشن میں اس کمیشن کے نہایت ابتدائی زمانہ میں ڈائریکٹر فنانس رہے اور خدا معلوم کہاں کہاں رہے مگر احمدی رہے۔ ہر احمدی کی مدد کرنا اپنا فرض جانا اور اس فرض سے عہدہ برا ہوتے رہے۔ ہمیں ان کی نوازشوں کا اندازہ تب ہوا جب خود ہمیں کالج کے نیشنلائز ہونے کے بعد حکومتی سرخ فیتہ کے تلخ تر تجربات ہونا شروع ہوئے قبلہ صوفی بشارت الرحمن صاحب کے استعفیٰ اور استعفیٰ کی واپسی کے زمانہ میں تو ہمارا لاہور کے قیام کا اکثر حصہ تیمور صاحب کے دفتر میں گزرتا رہا تیمور صاحب چونکہ اس مشین کا حصہ تھے اس لئے دفتری اونچ نیچ سے خوب آگاہ تھے ان کی راہنمائی کے بغیر سکرٹریٹ میں ایک قدم چلنا بھی دشوار تھا تیمور صاحب نے اپنی خدمات کا دروازہ کسی پر کبھی بند نہیں کیا ہر احمدی ان کے دفتر میں جاتا اور ان کی شفقتوں سے متمتع ہوتا تھا ہم نے خود کئی ایسے ضرورت مندوں کو تیمور صاحب کے پاس بھیجا جن کی تیمور صاحب سے ذرا سی شناسائی بھی نہیں تھی مگر تیمور صاحب نے ان کی پذیرائی میں کبھی تساہل نہیں کیا۔ فخر اہلہ الحسن الجزائر۔ تیمور صاحب کی بہو عزیزہ نسیم تو ہماری بھانجی ہے اس کے اصرار پر ہم اس کے گھر کھانا کھانے بھی گئے۔ جہانگیر سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ایک پتھہ روکاج۔ نورنو سے چلتے ہوئے سید حسنا احمد نے ایک لفافہ ہمارے حوالہ کیا تھا کہ سید حمید احمد صاحب کو پہنچا دیں۔ حمید ہمارے لاہور کے زمانہ کے دوست ہیں اردو کے نامور ادیب سید شفیع احمد دہلوی کے اور اپنے شوہر سے بھی زیادہ نامور ماں یعنی بیگم شفیع کے بیٹے ہیں۔ سید حمید احمد تکلیف فرما کر کہیں باہر دور سے ہمیں ملنے کے لئے تشریف لائے وہی کھلکھلاتا مسکراتا چہرہ لاہور کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہم بیگم شفیع کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ اپنے بیٹے کا دوست ہونے کے ناطے ہم پر بہت شفقت فرماتیں۔ ان کا دستکاری پرپس آڑے وقت میں جماعت کے بہت کام آتا رہا۔ میکینک روڈ پر حمید کی رہائش تھی یا پرپس تھا بہر حال حمید اور میکینک روڈ سے وابستہ یادیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں۔ حمید سے مل کر بہت سی پرانی باتیں یاد آئیں جن کے دہرانے کا موقع ہے نہ محل۔ چھوڑ بیٹے رات گئی بات گئی۔



جماعت احمدیہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دن و گئی اور رات چو گئی ترقی کر رہی ہے۔ قادیان کے ایک قصبہ سے اٹھنے والی تحریک اس وقت سارے عالم پر محیط ہے اور دنیا کے ہر ملک میں احمدی آباد ہیں اور اپنے اپنے ملک کے وفادار شہریوں کی حیثیت سے زندگی کر رہے ہیں کہ یہی احمدیت کے بانی کی تعلیم ہے۔ اس کتاب کا موضوع احمدیوں کے سماجی، معاشرتی اور دینی رویوں کا جائزہ لینا ہے اس جائزہ کی بنیاد قادیان اور ربوہ کے ماحول کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔ وہ ماحول کیا تھا اس میں کیسے لوگ بستے تھے اور ان کی زندگی کا محور کیا تھا۔ وہ لوگ بنیادی اسلامی اخلاق سے متصف تھے اور یہی ورثہ تھا جسے وہ اپنی نسلوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

